زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہار سو
راولپنڈی

غم سے بہل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
درد میں ڈھل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
سائۂ وصل کب سے ہے آپ کا منتظر مگر
ہجر میں جل رہے ہیں آپ ، آپ بہت عجیب ہیں
اپنے خلاف فیصلہ خود ہی لکھا ہے آپ نے
ہاتھ بھی مَل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
وقت نے آرزو کی لو دیر ہوئی بُجھا بھی دی
اب بھی پگھل رہے ہیں **آپ**، آپ بہت عجیب ہیں
زحمتِ ضربتِ دگر دوست کو دیجیے نہیں
گِر کے سنبھل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
دائرہ وار ہی تو ہیں عشق کے راستے تمام
راہ بدل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
دشت کی ساری رونقیں خیر سے گھر میں ہیں، تو کیوں
گھر سے نکل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
اپنی تلاش کا سفر ختم بھی کیجیے کبھی
خواب میں چل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب **ہیں**

..... میرے سارے اکھّر .....

(ہن تائیں دا کہانی پندھ)

کہانی سے سامنا عموماً دو طرح سے ہوتا ہے۔ اولاً افسانہ نگار کہانی کی تلاش میں نکل کھڑا ہو اور بازارِ دنیا میں گھومتے پھرتے اس سے ملاقات کرنے کی کوشش کرے۔ بعض دفعہ اُسے دھوکا بھی کھانا پڑتا ہے اور کبھی مایوسی کا منہ بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ دوسری صورت میں کہانی از خود افسانہ نگار کو ڈھونڈتی ہوئی اس کے کمرے میں جا پہنچتی ہے اور اپنا دکھڑا اُس سے لکھوانے بیٹھ جاتی ہے۔ حنیف باوا کے ہاں یہ دونوں صورتیں موجود ہیں، لہٰذا ان کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے یکسانیت کا احساس نہیں ہوتا۔

میرے خیال میں حنیف باوا Man of the Street کے دکھوں، المیوں، محرومیوں اور آرزوؤں کو بیان کرنے والے افسانہ نگار ہیں۔ بہ الفاظ دیگر وہ زندگی کی برہنہ سچائیوں کو بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں، اور یہ سچائیاں ان کی کہانیوں میں جگہ جگہ اپنا دیدار کراتی ہیں اور قاری کو سوچنے پر مائل کرتی ہیں۔ .....سلیم آغا قزلباش

اشاعت: ۲۰۱۴ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: مثال پبلشرز، امین پور بازار، فیصل آباد

..... عجب ایک سلسلہ ہے .....

۲۰۱۲ء میں عمرہ اور دبئی کا سفر کیا تو یہی ارادہ تھا کہ اب ''رودادِ سفر'' بالکل نہیں لکھوں گی۔ چنانچہ نکات وغیرہ بھی قلمبند نہیں کیے۔ گھر پہنچی تو عادت سے مجبور ہو کر صرف اور صرف اپنے لیے یادداشتیں محفوظ کرنے کے خیال سے، اس سفر میں دوبارہ جینے کی حرص میں دورانِ سفر بیتے گئے حالات و واقعات، واردات و کیفیات کمپوز کرنا شروع کر دیں، کچھ ابواب برقی ترسیلات کے ذریعے احباب تک پہنچے، انہیں پڑھ کر اچھا لگا، لیکن میں کسی کی باتوں میں آنے والی نہ تھی۔۔۔ اب کے کتاب بالکل نہیں شائع ہوگی۔۔۔ اور اچانک جناب عبدالوہاب خان سلیم کا فون آ گیا۔ ''ابھی تک تمہاری کتاب کیوں نہیں پہنچی۔''

''کمپوز تو کر لی ہے پرنٹ نہیں کروائی اس لیے آپ تک نہیں پہنچی۔''

۔۔۔ اور اب یہ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے تو اس میں سارا کمال عبدالوہاب خان صاحب کا ہے، ان کے دستِ راست جناب تصور حسین جنجوعہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا کرے۔ مجھے تو صرف اس بات کی خوشی ہے کہ چند ایک قارئین کی رائے یہ ہے۔

''آپ کی کتابیں تو صدقہ جاریہ ہیں، انہیں پڑھ کر ہمارے دل میں حج و عمرے کی آرزو نے جنم لیا ہے''۔ .....قرۃ العین طاہرہ

اشاعت: ۲۰۱۴ء، قیمت: ۲۵۰ روپے: دستیابی: فاروبسلی کیشنز، اسلام آباد۔

..... فنون .....

(گولڈن جوبلی نمبر)

جناب احمد ندیم قاسمی مرحوم و مغفور کا لگایا ہوا ادب کا شجرِ نو بہار ''فنون'' اُن کی صاحبزادی ڈاکٹر ناہید قاسمی اور نواسے جناب نیّر حیات قاسمی اپنے والد اور نانا کی میراث کو نہایت شاندار طریق پر نہ صرف جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں بلکہ اُس کی طباعت اور پیشکش کو خوب سے خوب تر بنانے کی سعی بھی کر رہے ہیں۔ تازہ شمارہ سات سو چوالیس صفحات پر محیط ہے جس میں قاسمی صاحب محترم کے رشحات قلم کے علاوہ حمد، نعت، مقالے اور مضامین، فن اور فنکار کے عنوان سے نجیب احمد، ظفر سپل، خالد احمد، گوہر ملسیانی، ظہیر بابر اور چند اچھے کی تخلیقات پر سیر حاصل گفتگو شامل اشاعت ہے۔ اس کے علاوہ غزلیں، نظمیں، افسانے، یادداشتیں، فنون لطیفہ، سفرنامے، تراجم، انشائیے اور ڈاکٹر افتخار احمد کا گوشہ شمارے کی خصوصیات ہیں۔ فنون کا زیرِ نظر گولڈن جوبلی نمبر اردو ادب کے اعتبار اور وقار کو آگے بڑھانے کی ایسی دستاویز ہے جو ہر صاحب علم کی دسترس میں ہونا از بس ضروری ہے۔ ..... انوار شریف

قیمت گولڈن جوبلی نمبر: ۶۰۰ روپے، دستیابی: 251، بلاک F-2، واپڈا ٹاؤن، لاہور۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۳، شمارہ: نومبر، دسمبر ۲۰۱۴ء

بانی مدیر اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

○☆○

مدیران معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِ سالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ: 537/D-1، ویسٹریج-III، راولپنڈی، پاکستان۔

فون: (+92)-51-5462495,5490181

فیکس: (+92)-5550886

موبائل: (+92)-336-0558618

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق------شعیب حیدر زیدی
تزئین--------------عظمٰی رشید
کمپوزنگ------------تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز

روشنی بانٹتے لوگ---------امجد اسلام امجد ۵
شورِ ازل--------------پیرزاد قاسم ۶

افسانہ

زندگی بڑی حسین ہے--------پیرزاد قاسم ۷
براہِ راست-------------گلزار جاوید ۱۰
مجھے دعاؤں میں یاد رکھیئے------صاعقہ انعام ۲۰
ولولہ ہائے شوق---------علی سردار جعفری ۲۴
روح گرنوحہ کناں---------عزیز حامد مدنی ۲۷
دانشوری کے پیکر-----------ابوالخیر کشفی ۳۲
خون سے جب جلایا دیا------جگن ناتھ آزاد ۳۸
جذبۂ خاک پروری----------جون ایلیا ۴۲
درد کی زمینوں میں-----------شہزاد احمد ۴۶
خواب ہو جانے سے پہلے-------عزیز اندوری ۴۸
ایک خواب نادیدہ---------محمد علی صدیقی ۵۰
مرادوں کی کھیتیاں----------محسن احسان ۵۳
درد کی کائنات------------وسیم بریلوی ۵۵
جبرِ وقت کی سختی----------عطیہ سکندر علی ۵۸

افسانے

بروری روڈ-------------آغا گل ۶۲
وہ چار--------------شہناز خانم عابدی ۶۴
شعور کا سفر------------سید سعید نقوی ۶۶
کلموہی کہیں کی-------------سیمیں کرن ۶۹

وقت کی آندھی

سرور انبالوی، نقشبند قمر نقوی، اختر شاہجہاں پوری، آصف ثاقب، غالب عرفان، نذیر فتح پوری، خیال آفاقی، نسیم سحر، مقبول منظر، پریمی رومانی۔ ۷۱

ہوا کے دوش پر

ایک عام آدمی کی داستانِ حیات-----فیروز عالم ۷۶

سفرنامہ

چند سیپیاں سمندر سے---------پروین شیر ۸۰

روحِ وجدان

ڈاکٹر پنہاں، سیفی سرونجی، زہیر کنجاہی، کرامت بخاری، شگفتہ نازلی، پرویز مظفر، عارف شفیق، ابراہیم عدیل، مظہر بخاری، خواجہ غلام معین الدین گوہر، نوید سروش، وشال کھلر، تصور اقبال، غلام شبیر اسد۔ ۸۴

گرداب

زیرِ قلم ناول کا ایک باب---------شموئل احمد ۸۹

ہفت افلاک

عبداللہ جاوید، غالب عرفان، یوگیندر بہل تشنہ، صفوت علی صفوت، جاوید زیدی، عظمٰی صدیقی، انیس الرحمٰن، اسد اعوان۔ ۱۰۴

آئینۂ فن

قرطاس وقلم کا قیدی------رئیس الدین رئیس ۱۰۸

ایک صدی کا قصہ

پرتھوی راج کپور-------------دیپک کنول ۱۰۹

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین---------وقار جاوید ۱۱۴

☆

قرطاسِ اعزاز

○●○

پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی

○●○

کے نام

○●○

''روشنی بانٹتے لوگ''

وقت کے پار، کوئی ہے کہ نہیں!○ پسِ دیوار، کوئی ہے کہ نہیں!○ جس کا قصّہ ہو کہانی سے الگ○ ایسا کردار، کوئی ہے کہ نہیں!○ ان سوالوں کی گزرگاہ سے اب تک لاکھوں○ کارواں ، اہلِ ہنر کے گذرے○ (بستیاں اُن کی ہیں اب تک روشن)○ پھر بھی ایسی کئی تعمیریں ہیں○ جن میں آباد نہیں ہے کوئی○ تم بھی اے دوست مسافر ہوا انہی راہوں کے○ جن سے منزل کا نشاں ملتا ہے○ اپنے لوگوں کے لیے، ان کی بھلائی کے لیے○ تم نے سوچا ہے بہت○ اپنے اشعار میں انسان کی حرمت کے لیے○ تم نے لکھا ہے، بہت○ منتخب لوگ ہیں وہ○ جن کے دل اور دماغ○ ایک ہی لَے میں سفر کرتے ہیں○ جو محبت کو بنا لیتے ہیں مشعلِ جاں○ اور آباد نگر کرتے ہیں○ جن کو توفیقِ عمل، جرأتِ اظہار ملی○ تحفۂ حرف ملا، گرمیٔ افکار ملی○ روشنی بانٹتے لوگوں کی تگ و تاز سے جو○ ہر زمانے میں نمو پاتی ہے○ اُسی تسبیح کے دانے، تم ہو○ مجھ کو ہے ناز کہ اس رزم گہہِ ہستی میں○ مرے ساتھی، مرے دمساز، پرانے تم ہو!○ تم سے اس دور میں الفت کا بھرم ہے مرے دوست!○ جو بھی اعزاز ملے تم کو وہ کم ہے مرے دوست!

.....امجد اسلام امجد (لاہور)

''شورِازل''..... پروفیسرڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضاصدیقی

حمد

کسی گزرے زمانے میں
کہ جس کی مدت ہستی کا اندازہ
بہت آساں نہیں ہے
نہایت بے کراں پہنائیوں میں
سانس لیتی ہر توانائی
بہت مبہم سی ساعت میں
تصادم خیز رفتاری سے
پیہم رقص کرنے کا اشارہ پا گئی
اور پھر
میان رقص باہم
ملنے والی شکتیوں نے
سم پہ وہ گھنگرو بجائے
جس سے اک جھنکار گونجی
گونج
لمحوں کی مگر صدیوں پہ پھیلی
کائناتوں کو بناتی
زندگانی کے عجب امکان لاتی
پھیلتی، گھٹتی کبھی بڑھتی
کہیں اک لمحۂ موجود کے پہلو میں آ ٹھہری
عجب شورش عجب آواز تھی
اک شور تھا
شورازل پیدا سے شاید ملتا جلتا
جس نے موجودات کو
درہم کیا برہم کیا
سب ضابطوں کو فسق کر ڈالا
مگر اس عالم شورش میں
ساری انتہاؤں کے تصادم میں
فقط وہ تھا
جو حیرت سے مبرا
شورش ساعت سے بے پروا
بہت خوش کام و آسودہ
سکوں آثار و یساہی
کہ جیسا تھا۔خدا تھا

نعت

سکوں ملا ہے بھلا کب کسی کے دامن میں
سو آ بسا ہوں میں نعتِ نبی کے دامن میں

اُجالا آپ ہی کی ذات سے ہوا ورنہ
شعاعِ نو نہ تھی روشنی کے دامن میں

کشادہ قلبیٔ رحمت مآب کیا کہنا
پناہ سب کو ملی آپ ہی کے دامن میں

صحیح کہ فیض رسانی میں کوئی ان سا نہیں
بجا کہ رحمتِ حق ہے انہی کے دامن میں

شعور حق کی عجب روشنی ملی ان سے
وہ آ گہی کہ نہ تھی آ گہی کے دامن میں

وہ صلح کُل ہیں ہر اک صلح انکا نقشِ قدم
انہی کے پھول ہیں سب آتشی کے دامن میں

عروج آدم خاکی انہی کے فیض سے ہے
انہی کا حرف دعا زندگی کے دامن میں

جز ایک اشکِ ندامت جز ایک حرف دعا
نہیں ہے کچھ مری تر دامنی کے دامن میں

مجھے تو نعتِ نبی شاد کام رکھتی ہے
یہ اک گہر ہے بہت شاعری کے دامن میں

زندگی بڑی حسین ہے

پیرزادہ قاسم

جمیل نے جلدی سے منہ دھویا اور میلی پتلون پہن کر نکل کھڑا ہوا۔ محلے کے بازار سے گزرتے ہوئے اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔۔۔ ابھی آٹھ ہی بجے تھے۔۔۔ روز ہی وہ آٹھ بجے نکل جاتا اور رات گئے واپس آتا۔۔۔ وہ چھوٹے سے تاریک کمرے میں رہتا تھا۔۔۔ لیکن پہلے اسے یہ کمرہ اتنا تاریک معلوم نہیں ہوتا تھا جتنا آج کل اب تو کمرے کی گھٹی گھٹی فضا اسے کھا جانے کو دوڑتی۔۔۔ لیکن وہ اسی تاریک کمرے میں رہنے پر مجبور تھا۔۔۔ وہ سوچتا کہ انسان مجبور ہی پیدا کیا گیا ہے۔۔۔ کوئی بات انسان کے بس میں نہیں۔۔۔ وہ اپنی معمولی سے معمولی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔۔۔ خوشی ہی کو لے لو۔۔۔ دنیا میں کوئی آدمی خوش نہیں ہر ایک۔۔۔ ہر ایک کو کوئی نہ کوئی غم ضرور ہے۔۔۔ اس نے دیکھا چچا رحمت اپنی پان سگریٹ کی چھوٹی سی دوکان کھول رہے ہیں۔۔۔ وہ وہیں رک گیا۔۔۔ وہ روز یوں ہی رک جاتا تھا اور چاچا سے ایک سگریٹ لے کر ضرور پیا کرتا تھا۔

''چاچا سلام۔۔۔ لاؤ ایک سگریٹ پلاؤ!''

چاچا نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا جن میں احتجاج تھا۔۔۔ اور پھر انہوں نے ایک سگریٹ اسے تھما دی۔۔۔ ''سات روپے ہو گئے ہیں برخوردار اس سگریٹ کو ملا کر'' چاچا نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔ ''ہاں لے لینا چاچا تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے میں کبھی لوٹاؤں گا ہی نہیں'' جمیل نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔۔۔ ''بس ایک دو روز اور صبر کرو ادھر میری نوکری لگی ادھر میں تمہیں روپے دے دونگا'' صرف دو روز اور! چاچا نے اونگلی نچاتے ہوئے کہا۔۔۔ ''اس کے بعد میں انتظار نہیں کروں گا۔۔۔ مذاق نہیں ہے صاحبزادے سات روپے ہیں سات۔''

لاحول ولاقوت کیا دنیا ہے۔۔۔ جمیل نے سوچا۔۔۔ ہر ایک کو کوئی نہ کوئی فکر ستاتی رہتی ہے۔۔۔ یہاں کوئی خوش نہیں ہے۔

چاچا! کیا تم خوش ہو؟ جمیل نے پوچھا۔۔۔ ''کیا تمہیں کسی قسم کی فکر نہیں ستاتی؟''

خوش! چاچا چونک پڑے۔۔۔ ''ہاں میاں میں تو خوش رہتا ہوں۔۔۔ مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔۔۔''

''عجیب بات ہے جمیل بڑبڑایا'' لوگ اتنا جھوٹ کیوں بولتے ہیں''

اچھا چاچا میں چلا۔۔۔ دعا کرنا کہ آج نوکری مل جائے۔۔۔ مٹھائی کھلاؤں گا اور پھر وہ چل دیا۔

جمیل دن بھر پھرتا رہا مگر کوئی جگہ نہ مل سکی۔۔۔ وہ واپس لوٹ رہا تھا کہ اسے اپنی چچی کا خیال آیا۔۔۔ اور پھر نجمہ کی شوخ نظریں اسے یاد آئیں۔۔۔ وہ اس سے مذاق کیا کرتی تھی۔۔۔ حسین اور پر کیف مذاق۔۔۔ وہ نجمہ کو چاہتا تھا۔۔۔ لیکن وہ غریب تھا اور نجمہ امیر کی لڑکی۔۔۔ اگرچہ رشتہ دور کا نہیں تھا لیکن غربت نے اسے ان سے دور کر دیا تھا۔۔۔ اس نے سوچا لاؤ آج ملتا چلوں۔۔۔ بہت دن ہو گئے۔۔۔ اور وہ نجمہ کے گھر پہنچ گیا۔

''سلام علیکم چچی جان! اس نے چچی کو سلام کیا۔۔۔ چچی نے سر کو بڑے وقار سے جنبش دی اور آگے بڑھ گئیں جیسے یہ کوئی نوکر ہو۔۔۔ نجمہ نے اسے دیکھتے ہی ناک چڑھائی۔۔۔ توبہ تم تو ایسے لگ رہے ہو جیسے کوئی قیدی بھاگ نکلا ہو! کیا واقعی ایسا تو نہیں ہے؟'' اور جمیل سن ہو کر رہ گیا اسے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے ایک بڑی کاری ضرب اس کے سر پر ماری ہو۔۔۔

''ایسا نہ کہو نجمی۔۔۔ تم میرا مذاق اڑا رہی ہو!۔۔۔ تمہیں شاید نہیں معلوم کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔۔۔ لیکن تم اتنا ظلم تو نہ کرو مجھ پر نجمی'' اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔

''کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔۔۔ کیسی واہیات باتیں کر رہے ہو تم۔۔۔ بے کاری کی وجہ سے تمہارا دماغ الٹ گیا ہے۔۔۔ کتنے بدتمیز ہو تم۔۔۔ تمہیں مجھ سے محبت کرنے کا کیا حق ہے۔۔۔ ذلیل جاؤ نکل جاؤ ابھی نکل جاؤ۔۔۔ نجمہ چلاّ چلاّ کر اسے ڈانٹنے لگی۔۔۔ اور وہ واپسی کے لیے مڑ گیا۔۔۔ دروازے سے گزرتے وقت اس نے سنا چچی کہہ رہی تھیں'' کسے ڈانٹ رہی ہو نجمی بیٹی؟ کچھ نہیں ممی۔۔۔ وہ جمیل تھا۔۔۔ کہتا تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں! ہوں! ذلیل بھلا میں یہ ذلت کیسے برداشت کر سکتی تھی ممی۔۔۔ میں نے اسے ڈانٹ کر نکال دیا۔۔۔ دو پیسے کا آدمی۔۔۔ آپ نے دیکھا نہیں ممی وہ کتنے گندے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔۔۔ چھی چھی۔۔۔ مجھے تو گھن آتی تھی۔ نجمہ نے سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔۔۔

''میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اسے منہ نہ لگایا کرو۔۔۔'' ممی نے کہا اور وہ زیادہ نہ سن سکا۔۔۔ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ باہر آیا اور گھر کی طرف چل دیا۔۔۔ اپنی کوٹھری میں آ کر وہ خاموشی سے لیٹ گیا۔۔۔ اس نے سوچا۔۔۔ کتنی واہیات ہے یہ دنیا۔۔۔ یہاں کا ہر آدمی ذلیل ہے کاش وہ مر جائے۔۔۔ اور یہ سب سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔

اگلے دن وہ پھر صبح آٹھ بجے ہی نکل کھڑا ہوا۔۔۔ آج دو ایک آدمیوں نے اسے بلایا تھا۔

چاچا سگریٹ! اس نے دوکان کے سامنے رکتے ہوئے کہا۔

''چہارسُو''

چاچا نے ویسی ہی تاجرانہ نظروں سے اسے گھورا ''ہاں لے لو'' مگر کل یاد سے پیسے ضرور دے دینا سمجھے۔۔۔ سات روپے ایک آنہ سمجھ گئے نا ''ہاں ہاں چاچا آج مجھے نوکری ضرور مل جائے گی۔۔۔ سیٹھ اکرام نے بلایا ہے۔۔۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور چل دیا۔۔۔ سیٹھ کی دوکان کھلی تھی سیٹھ جی کرسی پر بیٹھے اپنی توند سہلا رہے تھے۔

''السلام علیکم سیٹھ جی!۔۔۔ جمیل نے بڑی خوش اخلاقی سے سلام کیا ورنہ زمانے کی تلخیوں نے اسے بہت تلخ بنا دیا تھا۔۔۔

''وعلیکم'' سیٹھ جی بولے اور عینک کے موٹے شیشوں سے اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگے۔۔۔

سیٹھ جی آپ نے آج بلایا تھا! جمیل نے کہا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔۔۔ سیٹھ جی بولے مگر تم کوئی چٹھی وغیرہ لائے کہ نہیں۔۔۔ دیکھو جی بات یہ ہے کہ ہم تم پر اعتبار نہیں کر سکتے۔۔۔ آج کل شریفوں کی شکل میں بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔۔۔ تم تو ویسے ہی غریب آدمی دکھائی دیتے ہو۔۔۔ اگر دوکان سے کچھ چلا گیا تو کیا پولیس تمہاری پھٹی پتلون بیچ کر مجھے دے گی؟۔۔۔ کوئی ضمانت لاؤ تو کام چلے۔

''ضمانت! تو نہیں ہے میرے پاس سیٹھ۔۔۔ مگر۔۔۔

''نہیں بنے گا کام بابا۔۔۔ ہم نے پہلے ہی بول دیا۔۔۔'' سیٹھ جی نے بات کاٹ کر کہا۔۔۔ اور وہ واپس لوٹ آیا۔۔۔ سیٹھ اکرام کتنا ذلیل ہے اس نے سوچا۔۔۔ کتنا بڑا وار کیا ہے آج اس نے۔۔۔ کیا واقعی غریب بدمعاش ہوتے ہیں کیا واقعی غربت جرم ہے۔۔۔ کیا واقعی وہ کسی سے محبت کرنے کے لائق نہیں ہوتے۔۔۔ ''ہاں ضرور یہی بات ہے'' ۔۔۔ آج وہ جلدی ہی لوٹ آیا تھا کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ اگلی پچھلی تمام باتیں سوچتا رہا ۔۔۔ وہ رات بھر نہ سو سکا۔۔۔ صبح اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔۔۔ آج وہ بہت اداس دکھائی دیتا تھا۔۔۔ شاید اس لیے کہ زندگی کی تمام تلخیاں اسے یاد آ گئیں تھیں۔۔۔ وہ گھڑی کو چابی دیتے ہوئے پھر انہیں تلخیوں میں کھو گیا یہ زندگی واقعی ایک گناہ ہے۔۔۔ اور ہر جینے والا گنہگار ہے گناہ، ذلت، مجبوری۔۔۔ اس نے گھڑی زور سے دیوار پر دے ماری ''کھٹ'' اور گھڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔۔۔ لیکن اس نے بالکل پرواہ نہ کی اور زندگی کی نئی، پرانی تلخیوں سے الجھا رہا۔

دروازے بند ہونے کی وجہ سے کمرے میں گرمی تھی۔۔۔ وہ اُٹھ بیٹھی اور ٹوٹا ہو لکڑی کا ڈبہ دروازے سے بچھا کر بیٹھ گیا۔۔۔ آج وہ عجیب کیفیت محسوس کر رہا تھا۔۔۔ اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔۔۔ محلے والے اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔۔۔ انہوں نے آج غیر معمولی طور پر اسے یوں بیٹھے دیکھا تو متعجب ہوئے۔۔۔ مگر وہ یوں ہی خاموش بیٹھا رہا حمید صاحب دروازے کے قریب سے گزرے تو ٹھہر گئے۔۔۔

''کیوں بھئی راضی خوشی! انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔۔۔

''خوشی'' اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔۔۔ ''کیا آپ خوش ہیں اس نے حمید صاحب کو گھورتے ہوئے پوچھا۔۔۔ کیا آپ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ آپ کو کوئی غم نہیں۔۔۔ مجھے بتایئے حمید صاحب کیا آپ کو اپنے ننھے بچوں کی فکر نہیں جو یوں ہی بے تعلیم آوارہ پھرتے ہیں اور آپ انہیں تعلیم نہیں دلا سکتے؟۔۔۔ کیا آپ کو اچھا نہ کھانے اور اچھا نہ پہننے کا غم نہیں؟ کیا آپ اپنی قلیل آمدنی کے بارے میں فکر مند نہیں؟ مجھے معلوم ہے آپ فکر مند رہتے ہیں۔۔۔ آپ غمگین رہتے ہیں۔۔۔ لیکن اس کے باوجود جھوٹ بولتے ہیں کہ آپ خوش ہیں اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔۔۔ لیکن میں۔۔۔ میں اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔۔۔ میں خوش نہیں ہوں حمید صاحب ساری دنیا خوش نہیں ہے۔۔۔ وہ جوش میں یہ سب کہتا رہا۔۔۔

''تم بیمار معلوم ہوتے ہو۔۔۔ آرام کرو۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ طبیعت زیادہ خراب ہو جائے۔۔۔ حمید صاحب یہ کہہ کر اپنی پرانی سائیکل پر چڑھ گئے۔۔۔ اور وہ سوچتا رہا کہ اس نے یہ سب سچ ہی تو کہا تھا۔۔۔ کتنی بری جگہ ہے یہ دنیا۔۔۔ واقعی بہت بری ہے۔۔۔

وہ وہیں دروازے کے پاس بیٹھا رہا۔۔۔ سامنے رضی خاں بڑھئی کا دس برس کا لڑکا جا رہا تھا۔۔۔ اس نے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور جب وہ قریب آ گیا تو اس نے پوچھا۔۔۔

کہاں پڑھتے ہو تم؟

موڈل اسکول میں۔۔۔

کس جماعت میں؟

چھٹی جماعت میں۔۔

کیا تم خوش ہو اس نے لڑکے سے بھی وہی سوال کیا۔۔۔

''ہاں میں خوش ہوں'' لڑکے نے جواب دیا۔

''تمہیں کس بات کی خوشی ہے؟۔۔۔''

''جب میں پڑھ لکھ چکوں گا تو بابو بنوں گا۔۔۔ خوب پیسے کماؤں گا۔۔۔ خود کھاؤں گا اور اپنے ماں باپ کو کھلاؤں گا۔۔۔ لڑکے نے جواب دیا۔

''بیوقوف! جمیل تقریباً چیخ پڑا۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ تو پڑھ لکھ کر بھی کچھ نہ کر سکے گا۔۔۔ بالکل میری طرح تیری ماں ایڑیاں رگڑتے رگڑتے مر جائے گی۔۔۔ اور تیرے پاس اس کی دوا کے لیے پیسے بھی نہ ہوں گے بالکل اسی طرح سے میری ماں مر گئی۔۔۔ تجھے سب ذلیل سمجھیں گے بالکل میری طرح ذلیل۔۔۔ اور آخر تجھے خودکشی کرنا پڑے گی''

وہ بولتا رہا۔۔۔ اس کے منہ سے جھاگ اڑ رہے تھے۔۔۔ لڑکا سہم کر دیوار سے جا لگا اور پھر موقع ملتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔۔۔ اس نے سوچا جمیل صاحب ضرور پاگل ہو گئے ہیں۔

''کیا کر رہے ہو یار! انور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔۔۔

''چہارسُو''

انور محلے کا ایک نوجوان تھا۔۔۔

''جھک مار رہا ہوں'' اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

''ابے تو ترخ کیوں رہے ہو سالے۔۔۔ کبھی تو سکون سے بات کیا کرو ہر وقت گرم رہتے ہو۔۔۔ خوش رہا کرو خوش نہیں تو بیمار ہو جاؤ گے۔

''خوش رہا کروں!۔۔۔ جمیل بپھر گیا۔۔۔ مجھے بتاؤ کہاں ہے خوشی۔۔۔ مجھے بتاؤ کیا تم خوش ہو۔۔۔ کیا تمہاری بوڑھی ماں خوش ہے جو ہر وقت محلے والوں کے برتن مانجھتی ہے۔۔۔ کیا یہی خوشی ہے کہ اس بوڑھی ماں کو سکون کے چند لمحے بھی میسّر نہ آ سکیں۔۔۔''

''کون سی فلم دیکھی رات؟'' ڈائیلاگ تو خوب یاد ہیں''۔ انور نے مذاق سے پوچھا۔۔۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔

اچانک وہ اٹھ بیٹھا۔۔۔ رات ہو گئی تھی۔۔۔ بازار کی رونق بڑھ گئی تھی۔۔۔ اس نے کمرے کے دونوں پٹ بند کئے اور باہر نکل آیا چاچا کی دوکان پر پہنچ کر وہ رک گیا۔۔۔ ''سگریٹ نہیں ملے گی میاں آج'' چاچا نے کہا۔۔۔ حساب کر دو آج''۔۔۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔۔۔ جیسے سن ہی نہ رہا ہو پھر وہ چونک پڑا۔۔۔

''رسی ہو گی زرا سی چاچا'' اس نے پوچھا۔۔۔

''ہاں مگر کیوں'' چاچا نے پوچھا۔۔۔

''ابھی لوٹا دوں گا ضرورت ہے''۔۔۔ اور چاچا نے رسی اسے تھما دی۔۔۔ چاچا! تم نے کہا تھا کہ تم خوش رہتے ہو۔۔۔ تمہیں کوئی غم نہیں ہے۔۔۔ تم جھوٹ بولتے ہو چاچا۔۔۔ تم خوش نہیں ہو۔۔۔ ساری دنیا جھوٹ بولتی ہے چاچا کیا تمہیں اپنے بڑھاپے کا غم نہیں کہ تم اس عمر میں کتنی محنت کرتے ہو کیا تمہیں تمہاری جوان لڑکی کا غم نہیں جس کی شادی صرف اس وجہ سے اب تک نہیں ہو سکی کہ وہ اندھی ہے۔۔۔ بولو چاچا کیا تمہیں اپنے جوان بیٹے کا غم نہیں جس نے خودکشی کی کوشش کی تھی اور آج وہ اسی جرم میں جیل میں ہے۔۔۔ تم غمگین ہو چاچا۔۔۔ لیکن تم بیوقوف ہو تم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہو کہ تم خوش ہو۔۔۔'' وہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا اور چاچا تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔۔۔ آہ بیچارہ چاچا نے سوچا بڑا پریشان ہے۔۔۔

رسی لے کر وہ سیدھا دریا پر پہنچ گیا۔۔۔ کانٹے دار جھاڑیوں کو پار کرتا ہوا وہ پہاڑی پر چڑھنے لگا۔۔۔ اوپر پہنچ کر اس نے رسی میں ایک بھاری پتھر باندھا۔۔۔ ایک سرا گردن میں باندھا'' اے زندگی تجھ پر لعنت ہو۔۔۔ ہزار بار لعنت ہو۔۔۔ میں آج تم سے جدا ہو رہا ہوں۔۔۔ تاکہ مجھے سکون مل سکے۔۔۔ میں خودکشی کر رہا ہوں اے ذلیل زندگی۔۔۔'' اس نے آنکھیں بند کیں اور نیچے کود پڑا مگر یہ کیا! رسی سے بندھا ہوا پتھر جو اسے نیچے گھسیٹے لے جا رہا تھا ایک گھنے درخت میں اٹک گیا۔۔۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلائے۔۔۔ رسی کمزور تھی ٹوٹ گئی اور وہ دریا میں جا پڑا۔۔۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا دریا کی تیز موجوں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔۔۔

''آہ'' اس نے انگڑائی لی اور آنکھیں کھول دیں۔۔۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔۔۔ اس کے کپڑوں پر ریت جمی ہوئی تھی۔۔۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا کیا میں جنت میں پہنچ گیا ہوں۔۔۔ مگر نہیں مرنے کے بعد درد کا احساس مٹ جاتا ہے۔۔۔ لیکن میں درد محسوس کر رہا ہوں۔۔۔ اس نے قریب بہتے ہوئے دریا پر نظر ڈالی اور پھر خودکشی کا منظر اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔۔۔

آہ! میں نے خودکشی کی تھی۔۔۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔۔۔ میرے پاس مال و دولت نہیں، عزت نہیں، حشمت نہیں۔۔۔ صرف ایک زندگی ہے اور اسے بھی یوں کھو دینے کی کوشش کی تھی۔۔۔ میں نے جرم کیا ہے لیکن اب میں خودکشی نہیں کروں گا۔۔۔ میں خود کو دھوکہ دے کر اپنی پیاری زندگی نہیں چھین سکتا۔۔۔ میں یہ جرم ہرگز نہیں کر سکتا۔۔۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ اس نے کمزور ہاتھوں سے اپنے کپڑوں سے ریت جھاڑی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔۔۔ جب وہ محلے میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی۔۔۔ اس نے دیکھا کہ رضی خاں بڑھئی کا لڑکا اپنے گھر کے آگے بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔۔۔ وہ قریب گیا لڑکے نے بھاگنے کی کوشش کی مگر بھاگ نہ سکا۔۔۔ کیا کر رہے ہو؟ اس نے پوچھا۔۔۔

پڑھ رہا ہوں!۔۔۔ لڑکے نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے خوب دل لگا کر پڑھو۔۔۔ ایک دن تم ضرور بابو بنو گے خوب پیسے ملیں گے۔۔۔ ہاں شاباش خوب محنت سے پڑھو۔۔۔ وہ چلتا ہوا۔۔۔ بازار والے موڑ پر مڑ گیا۔۔۔ انور! ارے تم کیوں اداس بیٹھے ہو۔۔۔ اس نے انور سے پوچھا۔۔۔ کیا بتاؤں یار سوچتا ہوں کہ کہیں نوکر ہو جاؤں۔۔۔ تاکہ ماں کو کچھ سکون مل سکے۔

''ضرور نوکر ہو جاؤ بھیا! اپنی ماں کو عیش کراؤ۔۔۔ مگر سنو خوش رہا کرو۔۔۔ اداس نہیں۔۔۔ ہنسو میرے کہنے سے ایک بار ہنسو۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ دونوں ہنسنے لگے۔۔۔ یہ دنیا بڑی حسین ہے پیارے جمیل یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔۔۔

''سلام علیکم چاچا! اس نے دوکان پر رک کر کہا۔۔۔''

وعلیکم سلام۔۔۔ چاچا نے جواب دیا۔۔۔ دو دن سے کہاں تھے بھئی۔۔۔ مجھے معلوم ہے تم مجبور ہو۔۔۔ پیسے ابھی نہیں لوٹا سکتے۔۔۔ کوئی بات نہیں جب ہوں تو دے دینا۔۔۔ مگر یہ بتاؤ کہ اس دن تم کیا کہہ رہے تھے۔۔۔ ''خوشی''، ''غم''، میں تو کچھ نہیں سمجھ سکا کیا مطلب تھا تمہارا؟

ہاہاہا! اس نے قہقہہ لگایا۔۔۔ ''کچھ بھی نہیں چاچا میں کہہ رہا تھا کہ ہم سب بہت خوش ہیں۔۔۔ ہمیں خوش رہنا چاہیے۔۔۔ زندگی بڑی حسین ہے چاچا۔۔۔ کیوں؟ ہے نا حسین؟ اور چاچا ایک بار پھر اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔۔۔

(مطبوعہ ''جام نو'' کراچی ۱۹۵۹)

براہِ راست

ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی بے پناہ و بے شمار اوصافِ حسنہ اور سخنِ بے مثال و بے نظیر سے آراستہ و پیراستہ مہذب، مؤدب، خلیق و حلیم شخصیت کے مالک ایسے انسان ہیں کہ اُن کی تعریف میں چاند سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے نہ صرف سورج کو بطور استعارہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں کسی ایک کے فیضان سے محرومی کا اندیشہ لاحق ہوسکتا ہے! تو اس قدر دشوار و پیچیدہ صورتِ حال سے نبٹا کیونکر جائے؟ آسان اور سہل طریقہ ہمارے خیال میں یہی ہے کہ زیرِ نظر اشاعت کے تمام مضامین، مقالے، آراء اور رشحاتِ پیرزادہ قاسم کی اصابت پر صاد کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب محترم کی آواز میں آواز ملا کر اتنا کرم کیجیے:

''مجھے دعاؤں میں یاد رکھیئے''

گلزار جاوید

☆ آپ کی خاندانی نسبت مولانا سیوہاری، حافظ ابراہیم، ڈاکٹر ریاض السلام، ڈاکٹر خورشید الاسلام اور عبدالرحمٰن بجنوری سے ملتی ہے۔ غالب تو خاندانی شجرہ کو شاعری پر فوقیت دیتے تھے آپ کے ہاں صورت حال کیا ہے؟

☆☆ اگر خاندانی شجرے میں روشن اور عہد آفریں نام ہوں تو ضرور خوش ہوا جاسکتا ہے۔ فخر بھی کیا جاسکتا ہے مگر یہ نام اور حوالے آپ کی بہت مدد نہیں کر سکتے۔ ان بیساکھیوں کے ذریعہ دور تک سفر نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کا اپنا تخلیقی جوہر اور توانائی ہی آپ کی مشکل آسان کرسکتی ہے۔ البتہ اگر آپ ایک اہم ادبی سلسلے کی کڑی ہیں تو آپ کا کام اور ادبی پیش رفت جو جائز طور پر آپ کو یہ مقام دے سکے آپ کے کام آسکتی ہے۔ خود سے سوال کرنا چاہیے کہ اگر آپ کے بزرگ آج زندہ ہوتے تو کیا وہ بھی آپ کے کام سے خوش ہوتے اور آپ پر فخر کرتے؟ میں نے تو جب بھی خود سے یہ سوال کیا تو مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ میری خاندانی نسبت سے جو چند نام آپ کے سوال میں آئے ہیں ان کے بارے میں قارئین بھی واقف ہوسکیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری غالبیات کے سلسلے کے اہم ترین شخصیات میں سے ہیں۔ ان کی تصنیف ''محاسنِ کلام غالب'' کے حوالے کے بغیر تفہیم کلام غالب پر گفتگو یا تجزیہ آگے نہیں بڑھتا۔ ان کے مقالات یادگار بجنوری اور باقیاتِ بجنوری میں شائع ہو چکے ہیں۔ ۲۰۰۴ء میں مقالاتِ بجنوری کے عنوان سے منتشر باقیات کو یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر خورشید الاسلام اردو زبان و ادب کے معروف پروفیسر رہے ہیں۔ علیگڑھ اور لندن یونیورسٹی میں پڑھایا۔ ان کے تنقیدی مضامین میں اعلیٰ تنقیدی جہت ملتی ہے جو رائج اسلوب سے مختلف ہے۔ پھر ان کی شاعری بھی ہمیشہ قابلِ توجہ رہی۔ ان کا ایک بڑا کام اٹھارویں صدی کی اردو شاعری کے بارے میں بہ زبان انگریزی لکھنا ہے جو انہوں نے پروفیسر رالف رسل کے ساتھ مل کر کیا ہے۔ ''تین مغل شعراء'' اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اسی طرح بہ زبان انگریزی غالب پر کام کیا اور رالف رسل کے ساتھ مل کر غالب کا انگریزی ترجمہ پیش کیا۔

ڈاکٹر ریاض الاسلام تاریخ کے معروف پروفیسر رہے۔ کراچی یونیورسٹی اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھایا۔ وسطی ایشیاء پر ان کا کام بہت اہم مانا گیا ہے اور ان کی تصنیف و تالیف کردہ کتابوں کی فہرست طویل ہے۔

حافظ ابراہیم ہندوستان کے اولین پارلیمنٹرین، وزیر اور گورنر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور سیاسی میدان میں ایک اہم شخصیت مانے گئے۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بلند پایہ اسلامی اسکالر، کتابوں کے مصنف، جمیعت علماء ہند کے صدر اور پارلیمنٹرین رہے۔ ان کی تصنیف ''قصص القرآن'' تو کئی جلدوں میں ہے اور آج بھی مقبول ترین دینی کتب کے فہرست میں شامل ہے۔

☆ لفظ پیرزادہ بزرگی کا تاثر رکھتا ہے آپ ہمیں بچپن اور تعلیمی ایام کی نسبت کچھ ایسی اٹھکیلیاں بتلایئے جو اب تک منظر عام پر نہ آسکی ہوں؟

☆☆ اگر لفظ پیرزادہ میں بزرگی کا تاثر ملتا ہے تو کچھ ضروری بھی نہیں کہ اس تاثر کو کم یا ختم کرنے کے لیے شعوری کوشش کی جائے اور بچپنے کی اٹھکیلیاں ڈھونڈی جائیں اور بیان کی جائیں۔ ویسے لفظ پیرزادہ میں تاثر نسبت کا ہے۔ رہا میرا بچپن تو اس میں کھیل کود بہت تھی اور ساتھ ہی غصہ وری۔ ذرا ذرا سی باتوں پر چیخ جاتا تھا اور مشکل سے قابو میں آتا تھا۔ موسیقی اور تصویری کتابیں پسندیدہ تھیں۔ ۱۹۴۶ء میں قائداعظم کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ڈان اخبار دہلی کے محمود حسین سیٹھی نے ایک نہایت دیدہ زیب کتاب شائع کی تھی۔ اس کتاب پر حاشیہ میں نے ہی تحریر کیا۔ اس وقت میری عمر کوئی پانچویں سال میں رہی ہوگی۔ ظاہر ہے گھر میں کافی لے دے ہوئی اور میری ٹھکائی بھی۔ پھر اسی تاثر یا نسبت سے جس کا ذکر آپ نے چھیڑا ہے میں سنورتا چلا گیا۔ غصہ وری اور ہنگامہ پروری اب کہیں دور دور تک بھی میری شخصیت میں نظر نہیں آتی اور اب تو کچھ یوں ہے:

ضبط کے ساتھ تحمل سے گزارا ہر دن
یونہی بنتا گیا جینے کا سہارا ہر دن

☆ اُن اشعار کا ماخذ بتلانا بھی ضروری ہے جو آپ سید کرار حسین زاہد کے پاس نظرِ ثانی کی غرض سے لے کر جایا کرتے تھے؟

☆☆ سید کرار حسین مرحوم میرے سکول میں استاد تھے۔ زاہد فتحپوری کے نام سے معروف تھے۔ ان کی شاعری کی کتابیں آج بھی حوالے میں ہیں۔ وہ میرے پسندیدہ اساتذہ میں شامل تھے۔ لیکن میں اسکول کے زمانے میں شعر نہیں کہتا تھا۔ سو نظرِ ثانی یا اصلاحِ شعر کی غرض سے اُس دور میں میں ان کے پاس کبھی نہیں گیا۔ البتہ اسکول کے آخری برسوں میں میں نے کہانیاں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ کئی کہانیاں اس زمانے کے اہم ادبی پرچے ''جامِ نو'' میں بھی شائع ہوئیں۔ غالباً ۱۹۵۸ء میں پہلی کہانی شائع ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ چلا پھر توجہ شاعری کی جانب ہوئی۔ کالج کے زمانے میں جب شعری نشست میں شرکت کا خیال آیا تو میں نے کچھ اشعار کہے اور اسکول جا کر حضرت زاہد فتحپوری کو دکھائے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور اشعار کو عروضی طور پر ٹھیک قرار دیا۔ یہاں یہ بات عرض کر دینی ضروری ہے کہ میں علمِ عروض سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتا۔ بہرحال یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ غزل بہ طور مشورہ کسی کو دکھائی ہو۔

☆ آپ کا فرمان سر آنکھوں پر:

قیامتیں گذر گئیں کسی کے انتظار میں
ہنوز منتظر ہوں میں قیامتوں کے درمیاں

شعر کے مخاطب سے غائبانہ تعارف تو کرا ہی دیجیے؟

☆☆ قیامتوں کے درمیاں جس کسی کا بھی میں منتظر ہوں اس سے تو آپ کا تعارف بھی ہے۔ میری کتاب ''شعلے پہ زباں'' کا انتساب اُسی سے ہے۔ یعنی ایک انصاف پسند اور آسودہ حال معاشرہ۔ جہاں دانش و بینش کی بے حرمتی نہ ہوتی ہو۔ میں تو آج بھی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی راہ دیکھ رہا ہوں اور قیامتیں گزرتی جا رہی ہیں۔

☆ سنا ہے! اکثر احباب آپ کے اشعار اپنے کہہ کر صفِ مخالف سے تعلقات کی استواری میں استعمال کیا کرتے تھے۔ دریافت یہ کرنا ہے کہ اس میں آپ کی مرضی و منشا کا دخل کس قدر ہوا کرتا تھا؟

☆☆ چلئے میرے اشعار کسی کے کام تو آئے۔ اگر کبھی احباب نے ایسا کیا بھی تو بھلا مجھے کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ البتہ مجموعی تاثر کے حوالے عرض ہے کہ میرے اشعار ''رومانی شاعری'' کے ذیل میں مشکل سے ہی رکھے جا سکیں گے۔ اس میں شاید کچھ اور ہے جو توجہ طلب ہو سکتا ہے۔ میرے یہاں تو اجتماعی ناآسودگی اور غمِ ذاتی محسوسات کی راہ سے اظہار پاتے ہیں اور ملال کی ایک لہر اس کی نمو پذیری کرتی ہے۔ آپ ہی سوچئے بھلا ایسے اشعار عاشقانہ پیش رفت اور تعلقات کی استواری میں کیا کام آتے ہوں گے۔

☆ اس خبر میں کس حد تک صداقت ہے کہ جس روز آپ کی شادی خانہ آبادی تھی اُس روز یونیورسٹی کی تمام طالبات نے اجتماعی سوگ منایا تھا؟

☆☆ خبر کی صداقت کے بارے میں کیا عرض کروں۔ یہ بیان پروین شاکر کا ہے۔ سو سچ ہی ہوگا کچھ مبالغے کے ساتھ۔ پھر کراچی یونیورسٹی میں پروین کی ایک اور ہمعصر ڈاکٹر کنیز فاطمہ شاہ نے اپنے ایک تاثراتی مضمون یا تحریر میں ایسا ہی انکشاف کیا ہے۔ شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ اب میں کسے کسے جھٹلاؤں۔ خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔ آپ بھی صرف نظر کیجیے۔

☆ ایک دوست کی مدح سرائی کے جواب میں آپ فرماتے ہیں ''تم نے نہیں سنا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کچھ ہوا ہی نہیں'' ازراہ کرم ہمارے قارئین کو تاریخ کی درستگی کے لیے ''کچھ ہونے کی تفصیل'' بتلا دیجیے؟

☆☆ نہیں سمجھ سکا کہ یہ حوالہ کب کا اور کہاں کا ہے۔

☆ آپ کی دیرینہ اُداسی کا سبب کوئی دریافت کرے تو آپ اُسے کس طرح مطمئن کیا کرتے ہیں؟

☆☆ دیرینہ اداسی کا سبب تو کچھ ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ دیرینہ اداسی کا سبب کوئی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بات آسان ہو جاتی اور میں جمیل الدین عالی کا یہ شعر سنا کر بات کو نبھا لیتا:

ہزار دوست ہیں وجہِ ملال پوچھیں گے
سبب تو صرف تمہی ہو میں کیا کہوں گا تمہیں

اور بات ختم کرنے کے لیے فراز سے مدد لیتا ذرا سے تصرف کے ساتھ:

کس کس کو بتائیں گے اداسی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

مگر آپ کا سوال گ! سو کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زندگی میں خوشی کے مقابلے میں غم دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔ یہ انسانی نفسیات کے حوالے سے مزاج کی تفہیم ہے۔ اب تو جینیاتی مطالعے اور جینیٹک میک اپ نے ساری انسانی نفسیات کو سہل بنا دیا ہے۔ جب ہم غم یا خوشی سے گزر جاتے ہیں تو رہ جانے والے اثرات یا کیفیت اداسی، ملال یا انبساط کی شکل میں بدل جاتے ہیں۔ اب اگر پیہم خوشی ہی خوشی ہے تو خوشگواریت مزاج میں گھر کرے گی اور اگر مسلسل غم ہی غم ہو تو اداسی یا ملال مزاج کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ زندگی کے داخلی و خارجی عوامل اور کیفیات مل جل کر غم انگیزی یا خوشگواری کا سبب بنتے ہیں۔ اب فرد کا رویہ ہے کہ وہ اس سے صرف نظر کرے یا توجہ دے۔ سو میں نے توجہ مرکوز رکھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے کہیں لکھا ہے کہ قسامِ ازل نے جب ردوقبول کا اختیار دیا تو کچھ لوگ پھول چنتے گئے اور کانٹے چھوڑتے گئے۔ آزاد نے کانٹے چن لئے اور پھول چھوڑ دیئے۔ اسی تکرار سے شخصی مزاج ترتیب پاتا ہے۔ خیر میں یہ کیا قصہ لے بیٹھا۔ بس یہ جان لیجیے کہ میرے مزاج اور سوچ کی تربیت یوں ہوئی ہے کہ میں درد اور غم کی فضیلت مانتا ہوں خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ کرب سے نشاطِ کرب اور درد سے نشاطِ درد میں بدل جائے:

اگر نشاطِ درد سے نہیں ہیں آشنا تو پھر
ہمارا اہلِ درد میں شمار کیسے ہوگیا

☆ آپ کی شاعری میں دوستوں سے گلہ مندی کا ذکر کثرت سے ملتا ہے آج کی نشست میں دستور اور موقع کی مناسبت سے نشان دہی نہ سہی اشارتاً کچھ بتلا دیجیے؟

☆☆ شکایت تو اپنوں ہی سے کی جاتی ہے۔ سو گلے مندی کو اسی ذیل میں رکھ لیجیے۔ بات بڑھانا چاہیں تو عرض کروں کہ میرے یہاں جہاں گلہ یا شکایت ملتی ہے بیش تر یہ شخصی حوالے سے نہیں ہے۔ یہ بات عمومی رویّے کی ہے جو ہمارے معاشرے میں غیر صائب رجحان کے طور پر در آیا ہے اور پھل پھول رہا ہے۔ دوستی تو یگانگت، محبت اور ایثار سے مشروط ہے۔ آج کی رواداری میں اقدار کی محاسبت اور مثبیت پر اصرار تو کرتے رہنا چاہیے۔ آج کے منظر نامے میں تو یہی نظر آتا ہے کہ:

اب رہ ورسم دوستی بس یہی ہو کے رہ گئی
کوئی فریب دے سکے کوئی فریب کھا سکے

ہاتھ ملانے والوں کے ہجوم میں فراز دوست تلاش کرتے تھے۔ آپ اور میں بھی اسی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

☆ آپ کو غزل کا نمائندہ شاعر گردانے والے آپ کی نظموں اور ہائیکوز کو فنی طور پر نامکمل کس سبب گردانتے ہیں؟

☆☆ مجھے غزل کا نمائندہ شاعر شاید اس وجہ سے کہتے ہوں کہ میں نے غزلیں زیادہ کہی ہیں۔ اور اپنے عہد سے جڑے رہنے کو ترجیح دی ہے۔ روایت، تہذیب اور عصری شعور کے امتزاج سے جو کچھ میرے یہاں در آیا ہے وہی بقول سردار علی جعفری انفرادی نوا ہے جو اسلوبِ بیان اور انتخاب الفاظ کے ساتھ میری پہچان بن سکا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ابھی میری نظموں پر علیحدہ سے نہیں لکھا گیا۔ بہت کم سرسری سی بات ہوئی ہے۔ پروفیسر سحر انصاری نے کہیں یہ لکھا ہے کہ میری نظمیں ایک علیحدہ مطالعہ چاہتی ہیں۔ کچھ نثری نظمیں اور ہائیکو تو میں نے تجربے کی خاطر لکھی تھیں۔ اب خال خال ہی توجہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا یہ جملہ کہ نثری نظم ابھی اپنے ن۔م۔ راشد کے انتظار میں ہے بلیغ اور توجہ طلب ہے۔ بہر حال میری نظموں پر تفصیلی تجزیہ اور تبصرہ ضرور ہونا چاہیے۔

☆ زیڈ اے بخاری، شمس زبیری، خالد علیگ اور عابد حشری کا آپ کی فنی زندگی میں کیا رول ہے اور کیا کسی کو آپ باقاعدہ اُستاد بھی مانتے ہیں؟

☆☆ یہ جو نام آپ نے لیے سب کے سب میرے سینئر تھے اور میری ہمت افزائی کرنے والوں میں شامل رہے۔ میں نے ان حضرات سے بہت سیکھا جس کے لیے شکر گزاری لازم ہے سو میں ہوں شکر گزار البتہ ان میں سے کسی سے بھی استادی شاگردی کا رشتہ کبھی نہیں رہا۔ دوست یا برادرِ مکرم کہہ لیجیے۔

☆ آپ کو خواجہ میر درد، مرزا غالب، میر تقی میر اور داغ دہلوی کی شعری وراثت کا امین گردانتا جاتا ہے۔ مزاجاً آپ کا رجحان کس جانب ہے اور اُس کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ خواجہ میر درد، میر تقی میر، غالب اور داغ کی شعری وراثت کا امین میں بھلا کیسے ہوگیا۔ یہ امانت داری کسی کے بس کی ہو تو ہو میں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کرسکتا۔ ہاں روایت کی پاسداری اور شعری روایت سے جڑے رہنا مجھے پسند ہے۔ محشر بدایونی کا شعر یاد آ گیا:

نو روزِ فن کا ہوگا کہیں جب بھی اہتمام
پہلا جلوس جشنِ روایت کا آئے گا

یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ اساتذہ کے کلام کا مطالعہ توجہ اور دلچسپی سے ہونا چاہیے۔ پھر آگے تو آپ کی اپنی سوچ اور آپ کا اپنا راستہ متعین ہوجانا چاہیے۔ پروفیسر ممتاز حسین نے یہ اشارہ کیا تھا کہ میری شاعری پر میر کے لب و لہجے اور سوز دروں کا بہت اثر ہے۔ ڈاکٹر کشفی نے بھی تراکیب اور لفظ تراشی کے ذیل میں میر اور غالب کے اثرات کی نشان دہی کی ہے مگر میرے نزدیک یہ سب راست اثر کے طور پر نہیں لیا جاسکتا۔ میں اپنے وقت اور اپنے زمانے میں اپنی سوچ کے ساتھ زندہ ہوں۔ روایت پسندی اور روایت پرستی میں فرق تو ہے۔ روایت پرستی محصور رکھنے کی کوشش کرتی ہے مگر روایت پسندی نئی جہت میں نئے سفر کی راہ نہیں روکتی۔ خاص طور پر جب بدلتے وقت کے ساتھ شاعری حسّی تجربات اور ابلاغ کی سطح پر نئے مطالبات سامنے لاتی رہتی ہے۔

☆ ڈاکٹر صاحب! ہم اُس ادبی علمی فضا سے آگاہی کے خواہش مند ہیں جس سے آپ نے روشنیٔ جاں کو حرفِ سخن بنانے کا ہنر آزمایا؟

☆☆ تخلیقی مزاج ذات میں موجود روشنی ہے جو جھلملاتی رہتی ہے اور مناسب وضروری نمو پذیری کو پا کر جگمگانے بھی لگتی ہے۔ جھلملانے سے جگمگانے تک کے سفر میں معدوم ہو جانے کے عمل سے بچالے جانا اہم معاملہ ہے۔ ماحول اور آپ کے اطراف پھیلی دنیا کی گرفت اس سارے عمل میں اہم فیصلے کرتی ہے۔ میں نے دنیا میں آنکھ کھولی اور سمجھ بوجھ پیدا ہوئی تو اطراف میں کتابیں، اخبارات، جرائد، علمی مباحثے، موسیقی کی محفلیں، صوفیانہ حلقے، ذکر و فکر کی مجالسیں اور سماع یہ سب کچھ تھا۔ گراما فون (باجا) ریکارڈز اور ریڈیو مقبول تھے۔ نہ جانے اب کسے یاد رہا کہ آل انڈیا ریڈیو اور پھر ریڈیو پاکستان سے بھی ریڈیو کا وقت شروع ہونے یعنی اناونس مینٹ سے ذرا پہلے ایک دھن (سازینہ) بجنا شروع ہوجاتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے وہ سازینہ بے حد پسند تھا۔

اور میں اس کے حصار میں چلا جاتا تھا۔ خیر گھر میں میری والدہ شعر کہہ لیتی تھیں لیکن ملّی اشعار۔ میرے والد بھی شعر کہتے تھے مگر باقاعدہ نہیں۔ میرے دادا کا قلمی دیوان بھی گھر میں تھا۔ یہ ماحول شعری تربیت کے لیے سازگار تھا۔ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے سب بھائی، بہن شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہ الگ بات کہ میرے علاوہ کسی نے بھی اس جانب توجہ نہ کی۔ عام طور پر

شعر گھڑنے کا عمل بیت بازی کے مقابلوں سے شروع ہو جاتا ہے۔ پھر اگر طبیعت رواں ہو جائے تو سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ میرے اسکول کے زمانے میں کئی جانے پہچانے شعراء کی فہرست میں شمار ہوتے تھے مثلاً زاہد فتحپوری، عبداللہ خاور اور مظفر حسین ظفر جونپوری۔ شعر و ادب کا خوب چرچا تھا شاید اس سے بھی ادب کے حوالے سے طبیعت میں امنگ پیدا ہوئی۔ یہ الگ بات کہ شاید میں کہانیاں ہی لکھنے لگتا۔ شعر کی جانب بالکل نہ آتا یا دونوں ساتھ ساتھ چلتے۔ خیر بات طویل ہوگئی سو اسے اب یہیں چھوڑتا ہوں۔

☆ شاعری دل و دماغ پر گذرنے والی کیفیت کو رقم کرنے کا نام ہے نا کہ سچائی، شائستگی اور دردمندی کا کتابچہ لکھنے کا؟

☆☆ دیکھنے، سننے، محسوس کرنے اور پھر سوچنے کے عمل سے گزرتے ہوئے ہم اظہار کی راہ تک آ پاتے ہیں۔ لفظیات اور شعری ضابطوں سے واسطہ پڑتا ہے پھر کہیں جذبات اظہار پاتے ہیں۔ آپ کے جذبات کیا کہنا چاہتے ہیں اور کس شدت کے ساتھ۔ غم اور شدید غم، خوشی اور انتہائی خوشی، گریز اور سپردگی سب جدا محسوسات کے طالب ہیں۔

بدحواسی شعری قالب میں ڈھلنے کے لیے جدا حواس مانگتی ہے۔ شدید سماجی ناانصافی پر بے ساختہ گالی بھی دی جاسکتی ہے اور احتجاج بھی رکارڈ پر لایا جاسکتا ہے۔ بس یہیں وہ معاملہ پیش آتا ہے کہ فکری سطح پر اختیار مناسب طرز اظہار کو اپنانا چاہتا ہے۔ ایسے میں سچائی، شائستگی اور دردمندی بہترین نصاب ہو سکتا ہے۔ میں اس کو اہم جانتا ہوں۔ ضروری نہیں کہ ہر کوئی اس سوچ کی تائید ہی کرے۔

☆ کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ بادشاہ کا بچہ بادشاہ اور فقیر کا فقیر، گر نہیں تو اس رائے کے معنی کیا ہیں ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کے مزاج اور قوت تخیل کے شاعر بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں؟

☆☆ مزاج اور قوتِ تخیل شاعری کے لیے بنیادی اور لازمی ہیں۔ قوتِ تخیل کے بغیر فکر، الفاظ کا چناؤ اور درست دروبست سب کچھ مصرعے میں موجود ہوتا ہے پھر بھی کسی چیز کی کمی رہ جاتی ہے۔ جو کچھ کم ہے یا نہیں ہے وہ ہے شاعری۔ لفظوں کے طومار میں اور شاعری کے انبار میں ہمیں شاعری کو ضرور تلاش کرنا چاہیے۔ اب رہا بلند مقام پر فائز ہونا تو اس کے لیے شاعری معیار کے ساتھ وقت اور زمانے کا ردوقبول اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ناقدین اگر میسر آ جائیں اور بے لاگ تنقیدی ضابطوں سے پرکھا جاسکے تو اس ''بلند مقامی'' کا جواز پیدا ہو سکتا ہے۔ شاعر کو اوّل تا آخر شاعر ہونا چاہیے۔ پھر اس کی سوچ، طرز اظہار، اسلوب اور موضوعات شاید کوئی فیصلہ کر سکیں۔

☆ آپ کے کلام کو مخصوص مزاج کا گردانے والے ابہام پیدا نہیں کر رہے؟

☆☆ شاعری میں مخصوص مزاج کا ہونا کوئی بری بات نہیں۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ ایسا کہنے والے کون ہیں اور انہوں نے میری شاعری کو کون سے خانے میں رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس سے شاعری کی تفہیم میں کیا ابہام پیدا ہوا۔ میرا مخصوص مزاج کچھ ہے تو یہی کہ میں اپنے بزرگوں کی بات کرتا ہوں۔ اور اپنے ہونے کو ان کے ہونے سے مشروط رکھتا ہوں:

یہ میرے لوگ ہیں میری فضا ہے میں نہیں ہوں!
اگر یہ سب ہیں تو کس نے کہا ہے میں نہیں ہوں

☆ مصوّرانہ کشش کا ذکر کرنے والوں کی بات بھی کچھ ادھوری لگتی ہے؟

☆☆ شاعری میں مصوّرانہ کشش اور مصوّری میں شاعرانہ ایمچری اگر ہو تو شاعری کی اثر انگیزی میں اضافہ ہو سکتا ہے اور تصویر کی معنویت بھی بڑھ سکتی ہے۔ مجھے تو مصوّری بہت پسند ہے۔ میں خود تو تصویریں پینٹ نہیں کرتا مگر تصویروں کی اور تصویریں بنانے والوں سے واقف ہوں۔ شاعری میں مصوّرانہ کشش کی راست صورت تو یہی ہے کہ وہ مصوّری کے موضوع سے جڑی ہوئی ہو۔ پھر غالباً یہ بھی کہ شعری سطح پر جو مصرعے لکھے گئے ہیں ان میں بیان کیا ہوا منظر نامہ خود ایک پینٹنگ کی شکل میں نظروں میں پھرنے لگے۔ یا اس مصرعہ پر پینٹنگ بنائی جاسکے۔ قمر جمیل کی نظموں کے مصرعے اور گلزار کی نظمیں اس کی ایک مثال ہو سکتی ہیں۔ میں نے اس جہت سے کبھی اپنی شاعری کا جائزہ نہیں لیا۔ سوچ کی گرہیں کھلیں تو صادقین کو ضرور یاد کیجیے اس کے تصرفات میں تو مصوری اور نقش گری کے ساتھ ساتھ شاعری بھی رہی۔ کمال کی رباعیات کہیں ہیں صادقین نے مثلاً:

اک بار میں ساحری بھی کر کے دیکھوں
کیا فرق ہے شاعری بھی کر کے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے
شعروں میں مصوّری بھی کر کے دیکھوں

☆ ایک زمانہ میں آپ ادبی ذوق کی تحصیل پر زور دیتے تھے اور اسے کسی ادبی روایت کی بقا اور افزائش سے بھی عبارت کرتے تھے۔ ہم آپ کے تصور اور تردد کے نتائج سے آگاہی چاہتے ہیں؟

☆☆ ادبی ذوق کی تحصیل پر اور ادبی روایت کی بقا اور ترویج پر میں اور مجھ جیسی سوچ رکھنے والے آج بھی زور دیتے ہیں۔ اور آج تو شاید اس کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے نے اپنی ترجیحات بدل لی ہیں اور یہ عمل تیزی سے رونما ہوا ہے۔ پیشہ ورانہ معاملات کو فوقیت حاصل ہو رہی ہے۔ اب جو شخصیات بن رہی ہیں اور اس معاشرتی تربیت سے گزر رہی ہیں وہ زیادہ تنوع نہیں رکھتیں۔ اکہری ہوتی ہیں۔ اگر معاشرے میں زبان، ادب، ثقافت وغیرہ ہوں تو متنوع شخصیات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس وقت صورتِ حال تشویش ناک ہے۔ اب دانشورانہ رویہ والے لوگ کم کم نظر

آتے ہیں اور قوم کی حیثیت سے تو ہم دانشورانہ قلاشی سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر یکجائی کے ساتھ خصوصی کوشش کی ضرورت ہے۔ نصابیات تمام کی تمام نظر ثانی چاہتی ہے۔ سماجی علوم کو نئے معنیٰ آفریں انداز میں رائج کرنا پڑے گا۔ پیشہ ورانہ تعلیم اپنی جگہ مگر ساتھ ہی زبان، ادب، دین، فلسفہ، طرز حیات اور نئی سماجیات کی جانب توجہ ضروری ہے۔

☆ انسانی اور سائنسی علوم کا امتزاج کس طرح وجود پاتا ہے اور اُس کے نتائج کس طرح کے برآمد ہوا کرتے ہیں؟

☆☆ سائنسی نقطۂ نظر حقائق کو جانچنے، جاننے اور سمجھنے کا جداگانہ رویہ ہے۔ حقیقت کا کھوج اور حقیقت کو پالینے کا سفر سائنس کے راستے سے بالکل مختلف سفر اور تگ و دو ہے جس میں جذباتیت صفر ہوتی ہے۔ کیفیت، تعداد یا مقدار کا موجود ہونا اٹل اور لازمی ہے۔ ''بے پناہ محبت ہے'' کہنا سائنسی نقطۂ نظر سے مناسب نہیں۔ شدت محبت کے درجات متعین کرنا پڑیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس صرف حقیقت پسند اور حقیقت پرست ہے۔ کم یا زیادہ کا بیان قبول نہیں کرتی۔ کتنا ہے یا کسقدر ہے صاف صاف سننا پسند کرتی ہے۔ ایسے میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ انسانی عمل، موجودات اور اشیاء کو سمجھنے کی سائنسی سطح ہمارے فکری کینوس کو وسیع تر بنا سکتی ہے اور یوں نئی جہتیں تلاش کرنا ممکن اور قدرِ آسان ہو جاتا ہے۔ غالب نے لکھا کہ ''پرتوِ خُر سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم'' تو ایک سائنسی تجربہ اور ایک سائنسی حقیقت کو بیان کر دیا لیکن مصرعہ ثانی میں ''ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک'' کہہ کر وہ انسانی نفسیات اور جذبات کی ہمنوائی میں انسانی محبت اور عشق کا لافانی نصاب تحریر کرتے نظر آتے ہیں۔ یہی امتزاج کہلایا جاسکتا ہے۔

☆ آپ کو سائنسداں شاعر کہنے والے ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی سے تشبیہ بھی دیتے ہیں مگر یہ نہیں بتلاتے کہ آپ کے سائنسی روّیہ نے اردو شاعری کو کس نئی چیز سے روشناس کرایا؟

☆☆ مجھے سائنس داں شاعر کی حیثیت سے نہیں پہچانا جاتا۔ اکثر تو اس بات سے واقف ہی نہیں کہ میں سائنس کی تدریس و تحقیق سے متعلق رہا ہوں۔ بات سمجھنے کی یہ ہے کہ ہمارے یہاں شاعری پیشہ نہیں ہے۔ یہاں ادبیات کا استاد شاعر ہوسکتا ہے۔ ایک وکیل، ایک انجینئر، ایک ڈاکٹر اور ایک سائنسداں بھی شاعر ہوسکتا ہے۔ لیکن معروف اسی وقت ہوسکے گا جب شاعری اس کی پہچان بن جائے۔ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ ایک بنیادی سطح کے سائنسداں مگر ساتھ ہی ایک بہت اچھے مصوّر بھی تھے جن کی تصاویر کی کئی نمائشیں جرمنی میں منعقد ہوئیں۔ شاعری سے بھی انہیں کچھ شغف تھا مگر شعر انہوں نے اہتمام سے نہیں کہے۔ ان کے سائنسی رویہ نے شاعری اور مصوری کو کوئی نئی جہت نہیں دی۔ ادھر ان کی مصوّری اور شاعری نے ان کی سائنسی پیش رفت میں شاید ہی کوئی کردار ادا کیا ہو۔ سو یہ لازم نہیں آتا کہ کسی کا پیشہ ورانہ رویہ اس کی شاعری کو کسی نئی جہت سے آشنا ضرور کرے۔ ہاں فکری طور پر سائنسی پس منظر کے ساتھ سوچنے کا عمل کچھ بدل سکتا ہے۔ میں تو وہی بات دہرانا چاہوں گا کہ سائنس سائنس ہے اور شاعری شاعری ہی ہے۔ سائنس جذبات سے عاری ہوتی ہے اور صرف حقیقت پسند ہوتی ہے جبکہ شاعری جذبات سے ہٹ کر یا صرفِ نظر کرتے ہوئے ممکن ہی نہیں ہے۔

☆ عشق کی روایت اور ارادوں کی تاریخ کو زندگی کا اثبات کس سبب گردانتے ہیں؟

☆☆ عشق کی روایت کے بارے میں آپ نے اچھی بات چھیڑی ہے۔ انسانی نفسیاتی میک اپ میں عشق کا خانہ ہے۔ بات فطری میلان سے شروع ہوتی ہے جو ہر کسی میں ہوتا ہے۔ مگر بعض شخصیات میں یہ میلانِ طبع مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اسی کو عاشقانہ مزاج سے تعبیر کرتے ہیں۔ عشق کی کرشمہ سازی دراصل ہمہ گیر ہے۔ مگر اس کا اہم ترین مظہر تو ایک ایسی ذات سے جڑ جانا ہے جو قائم و دائم ہو اور تخلیق کار اعلیٰ ہو۔ وقت اور زمانے سارے اسی جادۂ تخلیق کی گرد اور امکانات اسی راہ کا غبار بنتے جائیں۔ مگر عشق کی یہ تفہیم اسقدر آسان نہیں۔ سفر کی ایک جانی پہچانی اور مانی ہوئی سمت تو وہ سفر ہے جو نہ معلوم سے معلوم کی جانب ہے۔ مگر ایک اور بھی سفر ہے جو معلوم سے نامعلوم کی جانب کا ہے۔ اس کو اہل سلوک و احسان زیادہ بہتر سمجھ اور سمجھا سکتے ہیں۔ اس بات کو اسی حد تک چھوڑتے ہوئے شاعری کی جانب آجاتے ہیں۔ میر صاحب کے والد نے تو انہیں تلقین کی تھی کہ بیٹا عشق اختیار کرو اگر عشق نہ ہو تو سارا نظام زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ بے عشق زندگی وبال ہے۔ وغیرہ وغیرہ

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے اسی عشق کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عشق خود بھی مشعلِ جاں ہے وار ہمیں بھی شمع صفت بناتا ہے۔ محبوبی میں نہیں بلکہ پگھلنے میں۔ کیسی بلیغ بات کہی ہے۔ پھر اقبال کی جانب آیئے تو عشق کی عظمت اور برتری کا ذکر یوں ملتا ہے:

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصوّرات

میرے خیال میں انسان میں عشق کی برکتوں کے ذیل میں جو مزاج پیدا ہوتا ہے اس میں جستجو، تلاش، اضطراب اور بے قراری ہمیں نئی تگ و دو اور اعلیٰ شعری پیش رفت کی جانب لے جاتی ہے۔ دیکھئے اس موقع پر بیدلؔ کا بھی ایک شعر یاد آ گیا۔ میں نے عشق کی کرشمہ سازی کی بات کی تھی مگر بیدلؔ نے شکوہِ عشق کا ایسا بیان لکھ دیا کہ اب اس سے بہتر کی گنجائش ممکن نظر نہیں آئی:

غیر را در دل شکوہِ عشق گنجایش نداد
خانہ خورشید از خورشید مالامال بود

یعنی شکوۂ عشق نے دل میں غیر کے لیے جگہ چھوڑی ہی نہیں جس طرح خانۂ

خورشید میں صرف خورشید ہی ہے۔شاعری میں عشق کی روایت اسی فکری بالیدگی کے ساتھ پھلتی پھولتی ہے۔ زرّے سے آفتاب تک سب کو روشنی اسی سے ملتی ہے۔اسی کو زندگی کا ثبات سمجھ لیا جائے تو کیا برا ہے!

☆ زود گوئی زیادہ پسندیدہ عمل نہیں مگر آپ کے ہاں کثرت سے اس کی نشان دہی کی جاتی ہے؟

☆☆ میں شعر کہتا ہوں۔ اوسطً سال بھر میں کوئی آٹھ دس غزلیں، چند مختصر نظمیں اور کچھ متفرق اشعار ہو ہی جاتے ہیں۔غزلوں میں بھی سات آٹھ اشعار سے زیادہ شاز ہی نظر آئیں گے۔اسی کو شاید زود گوئی سے تعبیر کیا گیا ہے اور میرے یہاں کثرت سے یہ زود گوئی نہ جانے کس نے تلاش کی۔ ہمارے یہاں خانوں میں بانٹنے کا رواج بہت ہے۔کوئی زود گو کہلائے گا کوئی کم گو۔کسی کو مشاعرے کے خانے میں بٹھائیں گے تو کسی کو روایتی کہہ کر دل کا بوجھ ہلکا کریں گے۔مگر سب سے پہلے جان لینے والی بات تو یہ ہے کہ متعلقہ شخص حقیقی معنوں میں شاعر ہے بھی یا نہیں۔اس کی تخلیقی توانائی فکری سطح پر معنیٰ آفریں اور اظہار طلب ہے اور پھر فکر کو اظہار میں لانے پر کیسی قدرت ہے اور کیا اس کے شعر پڑھ کر قاری کے اپنے جذبات بھی اظہار طلب ہونے کی امنگ محسوس کرتے ہیں یا نہیں۔ دیانت دارانہ تجزیاتی فکر اور ناقدانہ عمل ہی ان معاملات کو بہتر طریقے سے دیکھ سکتا ہے اور بیان کر سکتا ہے۔مگر جون ایلیا تو یہی کہتے کہتے رخصت ہو گئے کہ ہمیں ہمارا ناقد میسّر ہی نہیں۔

☆ طویل ردیفوں کا استعمال بھی بہت سے حلقوں کے لیے توجہ کا باعث ہے۔ یہ عمل دانستہ ہے تو جواز کیا ہے غیر دانستہ ہے تو اس کا ماخذ ضرور بتلایئے؟

☆☆ ردیفوں کا استعمال اگر ادبی حلقوں میں توجہ کا باعث ہے تو بہت اچھی بات ہے۔توجہ دی جائے۔عروضی طور پر ردیف جو کچھ ہے سو ہے (میں عروضی معاملہ بندی سے زیادہ واقف نہیں) مگر ردیف میں جو فکری جہتیں ہوتی ہیں یا ہو سکتی ہیں ان کی اہمیت ہے۔ردیف کا شعوری انتخاب یا آمد عملی طور پر ایک احتیاط اور سہار چاہتی ہے۔ردیف اپنے ہونے کا جواز مانگتی ہے اور یہیں بڑی بڑی لغزشیں سرزد ہونے کے امکانات ہو سکتے ہیں۔ردیف یک لفظی ہو، مختصر ہو یا طویل اسے ہر حال میں بامعنیٰ اور سیاق و سباق کی بے دیاری سے دور رہنا چاہیے اور اپنے ہونے کا قابلِ قبول جواز پیش کرنا چاہیے۔ردیف کا انتخاب یا چناؤ دانستہ و غیر دانستہ ہر دو صورتوں میں یکساں مطالبات رکھتا ہے۔ میرے یہاں جو ردیفیں استعمال ہوئی ہیں جن طویل ردیفوں کی کافی تعداد بھی ہے شعوری انتخاب کے ذیل میں نہیں ہیں۔ ان سب کو مذکورہ ضابطوں پر رکھ کر ضرور پرکھیے۔

☆ تصوف کے حوالے سے اگر ہم آپ کے روّیوں اور مزاج پر اکتفا کریں تو بات واضح نہیں ہوتی آپ اگر چاہیں تو ہمارا اشتیاق دور کر سکتے ہیں؟

☆☆ مجھے اندازہ نہیں ہو سکا کہ کیا بات واضح کرنی ہے جو بظاہر نہیں ہو سکی ہے۔اگر میری شاعری کو آپ صوفیانہ کلام کے ذیل میں رکھنا چاہتے ہیں تو وہ تو نہیں ہے۔تصوف کو بنیادی طور پر سمجھنے کے لیے اس کا فلسفہ اور پھر آداب و اشغال پر نظر ڈالنی پڑے گی۔ یہی تعلیمات اسی عنوان سے دیکھنا چاہیں تو ہزاروں کتابیں ہیں حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب ہی دیکھ لیجیے۔مگر سوال سے جڑے رہ کر بات کو کچھ اس طرح سمجھنا چاہیے کہ ظاہر و باطن میں ایک واضح سوچ ہو تصوف کے فلسفے سے کسی طور اخذ کی ہوئی ہو اور شاعرانہ فکر میں چہرہ نمائی کرنے لگے تو شعری مزاج بدلنے لگتا ہے۔سچائی، شائستگی اور دلگدازی شعر میں زیادہ معنیٰ آفرینی کے ساتھ نظر آنے لگتی ہے۔میری تربیتِ ذات میں کچھ ایسے ہی عوامل کی کارفرمائی ضرور ہو سکتی ہے۔

☆ ترقی پسندی اور جدیدیت سے جدا راستے کی تلاش میں کامیابی کا تناسب کیا ہے؟

☆☆ ادب کی تفہیم کے لیے آسانی چاہنے والے زماں و مکاں کے حوالوں سے خانے بناتے ہیں۔فکری پس منظر کے حوالے سے تقسیم کرتے ہیں اور مکاتیبِ فکر کا سوال بھی اٹھاتے ہیں۔ترقی پسندی اور جدیدیت ایسے ہی تقسیم در تقسیم مباحث کے خانے ہیں۔کس کو کس سے بچنا ہے، کس کو کس کے ساتھ چلنا ہے اور ہر دو سے جدا راستہ کون سا ہے۔اس پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ گنجائش نکلتی بھی آئے گی۔اور اب یہ بحث تو ترقی پسندی اور جدیدیت سے آگے نکل چکی ہے اور ایسا ہونا کچھ غیر مناسب بھی نہیں۔اصل معاملہ شاید یوں ہے کہ زمانہ اور وقت ساکن و جامد نہیں۔وقت کا ٹھہراؤ اگر کچھ ہے بھی تو عارضی۔ وقت گزرے چلا جاتا ہے۔اسی طرح ساتھ ساتھ اقدار بھی بدلتی جاتی ہیں۔منظر نامے تبدیل ہوتے ہیں تو سوچ بھی بدلتی ہے، نقطہ نظر تبدیل ہوتا ہے۔طرزِ فکر کی تبدیلی کے ساتھ طرزِ اظہار بھی بدلتا ہے۔ایک عرصہ و اعتبار میں یہ بدلی ہوئی طرز اس عہد کی پہچان بن جاتی ہے۔میرے خیال میں فکری طور پر جو ذہن یا سوچ بنتی ہے اسے وسیع معنوں میں رو بہ ترقی اور ترقی پسند ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ سفر جاری سفر ہے۔اس ترقی پسندی کے لیے کوئی بیرونی تحریک ضروری نہیں۔اسی طرح جدیدیت کو بھی سمجھنا چاہیے۔جس طرح فکری سفر کی تسلیم شدہ راہ نامعلوم سے معلوم کی جانب ہے اسی طرح قدیم سے جدید اور جدید سے جدید تر کی جانب کا سفر ہے۔اس میں طرزِ اظہار، طرزِ فکر اور اسالیب کی تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے۔ بہر صورت سب کو بنیادی طور پر ترقی پسند اور مائل بہ جدید ہونا چاہیے۔ یہ میری اپنی رائے ہے اور میں نے ان اصطلاحات کو ان معنیٰ سے ہٹ کر لیا ہے جیسا کہ وہ بیان کی جاتی ہیں۔مختصر طور پر جائزہ لیا جائے تو اردو ادب کی تحریکوں میں شاید علیگڑھ تحریک کو اولیں کہا جا سکے۔ بعد کے زمانے میں زیادہ چرچا ترقی پسند تحریک کا رہا اور اشتراکی نظریے سے متاثر ادیبوں اور شاعروں نے اس کو نمایاں آہنگ دیا۔اصل مقصد تو ادب کو زندگی سے قریب لانے کی کوشش ہی تھی

اور توجہ کا مرکز سماجی ناانصافی کا رد اور تعمیرِ زندگی کی امنگوں کو اجاگر کرنا تھا۔ فرسودہ ادب پر تنقید اور مقصدیت کا فروغ نظر میں تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے اثرات مرتب ہوئے جو اہمیت کے حامل ہیں۔ ادھر زندگی کے داخلی اور خارجی عوامل کی کشمکش میں رد و قبول کے مراحل سے گزرتے ہوئے حسیّاتی دائرے اور فکری عناصر ایک اکائی میں سمٹنے کی تگ و دو کرتے ہیں جو جدیدیت کی اساس ہے۔ جہاں شخصیت سے گریز لازمی ہے اور لایعنیت پر اسرار بھی شامل ہے۔ جدیدیت سے مابعد جدید اور نئے فکری تصورات سے آراستہ (جس میں انفارمیشن اور ٹیکنالوجی بھی شامل ہے) سفر کرتے ہوئے شاعری اب نئی شاعری کی سطح پر آ گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی پیش رفت ہر دور کے اعتقادات اور تصوّرات میں ہلچل تو مچا ہی دیتی ہے مگر شاید اس سے ہمارے لیے اس بات کا سمجھ لینا آسان ہو سکتا ہے کہ ہم آگے کی طرف سفر کر رہے ہیں یا نہیں۔ بہرحال شاعری کو کسی بھی خانے میں رکھیے یہ ایک ظاہر تسلسل ہے جس میں تہذیب، زندگی اور فن مربوط ہو کر پیش رفت بھی کرتے نظر آتے ہیں اور بدل جانے کی سکت کے ساتھ ادبی سفر اور جہتوں کو واضح کرتے رہتے ہیں۔ اس کو عملِ تسخیر اور سفرِ مسلسل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ نئی شاعری کی تفہیم کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے لکھا ہے کہ یہ نئی شاعری کا مقدّر رہے کہ وہ انسان اور کائنات کے پورے بوجھ کو اپنے کاندھوں پر سہار سکے۔ یہ شاعری وقت کی تصویر ہی نہیں تفسیر بھی ہوتی ہے۔ بات آگے نکل گئی سو یہاں ٹھہر جانا چاہیے۔

☆ معاشرے اور اجتماعی ایف۔ آئی۔ آر بقول آپ کے اہلِ قلم کاٹتے ہیں۔ پہلے تو یہ فرمایئے اب تک کاٹی گئی اہلِ قلم کی ایف۔ آئی۔ آر کے نتائج کیا نکلے دوئم یہ کہ کراچی کے اہلِ قلم کو اس حق سے کیوں محروم رکھا گیا؟

☆☆ جس ایف۔ آئی۔ آر کا حوالہ دیا جا رہا ہے یہ حقیقتاً تھانوں میں درج نہیں ہو سکتی۔ یہ گفتگو مری کتاب ''تند ہوا کے جشن میں'' میری پیش کردہ معروضات کے ذیل میں آئی ہے۔ معاشرے میں بکھراؤ کا عمل اگر تبدیلی کے ذیل سے نکل جائے اور تعمیرِ نو کے امکانات بھی معدوم ہونے لگیں تو منظر نامے میں پریشاں خیالی، معاشرتی بے حسی، تاراج ہوتی روایتیں ٹوٹتے اور بکھرتے انسانی رشتے، معاشرتی ناہمواریاں اور ناآسودگی ہی نظر آئے گی۔ اس سب کے خلاف ایف۔ آئی۔ آر ادب میں اور شاعری کی بیاض میں درج ہوتی آئی ہے۔ اس پر حیرت کیا۔ اذہان کو بدلنے کی کوشش اور ان تمام خرابیوں کے خلاف خطِ تحفظ کھینچنے کا عمل ہی نتائج مرتب کر سکتا ہے۔ اور اثرات مرتب ہوتے بھی ہیں۔ لیکن یہ کوئی سرکاری آرڈر یا آڈیننس نہیں ہو سکتا۔ نقاد کی قوت بھی ایک جدا معاملہ ہے۔ بہرحال ان سارے معاشرتی مسائل کا جائزہ گر ادب رہا ہے۔ آج کے لکھنے والے خواہ کسی بھی خطّے سے ہوں یہ ایف۔ آئی۔ آر درج کر رہے ہیں یہ سب کا حق ہے اور ذمہ داری بھی۔

☆ ایک تاثر یہ ہے کہ آپ دورِ حاضر کی مسخ ہوئی تہذیب سے مایوس نہیں، اپنی فکر کی چتوار سے اسے اُبھارنا چاہتے ہیں۔ تن تنہا شخص اور علم و ادب کا ہتھیار سوالیہ نشان نہیں؟

☆☆ یہ تاثر درست ہے کہ میں تہذیبی خلفشار کو دیکھتا ہوں تو تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ مگر ماحول کے اس انتشار کو میں نے فکری انتشار میں نہیں بدلنے دیا۔ اس لیے مایوسی قدم نہیں جمانے پاتی:

میرے لہو میں جل اٹھے اتنے ہی تازہ دم چراغ
وقت کی سازشی ہوا جتنے دیے بجھا گئی

اب رہی بات تنہا ہونے کی تو میں تنہا کب ہوں۔ آپ گلزار جاوید تو میرے ساتھ ہیں اور پھر آپ کے ساتھ بھی کوئی ہے اور پھر اس کے ساتھ بھی۔ خیر کے سلسلے یونہی جاری رہتے ہیں اور بات کچھ نہ کچھ آگے بڑھتی ہی جاتی ہے۔

☆ اُس تشویس کی بابت کچھ روشنی ڈالئے جو آپ لمحہ موجود کے دونوں اطراف محسوس کرتے ہیں؟

☆☆ یہ بات شہزاد احمد نے چھیڑی تھی اور اب ان جیسی عالمانہ تفہیم کرنے والے کہاں ہیں۔ میں تو صرف یہ عرض کر سکوں گا کہ لمحۂ موجود ایک فعّال، متحرک اور نمو پذیر حقیقت ہے۔ ایک جانب اس کی ہمرشتگی گزرے ہوئے زمانے سے ہے تو دوسری جانب مستقبل سے بھی جڑ جانے کی خواہش۔ لمحۂ موجود یا حال و حاضر کی کوئی بھی تشویش ایسی نہیں جو ماضی کے عوامل سے جڑی ہوئی نہ ہو۔ اور جو کسی بھی قسم کی آرزومندی سے مبرّا ہو۔ یہی آرزومندی آنے والے کل کے لیے امکانات تلاش کرتی ہے۔ فرد ہو یا قومیں آرزومندی کے بغیر جینے کی طرح نہیں جی سکتیں۔ اکہری سوچ رکھنے والے تخلیق کار اپنے ہونے کا حق ادا نہیں کر پاتے۔ ان عوامل اور اس ہمرشتگی کو یکجا دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے:

شعورِ عصر ڈھونڈتا رہا ہے مجھ کو اور میں
مگن ہوں عہدِ رفتہ گاں کی عظمتوں کے درمیاں

اس شعر میں حال سے ہمرشتہ ماضی اور فردانئی سوچ کی ایک اکائی بناتے ہیں جس میں شعورِ عصر ماضی سے مستقبل تک کی جائزہ گری کرتا نظر آ سکتا ہے۔ اور لمحۂ موجود کے دونوں طرف کا منظر نامہ مرتب ہو سکتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں روایت سے رشتہ برقرار رکھنے کی خواہش کے باوجود بیگانگی کا عمل بھی دیکھنے میں آتا ہے؟

☆☆ اس حوالے سے کچھ بات پچھلی گفتگو میں کہیں آ چکی ہے جس میں روایت پسندی اور روایت پرستی کے فرق پر بات ہوئی تھی سو میں نے روایت سے جڑے رہ کر ایک جانب تغزل، علامت اور اسلوب کو پیشِ نظر رکھا تو دوسری جانب نئے عہد کا آہنگ، معاشرے کے سماجی اور سیاسی تعمّلات، انداز و اطوار اور تازہ معنویت کو بھی تلاش کیا ہے اور اظہار کے قالب میں ڈھلتے ہوئے بھی دیکھا۔ شاید اسی کو آپ نے محض روایت سے بیگانگی کا عمل جانا۔ کسی نے کہا ہے کہ زندگی کی طرح خیال بھی شاخ در شاخ نمو چاہتا ہے۔ سو اس نمو پذیری کے

لیے یہی فکر نصاب مناسب ہے۔ سمجھ لینا چاہیے کہ جدید ذہن نئے علوم، اس کے طریقۂ کار اور پورے معاشرے کے تغیرات ہی سے تشکیل پا سکتا ہے۔

☆ آپ کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں کلام کے علاوہ شخصیت اور ترنم کو کتنے فیصد نمبر ملا کرتے ہیں؟

☆ آپ کو مشاعروں کا شاعر کہنے والے کس چیز کی بھڑاس نکالنا چاہتے ہیں؟

☆ ایک طرف آپ کو مشاعروں کا شاعر گردانا جاتا ہے دوسری طرف اکثر لوگ اس بات پر گلہ مند ہیں کہ آپ وعدہ کے باوجود مشاعروں میں نہیں پہنچتے؟

☆ مشاعروں پر ایک الزام متاشاعروں اور گلے بازوں کی شرکت کے علاوہ پرکشش شخصیت، لباس اور غازے وغیرہ کا بھی لگا کرتا ہے؟

☆ آج کی منافع بخش سوچ اور تہذیب وتمدن سے نا آشنا ماحول میں مشاعروں کی روایت کس حد تک سودمند ہے؟

☆☆ جدید ذہن اور تازہ معنویت کی گفتگو کے بعد پانچ سوالات مشاعرے سے متعلق ہیں۔ آپ نے بھی مشاعرے کو کافی اہمیت دے ڈالی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مشاعرہ کوئی بڑا ادبی حوالہ یا ریفرنس نہیں ہے۔ مگر شعر کے عمومی ذوق کی ترویج کے حوالے سے ضرور ایک بڑا اور اہم حوالہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی سمجھ لی جائے کہ مشاعرے کا کامیاب ترین شارع ادبی ریفرنس کے مطابق لازماً وقت کا بڑا شاعر نہیں کہلایا جا سکتا۔ اور مشاعرے ہی کا غیر مقبول شاعر ادبی سطح پر کمتر شاعر قرار دیا جائے دراصل غیر معقول سوچ ہے۔ اسی طرح ادبی حوالے سے ایک بڑا نام مشاعرہ کا کامیاب ترین شاعر ہو لازمی نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ شاعر کو شاعر ہونا چاہیے۔ مشاعروں کا شاعر، کتابی شاعر، رسالوں کا شاعر، فلمی شاعر اور اخباروں کا شاعر کچھ مناسب تقسیم نہیں ہے۔ کیا ان اقسام میں شاعر ہونے کی بنیادی شرائط علیحدہ علیحدہ کمزور یا سخت بنائی جائیں گی۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، اختر الایمان، مجروح، کیفی اور پھر منیر نیازی، احمد فراز، جون ایلیا اور حبیب جالب ہمیشہ مشاعروں میں بھی رہے۔ اب دوسرا معاملہ ہے معروف اور مقبول ہونے کا۔ ادبی حوالے سے ہر بڑا شاعر لازمی طور پر مقبول شاعر نہیں بن سکتا۔ اور یہ بھی لازم نہیں کہ ہر مقبول شاعر بڑا شاعر کہلائے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے کام کی بنیاد پر آپ معروف ومعتبر تو ہو سکتے ہیں لیکن مقبولیت اور ہر دلعزیزی دوسری چیز ہے۔ میں اسے من جانب اللہ سمجھتا ہوں۔ یہ اللہ ہی ہے جو ہماری بات اور اظہار میں تاثیر پیدا کر دیتا ہے۔ حرف کو اعتبار بخشتا ہے۔ تربیتِ ذات کے حوالے سے شخصیت بہت اہم ہے۔ اگر شخصیت میں باطنی اور ظاہری سجاؤ اور رچاؤ پیدا ہو سکے تو مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی جانب راہ کسی قدر ہموار ہو سکتی ہے۔ شخصیت کے اظہار میں انداز گفتگو جو ذہنی پس منظر کے بے غبار انداز میں ظاہر کر سکے بہت اہم ہے۔

مولا علیؓ کا قول تو سب ہی کو یاد ہوگا کہ گفتگو کرو تا کہ تم پہچانے جاؤ۔ یہی گفتگو کا انداز پر تاثیر ہوتا ہے اور شخصیت کو بھی پر تاثیر بنا دیتا ہے۔ سچائی، نیک نفسی اور دردمندی جسقدر بھی شخصیت میں رچ بس سکے گی اتنی ہی شخصی کشش بڑھتی جائے گی۔ مجھے بھی اللہ نے اپنے فضل وکرم سے فیضیاب کیا ہے اب جہاں جہاں میری تحسین ہوتی ہے میں رب کا شکر بجالاتا ہوں اور ہر دم اسی کے کرم کا طالب رہتا ہوں۔ تحسین اور تہنیت کی یلغار کیسا کیسا دل خوش کرتی ہے آپ سمجھ سکتے ہیں۔ مگر نفس کے ساتھ ہونے والا معاملہ بہت گھمبیر ہوتا ہے۔ سو میں تو تزکیہ نفس سے گزرتا رہتا ہوں۔ اور کتنے یہ اہتمام کرتے ہوں گے مجھے نہیں معلوم۔ صرف سج دھج سے (وہ بھی ذاتی اور انفرادی) بھی مقبولیت کا رشتہ استوار ہوتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے مثلاً شوبز اور ماڈلنگ وغیرہ میں۔ اب یہ سب بقول آپ کے دل کی بھڑاس نکالنے والوں کے کیا کام آئے گا مجھے معلوم نہیں۔

ایک بات ترنم کی بھی اٹھی ہے۔ میرے نزدیک شعر کے لیے ترنم غیر ضروری ہے۔ ہاں اس سے شعر کی اثر انگیزی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مگر اس کی پوری روایت قدیم سے موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ حوالہ مشاعرہ یا شعر خوانی کی مجالس ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ میں مشاعرانہ ترنم کی بات کر رہا ہوں گائیکی کی بات نہیں۔ گائیکی کی بدعت ان مشاعروں میں در آئی ہے جو خالصتاً تفریحی پروگرام کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ شعری انٹرٹینمنٹ کے یہ جلسے ہندوستان میں عام ہیں۔ اس کے اثرات پھیلے ہیں اور اب تو مشاعرے کوی سمیلن سے جا ملے ہیں۔ اس میں تو گائیکی اور ظاہری بناؤ سنگھار سب کچھ چلے گا۔ پاکستان میں یہ سب کچھ اس طرح نہیں ہے اور ہونے کے امکانات بھی نہیں ہیں اس لیے کہ مشاعرہ پاکستان میں آخری سانسیں لے رہا ہے۔ بڑے اجتماعات تقریباً ختم ہو چکے۔ شعری نشستیں البتہ موجود ہیں وا را مکان ہے کہ قائم رہ سکیں۔ پاکستان میں مشاعروں کے اس احوال کو جان کر مشاعروں سے بدکنے والے یا بار نہ پانے والے خوش ہو سکتے ہیں۔ ہمارے موجودہ معاشرے نے تو زبان، ادب اور تہذیب وغیرہ کو اپنی ترجیحات کی فہرست سے خارج کر دیا ہے کیونکہ یہ سب منافع بخش معاملاتِ زندگی نہیں ہیں۔ بلند معیار زندگی، عہدہ، تنخواہ اس پر نظریں لگی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال مشاعروں کے لیے کیسے سازگار ہو سکتی ہے۔ سو اب ہم ادب کے اس عمومی ذوق سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں جو ابھی عام لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اب ایک بات پھر سے مشاعروں سے حاصل ہوئی شہرت کے باب میں۔ میں تو بہت مشاعرانہ مشقتوں سے گزرا ہوں۔ داد وتحسین اور فوری اثر کے طور پر حاصل کی ہوئی داد دل خوش کن تو ہوتی ہی ہے مگر مسلسل تحسین وتعریف بڑھتے بڑھتے احساسِ افتخار میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس سے بچا جا سکے تو اچھا ہے۔ میرے بارے میں ڈاکٹر ابو الخیر کشفی نے لکھتے ہوئے یہ بات بھی کہی ہے کہ پیرزادہ قاسم کو شہرت وہ بھی مشاعروں کی شہرت خراب نہ کر سکی کیونکہ وہ شہرت کے خلاف اپنا دفاع کرتے

رہے ہیں۔ میں مشاعرے کی شرائط پر شعر نہیں پڑھتا بلکہ اپنی شرائط پر مشاعرہ پڑھتا ہوں۔ جی نہیں چاہتا تو نہیں جاتا۔ کچھ مزاج ہی ایسا بن گیا ہے:

جہاں جہاں مرے بے حد قریب تھی دنیا
وہاں وہاں مجھے کہنا پڑا ہے میں نہیں ہوں

ایک بات اور بھی کہی جارہی ہے کہ میں نے مشاعروں سے بہت شہرت پائی۔ سو وہ تو ہے۔ شہزاد احمد نے اپنے ایک مضمون میں یہ بات کہیں کی ہے پیرزادہ قاسم اور جون ایلیا کتابی شکل میں اپنے کلام کی اشاعت سے بہت پہلے معروف ومقبول ہو چکے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ اشاعتِ کلام کے بعد غیر مقبول ہو گئے ۔جائزہ کیجیے۔

☆ یونیورسٹی کی سطح پر اُستاد سے لے کر وائس چانسلر تک جو نظم وضبط اور امن وآشتی آپ کے دور میں رہی وہ کسی اور دور میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ جملہ تو تعریفی ہے مگر اُس الٰہ دین کے چراغ سے ہمیں بھی متعارف کرایئے جسے رگڑ کر آپ یہ معرکے سر کرتے رہے؟

☆☆ علمی زندگی کا بڑا حصہ اعلیٰ تعلیم سے منسلک رہ کر گزارا اور گزر رہا ہے۔ ایک استاد محقق اور منتظم کے طور پر اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داری کا چناؤ میں نے اپنی پسند کے مطابق بہ قیدِ ہوش وحواس کیا تھا سو اس سے میری وابستگی فطری ہوئی اور یہ یقیناً کامیابی کی راہ ہموار کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ تعلیم کے شعبہ میں بلخصوص بغیر فطری لگن کے شامل ہونے والے آسودگی محسوس نہیں کرتے اور دبے دبے رہتے ہیں۔ اب سینتالیس برسوں سے زیادہ ہو گیا کہ میں یونیورسٹی سے وابستہ ہوں۔ اعلیٰ ترین سطح یعنی وائس چانسلر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے بھی بارہ تیرہ سال گزر چکے ہیں اور اس سے پہلے پرووائس چانسلر، رجسٹرار، پرووسٹ اور مشیر امور طلباء کی ذمہ داریاں بھی نبھائی ہیں۔ ان تجربات نے بھی کامیابی کی راہ ہموار کی۔ بڑی سرکاری یونیورسٹی میں تیس پینتیس ہزار طلباء، دو ہزار اساتذہ اور تحقیق کاروں کا عملہ اور پھر معاون اسٹاف سب مل کر بڑا ادارہ بن جاتے ہیں۔ ہندوستان ہو یا پاکستان بڑی سرکاری یونیورسٹیوں کو کامیابی سے چلانا مشکل کام تو ہے۔ میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے سرخ رو رکھا۔ انتظامی حوالے سے ایک اہم نقطہ یہ ہے کہ مسئلہ چھوٹا ہو یا بڑا فوری نگہداری چاہتا ہے اور جلد مناسب کارروائی کا متقاضی ہوتا ہے۔

☆ شنید یہ بھی ہے کہ بہت سے ابن الوقت لوگ بلا امتیازِ صنف، آپ کی مرنجاں مرنج طبیعت کا فائدہ اٹھا کر طرح طرح کے بہانے پیش کر کے آپ سے سخی تعاون بھی لیا کرتے ہیں؟

☆☆ اس سے مراد متاشاعروں کی حوصلہ افزائی ہے تو یہ میں نے کبھی نہیں کی۔ البتہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ نئی نسل اور نئے حقیقی لکھنے والوں کی ہمت افزائی ضرور کرنا چاہیے۔ یہ سینئر ہمعصروں پر فرض ہے۔ اس ذیل میں نئے لکھنے والے اپنی کتابوں پر تبصرہ اور ہمت افزا نوٹ چاہتے ہیں تو کبھی کبھار کسی کے لیے کچھ لکھ بھی دیتا ہوں۔

☆ برصغیر کے سبھی بلند قامت اور نامور لوگوں نے آپ کی اور آپ کے فن کی نسبت بہت کچھ تحریر کیا ہے مگر ہر کوئی آپ کی مدح سرائی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس سے تاثر یہ اُبھرتا ہے کہ آپ اور آپ کا فن ہر طرح کی خامی سے مبّرا ہیں؟

☆☆ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ برصغیر کے تقریباً سبھی نامور ادبی شخصیات تک میرا کلام پہنچ سکا اور انہوں نے میرے کلام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اسی کو شاید آپ مدح سرائی کہہ رہے ہیں۔ اس سے قطعی نظر یہ تاثر نہیں ابھرتا کہ یہ کلام ہر قسم کی خامی سے مبّرا ہے۔ دراصل یہ مضامین ادبی تنقید کی ذیل میں نہیں آتے۔ خالص معیاری ادبی تنقید لکھنے والے خال خال ہی ہیں اور یہ شعبہ الگ ہے۔ عام طور پر جو کچھ لکھا جارہا ہے وہ تجزیے اور تبصرے کی حد تک ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کلام پر سرسری نظر ڈال کر چند نمایاں خوبیوں کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔ میرے معاملے میں اگر بقول آپ کے سبھی بلند قامت اور نامور لوگ میرے فن کی تعریف کرتے ہیں تو کچھ نہ کچھ خوبی تو ہوگی۔ بس یہ کچھ نہ کچھ بھی میری آسودگی کے لیے بہت کچھ ہے۔ اسی لیے میرا دل ہمیشہ عاجزی اور تشکر سے لبریز رہتا ہے۔ ایک عجیب روش یہ چل نکلی ہے کہ لوگ خود اپنا مقام اور مرتبہ تعین کرنے لگے ہیں اور اپنے میں کیسا قد وقامت نکالتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے۔ ان کے تجزیے اور تبصرے لوگوں کے متعلق سنئے تو آپ کو اندازہ ہو۔ ہاں ایک طریقہ فطری عیب بینوں کا بھی ہے۔ ان کے سپر د غالب، اقبال اور فیض کو کیجیے اور پھر دیکھئے۔ آپ کہیں تو گفتگو یہی تمام کروں بقول اقبال:

کہو تو سبحۂ ساحل رہیں کہو تو یہیں

☆ شاعری میں نت نئی ایجادات کے ساتھ غزل کے خود ساختہ ناقدین بھی بڑھتے جارہے ہیں۔ کوئی اس صنف کو وقت کے مزاج سے نا آشنا، کوئی وحشی کوئی نیم وحشی اور کوئی فارسی کی جگالی سے تشبیہہ دے کر دل کی بھڑاس نکالا کرتا ہے؟

☆☆ اردو شاعری کا سفر جس قدر بھی ہے اس میں سب سے نمایاں پیش رفت غزل ہی کی نظر آتی ہے۔ تمام مخالفتوں، رکاوٹوں، فتوی اور واویلا کے باوجود غزل تازہ سے تازہ تر ہوتی گئی اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ غزل میں جدید طرز فکر اور بدلتے وقت کے حوالے آتے گئے ہیں اور غزل اس سب کو سمیٹ لینے کی قوت اور سکت اپنے اندر رکھتی ہے۔ شاید اسی لیے غزل زندہ ہے۔ وحشی، نیم وحشی اور فارسی کی جگالی جذباتی سطح کے اعتراضات ہیں اور آج کے نہیں ہیں۔ کچھ تازہ باتیں میرے بھائی ستیہ پال آنند نے کی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اعتراض کرنا کوئی بری بات نہیں۔ معروضات پر غور ضرور کرنا چاہیے۔ اس میں وقت کے مزاج سے آشنائی بہت اہم ہے۔ اس پر الگ بات ہو سکتی ہے۔ اب رہی نظم تو اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ میں تو سارے ہی نظم کی شعراء کو پڑھ

چکا ہوں۔ اختر الایمان، میراجی، مجید امجد اور ستیہ پال آنند کی نظمیں ایک علیحدہ باب معرفت کا حصہ ہیں۔ اور مجھے بہت پسند ہیں۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مغرب میں اردو شاعری اچھا تعارف نظم ہی کے حوالے سے ممکن ہوسکا۔ عالمی سطح پر عالمی شاعری کے ذیل میں ابھی اردو نظم ہی شامل ہوسکی ہے۔

☆ موجودہ حالات نے دیگر فنون کے علاوہ ادب اور شاعری کو جس قدر ضعف پہنچایا ہے مستقبل میں اُس کے اثرات کس طرح ظاہر ہوتے دکھائی دیتے ہیں؟

☆☆ موجودہ حالات میں ہمارے یہاں معاشرتی سوچ دنیاوی منفعت خواہی کے گرد ہی گھومتی نظر آتی ہے۔ پیشہ ورانہ معاملات ہی مقصدِ زندگی بن کر رہ گئے ہیں۔ شخصی تربیت میں زبان، ادب اور جملہ فنونِ لطیفہ کی کلیدی حیثیت نہیں رہی ہے۔ یہ سب اس وقت تک پسِ پشت رہتے ہیں جب تک وہ پیسہ کمانے کا ذریعہ نہ ثابت ہوں۔ اس تربیت کے ساتھ تو اکہری شخصیتیں ہی پیدا ہوں گی۔ اوران میں بھی انسان اور انسانیت کی فضیلت کو اہم جاننے والے خال خال اور اس کے پاسدار نہ ہونے کے برابر۔ مگر میں مایوس نہیں ہوں۔ سماجی علوم پر نظر، زبان، ادب اور تہذیب سے آشنائی ہماری مشکل کو کچھ نہ کچھ آسان کرسکتی ہے۔ ہمیں تبدیلی لانے کے لیے بنیادی طور پر سوچ کو بدلنا ہوگا۔ اجتماعی حکمتِ عملی ترتیب دینا ہوگی:

نہ ہو انسان سے مایوس کہ خوابیدہ ضمیر
حشر کر دیتا ہے برپا جو کبھی جاگتا ہے

☆ بہت سے مستند عالمی اداروں کی رائے کے مطابق آنے والے دنوں میں دنیا کی کئی تہذیب، زبانیں اور ثقافت اپنے وجود سے محروم ہو جائیں گی۔ آپ کے خیال میں ہم اور ہماری شناخت کے حوالے ان حالات کا مقابلہ کس طرح کر پائیں گے؟

☆☆ تاریخ تو یہی بتاتی ہے کہ اگر زبان، ثقافت و تہذیب اپنے ہونے کا اظہار اور ہونے پر اصرار کرنا چھوڑ دے تو ایک دن معدوم ہی ہو جاتی ہے۔ اپنے ہونے کی محافظت کرنا اور مخالف یلغار سے بچنا لازمی ہے۔ ہم اس سوچ کے سلسلے میں عملی سطح پر کچھ بھی مستعدی نہیں دکھا سکے ہیں سو نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ ایسے وقت میں جب ہماری تہذیب غیر محسوس طور پر ایک عالمگیر ثقافت میں مدغم ہوتی جا رہی ہے ہمیں اس کی محافظت کے خصوصی اقدامات کرنے ہوں گے۔ اور ابلاغِ عامہ کے سب ذرائع بالخصوص میڈیا سے مدد لینی ہوگی۔

''روح کا وجود''

مجھے ایک مہربان نے ایک نوجوان شاعر پیرزادہ قاسم کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ دیا۔ پھر ان سے ملاقات بھی ہوئی۔ کلام پڑھا:

ولولہ ہائے شوق سب صرفِ مہاجرت ہوئے
اب سرِ منزل وفا ڈھونڈ رہے ہو گھر کہاں
یہ صبح و شام مرے اس قدر ہی میرے ہیں
کہ جی اٹھا ہوں سحر دم تو مرگیا سرِ شام
سچے شعر کا کھلیان اور بھرتا جاتا ہے
درد کی زمینوں میں غم کی فصل بونے سے

پھر ان کی نظمیں ''تشویش''، ''اُس کی خاطر'' اور ''تماشا گاہِ ہستی'' میں نے سوچا یہ تو جینے کے دن ہیں۔ ان پر ایسی کونسی افتاد پڑی کہ کم عمری میں دل ناسُور ہوگیا۔ پھر خیال آیا، شدّتِ احساس اور دردمندی کا تو عمر سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے سوچا اس کرب اور دردمندی میں ترکِ وطن کا تو ہاتھ نہیں۔ ترکِ وطن بھی، نئے ماحول اور نئی فضا میں بود و باش بھی۔ ایک زمین کا پودا دوسری زمین میں جلدی جڑ نہیں پکڑتا۔ وقت لگتا ہے۔ پھر نیا ملک ہے تو نئے مسائل بھی پیش آئیں گے۔ گفتنی بھی ناگفتنی بھی۔ مجھے یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ ان کی شاعری بے جسم نہیں اس لیے کہ روح کا وجود جسم کے بغیر نہیں ہوتا۔

ان کا پہلا مجموعہ پڑھنے کے بعد مجھے ان سے مستقبل میں بہت اچھی شاعری کی توقع ہے۔ ان کی توجہ ابھی تک غزل کی طرف زیادہ ہے مگر میں سمجھتا ہوں بڑی شاعری کے امکانات نظم میں زیادہ ہیں۔

اختر الایمان

''مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے''

(ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی کے غزلیہ کلام کا تبرک)

صاعقہ انعام (اسلام آباد)

○

میں کب سے اپنی تلاش میں ہوں ملا نہیں ہوں
سوال یہ ہے کہ میں کہیں ہوں بھی یا نہیں ہوں

یہ میرے ہونے سے اور نہ ہونے سے منکشف ہے
کہ رزم ہستی میں کیا ہوں میں اور کیا نہیں ہوں

میں شب نژادوں میں صبح فردا کی آرزو ہوں
میں اپنے مکاں میں روشنی ہوں صبا نہیں ہوں

گلاب کی طرح عشق میرا مہک رہا ہے
مگر ابھی اُسکی کشت دل میں کھلا نہیں ہوں

نہ دیکھو مجھ کو مسافرو سرسری نظر سے
سفر کی روداد ہوں میں اک نقش پا نہیں ہوں

نہ جانے کتنے خداؤں کے درمیاں ہوں لیکن
ابھی میں اپنے ہی حال میں ہوں خدا نہیں ہوں

ہواؤں کی دسترس میں کب ہوں جو بجھ رہوں گا
میں استعارہ ہوں روشنی کا دیا نہیں ہوں

میں اپنی ہی آرزو کی چشم ملال میں ہوں
کھلا ہے در خواب کا مگر دیکھتا نہیں ہوں

اُدھر تسلسل سے شب کی تکرار ہے اِدھر میں
بجھا نہیں ہوں بجھا نہیں ہوں بجھا نہیں ہوں

بہت ضروری ہے عہد نو کو جواب دینا
سو تیکھے لہجے میں بولتا ہوں خفا نہیں ہوں

..... ☆ .....

کوئی ہے جو شکستِ ضبطِ غم ہونے نہیں دیتا
میں رونا چاہتا ہوں اور وہ رونے نہیں دیتا

سرِ آغازِ ہر شب اک نیا غم گھیر لیتا ہے
جو خود بھی جاگتا ہے اور مجھے سونے نہیں دیتا

نئے غم بخشتا ہے دل کو بہلائے بھی جاتا ہے
غرض وہ اعتبارِ غم کبھی کھونے نہیں دیتا

بہت جی چاہتا ہے خود کو اب رولیں سرِ ہستی
کوئی ہے جو یہ رسمِ غم ادا ہونے نہیں دیتا

عجب اک شعلۂ غم فصلِ اُلفت پھُونک دیتا ہے
نئی اک فصل پھر بوئیں مگر بونے نہیں دیتا

○

کدورتوں کے درمیاں عداوتوں کے درمیاں
تمام دوست اجنبی ہیں دوستوں کے درمیاں

شعورِ عصر ڈھونڈتا رہا ہے مجھ کو اور میں
مگن ہوں عہدِ رفتگاں کی عظمتوں کے درمیاں

یہ سوچتے ہیں کب تلک ضمیر کو بچائیں گے
اگر یونہی جیا کیے ضرورتوں کے درمیاں

ابھی شکست کیا کہ رزم آخری اک اور ہے
پکارتی ہے زندگی ہزیمتوں کے درمیاں

ضمیرِ عصر میں کبھی، نوائے درد میں کبھی
سخن سرا تو میں بھی ہوں صداقتوں کے درمیاں

○

○

ہماری طرح کوئی دوسرا ہوا بھی نہیں
وہ درد دل میں رکھا ہے جو لادوا بھی نہیں

ہمارا درد عجب مرحلے میں ہے کہ جہاں
وہ بےسخن بھی نہیں اور لب کُشا بھی نہیں

اُسی کو دیکھتی رہتی ہے چشمِ شوق مدام
جو غم ابھی سرِ شاخِ اَلم کِھلا بھی نہیں

عجیب طرح سے روشن ہوئی ہے خلوتِ غم
کہ روشنی ہے بہت اور دیا جَلا بھی نہیں

یہ دشتِ شوق بہت عافیت گزیدہ ہے
کہ اب یہاں پہ تو امکانِ نقشِ پا بھی نہیں

گزر ہے کیسی فضاؤں سے آج طائرِ عشق
کہ زیرِ بازوئے پرواز اب خلا بھی نہیں

میں ایسے شخص کو زندوں میں کیا شمار کروں
جو سوچتا بھی نہیں خواب دیکھتا بھی نہیں

یہ عشق خاک ہی ہونے کا نام تھا سو ہمیں
صلا ملا بھی بہت اور صلا ملا بھی نہیں

یہ عصرِ نو کی چتاؤں میں آگ کیسی ہے
کہ روح راکھ ہوئی اور بدن جَلا بھی نہیں

تمام عمر عجب وضعداریوں میں کٹی
اُسے عزیز رکھا جو ہمارا تھا بھی نہیں

..... ☆ .....

☆

نغمۂ نَے سے خروشِ بیکراں پیوند ہو
شورشِ کربِ نہاں سے جب فغاں پیوند ہو

شعلۂ سرکش سمائے کیا لباسِ خاک میں
اب ہمارے پیرہن سے آسماں پیوند ہو

یہ زمیں تو اِس کراں سے اُس کراں تک ایک ہے
اب یہ جسمِ بےاماں چاہے جہاں پیوند ہو

رشتہ اک افلاک سے اور ایک رشتہ خاک سے
دل زمین و آسماں کے درمیاں پیوند ہو

زیست کا ہر واقعہ تاریخ بنتا جائے گا
شرط یہ ہے داستاں سے داستاں پیوند ہو

○

☆

کسی نے اک حرفِ زیست پیہم ہَوا پہ تحریر کر دیا ہے
سو میں نے بھی اپنا شجرۂ غم ہَوا پہ تحریر کر دیا ہے

بہ طرزِ تحریرِ نکہتِ گُل بہارِ موسم کے ہاتھ نے تو
وہی جو ہے زندگی کا ماتم ہَوا پہ تحریر کر دیا ہے

وصال لمحے نے بیکراں ہجر موسموں کی نوید پا کر
سلامِ آخر بہ چشمِ پُرنم ہَوا پہ تحریر کر دیا ہے

سیاستِ گلستاں عجب ہے کہ جاتے جاتے گُلوں کی رُت نے
بدستِ خود ہی خزاں کا موسم ہَوا پہ تحریر کر دیا ہے

غبارِ بارُود، رقصِ شُعلہ، دھمال میزائیلوں کا پیہم
یہ کیسا منشورِ امنِ عالم ہَوا پہ تحریر کر دیا ہے

○

○

زندگی کو ایک خواب رائیگاں سمجھا تھا میں
بیکراں تعبیر ہو گی یہ کہاں سمجھا تھا میں

راہ روگزرے چلے جاتے تھے راہ زیست پر
اک ہجوم جسم و جاں کو کارواں سمجھا تھا میں

اتنی نزدیکی کہ جیسے چھو رہا ہوں خود کو میں
حرزِ جاں ہے وہ جسے وہم وگماں سمجھا تھا میں

تھا بہت سفاک تنسیخ تعلق کا فریب
اس کا عالم ہے جسے اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے طلب آسودہ کب ہوتی ہے کشتِ آرزو
بے گماں دل ہو رہے گا گلستاں سمجھا تھا میں

اک توقع تھی کہ یہ لہجہ بھی سمجھے گا کوئی
چشم خوں افشاں کو انداز بیاں سمجھا تھا میں

ربطِ باہم تھا فقط لفظ و بیاں کا ارتباط
ہے کوئی رسمِ وفا بھی درمیاں سمجھا تھا میں

اسقدر مانوس تھا فطرت کے لہجے کا جمال
سو اُسے اپنا سخن اپنی زباں سمجھا تھا میں

یہ تو ہیں آئندہ گاں کی روشنی کے دائرے
ان کو اب تک اپنے قدموں کے نشاں سمجھا تھا میں

..... ☆ .....

☆

بے دلی سے ہنسنے کو خوش دلی نہ سمجھا جائے
غم سے جلتے چہروں کو روشنی نہ سمجھا جائے

لاکھ خوش گماں دنیا باہمی تعلق کو
دوستی کہے لیکن دوستی نہ سمجھا جائے

ہم تو بس یہ کہتے ہیں روز جینے مرنے کو
آپ چاہے کچھ سمجھیں زندگی نہ سمجھا جائے

گاہ گاہ وحشت میں گھر کی سمت جاتا ہوں
اِس کو دشت حیرت سے واپسی نہ سمجھا جائے

خاک کرنے والوں کی کیا عجیب خواہش ہے
خاک ہونے والوں کو خاک بھی نہ سمجھا جائے

○

ہے جبرِ وقت کا قصّہ عجب سنائے کون
میں یاد اُس کو کروں اور یاد آئے کون

یہ بات بجھتے دیوں نے کسی سے پوچھی تھی
جلے تو ہم تھے مگر خیر جگمگائے کون

اُسے تلاش تو کرنا ہے پھر یہ سوچتا ہوں
زمانہ اور ہے اب زحمتیں اُٹھائے کون

یہاں تو اپنے چراغوں کی فکر ہے سب کو
دِیا جلایا ہے سب نے دِیے جلائے کون

یہاں تو لوگ اِنھی حیرتوں میں جیتے ہیں
کہ تیر کس پہ چلے اور زخم کھائے کون

یہاں تو جاگتی آنکھوں میں خواب جاگتے ہیں
جو جاگتے ہوں اُنہیں خواب سے جگائے کون

یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں ملتی،
مگر یہ بے خبری کی خبر سُنائے کون

یہاں تو صبح سے پہلے ہی بزم برہم ہے
دِیا بجھا دے کوئی پر دِیا بجُھائے کون

○

چراغ ہوں کب سے جل رہا ہوں، مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے
جو بجھ گیا تو سحر نما ہوں، مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے

وہ بات جو آپ کہہ نہ پائے، مری غزل میں بیاں ہوئی ہے
میں آپ کا حرفِ مدّعا ہوں، مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے

یہ آپ کے چشم ولب کی آزادیاں سلامت کہ ان کی خاطر
میں کب سے سُولی پہ کھنچ رہا ہوں، مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے

مجھے بھلانا اب آپ کے اختیار میں بھی نہیں ہے یعنی
میں آپ کے درد کی صَدا ہوں، مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے

یہ دورِ آشوب دوستی ہے مگر مرا حوصلہ سلامت
میں سب کے بارے میں سوچتا ہوں، مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے

غبار ہوں آپ چاہے غازہ بنائیں یا زیرِ پا بچھالیں
میں کب سے رقصاں ہوں تھک چکا ہوں، مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے

بہت ہی شائستگی سے ہر لحہ ڈوبتی اِک صدا کی صورت
میں خلوتِ جاں میں بجھ رہا ہوں، مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے

بلا سے یہ راہِ شوق میری نہ ہو سکی پر تمہاری خاطر
مثالِ نقشِ قدم بچھا ہوں، مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے

..... ☆ .....

☆

کھلنے لگے ماہ و سال کون سا موسم ہے یہ
اسکی خواہش ہے یہی حرفِ وضاحت کے بغیر

جی نہیں رہتا بحال کون سا موسم ہے یہ
اب کوئی خواب بھی دیکھے نہ اجازت کے بغیر

ہجر کی بادِ سموم رکنے لگی تو چلی
ہم کو ڈھونڈو تو ہمیں کھونے کی خاطر ڈھونڈو

ہجر کی بادِ شمال کون سا موسم ہے یہ
خواب تعبیر نہیں ہوتے ہیں حسرت کے بغیر

دھیان میں رکھیے کہ ہیں اُس سے ہی سب انتساب
دل کو اک کارِ مسلسل نے رکھا ہے آباد

ذہن سے دیجئے نکال کون سا موسم ہے یہ
ایک لحہ بھی نہیں گزرا محبت کے بغیر

اُس کی رفاقت کے ساتھ بڑھتا ہی جاتا ہے کیوں
یوں بھی دشوار ہے آسودۂ صحرا ہونا

یہ مرے دل کا ملال کون سا موسم ہے یہ
اور جب خاک بھی ہو جانا ہو وحشت کے بغیر

آپ کے موسم ہیں اور میری رُتیں اور ہیں
وقت سفاک ہے اتنا کبھی سوچا بھی نہ تھا

کیجیے خود سے سوال کون سا موسم ہے یہ
ہم اسے یاد نہ کر پائیں گے زحمت کے بغیر

○
ہم ترے قریۂ جاں تاب میں اتنا ٹھہرے
یعنی اک لحہ گزار آئے ہیں عجلت کے بغیر

اب تو ہم خود سے بھی کم کم ہی ملا کرتے ہیں
کس خواہش سے الگ اور ضرورت کے بغیر

○

''ولولہ ہائے شوق''

علی سردار جعفری

(●)

اردو ایک نوعمر زبان ہے جس نے اپنی تشکیل و تکمیل کے مراحل گزشتہ تین چار سو سال میں طے کیے ہیں، لیکن فارسی شاعری کی خوبصورت اور طاقتور روایت کی وراثت کی وجہ سے اس کی جمالیاتی تاریخ کم از کم ایک ہزار برس پرانی ہے اور اس کی روح ہندوستانی تہذیب و تمدن کی چار پانچ ہزار برس کی قدیم روشنی سے جگمگا رہی ہے۔ یہ عجیب و غریب کرشمہ ہے کہ عربی اور فارسی شاعری کی بحریں اردو میں آ کر بڑی آسانی سے ہندوستان کی کلاسکی موسیقی (شاستریہ سنگیت) کے سانچوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ غزل کی گائیکی کی مقبولیت میں اردو زبان کی شیرینی اور ہندوستانی موسیقی کا رس شامل ہے۔ یہ جادو پاکستان میں کسی مہدی حسن کی آواز میں جاگتا ہے اور ہندوستان میں کسی جگجیت سنگھ کی آواز میں اور دونوں ملکوں کی سیاسی اور جغرافیائی سرحدوں کو انسانی دلوں کی دھڑکن اور خون کی گردش میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مشاعروں میں ترنم کے ساتھ اپنا کلام سنانے والے شاعروں کے گلے میں بھی اس موسیقی کی ہلکی پھلکی لہریں ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب میں نے پہلی بار پیرزادہ قاسم کا کلام کراچی میں ان کی زبان سے سنا تو یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگی کہ ان کے ہر حرف میں دہلی کا دل دھڑک رہا ہے۔ وہ دہلی جو کبھی میرؔ و غالبؔ کی دہلی تھی اور اب اپنی فصاحت کے لیے جامع مسجد کی سیڑھیوں اور قلعہ تک محدود نہیں ہے بلکہ کراچی اور لاہور سے ہوتی ہوئی خلیجی ممالک اور امریکہ اور کینیڈا تک پھیل گئی ہے اور ہر جگہ وہاں کی تہذیب و معاشرت کے زیر اثر نئے نئے رنگ و آہنگ اختیار کر رہی ہے۔ پیرزادہ قاسم کی زبان میں دہلی کی نفاست اور شرافت باقی ہے۔

مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ شاعر کی آواز کی نرمی، اظہار کی لطافت اور احساس کی شدت ہے لیکن پیمانہ چھلکنے نہیں پاتا۔ پیرزادہ کی خانقاہی تہذیب عصر حاضر کی شقاوت کو برداشت نہیں کر سکتی اور نہ اس شقاوت کے زیر اثر پرورش پانے والے اس فلسفہ شعر کو قبول کر سکتی ہے کہ آج کا شاعر نہ تو کسی نظریہ کو تسلیم کرتا ہے اور نہ کسی ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے۔ وہ ایک بے بس اور مجبور تنہا انسان ہے جو کسی جماعت کسی گروہ سے وابستہ نہیں۔ وہ کسی اخلاقی یا سماجی ذمہ داری کے بغیر بس رائے زنی کا حق رکھتا ہے اور وہ رائے زنی اپنی انفرادی زبان میں کرے گا جس کو سمجھنے اور معنی عطا کرنے کی کوشش قاری کا فرض ہے۔ معنی اور مفہوم کی یہ تلاش و جستجو ایک طرح کا جمالیاتی عمل سمجھا جاتا ہے جس میں قاری تخلیق کار یعنی شاعر کی شرکت ضروری نہیں سمجھتا۔۔۔ چوں مہ حجاب اندر۔

اس کے برعکس پیرزادہ قاسم کے پاس شاعری کا ایک معقول اور سنجیدہ نظریہ ہے جس کو انہوں نے اپنی پہلی کتاب میں تفصیل سے بیان کیا ہے:

(۱) انسان دوستی اور دردمندی کے بغیر حقیقی زندگی سے آشنائی ممکن ہی نہیں۔ ایسے میں اظہار کی سچائی عنقا ہو کر رہ جاتی ہے۔

(۲) ''اعلیٰ ترین شاعری کے نمونوں میں تخلیقی جوہر، اثر انگیزی اور نشاط فکری کی ایسی نمود ملتی ہے جس کا بدل اور کسی طرز بیان میں ممکن نہیں۔''

(بحوالہ میتھو آرنلڈ)

(۳) ''میرے خیال و فکر کی گزرگاہیں جب ایسے عظیم تخلیق کاروں کے بابرکت قدوم سے سرفراز ہوتی ہیں تو انہیں کی خاک پا کے طفیل میں اپنے آپ کو باتوقیر جانتا ہوں۔۔۔ میرے دکھ اور میری خوشیاں اساسی طور پر میرؔ و غالبؔ جیسی ہی ہیں لیکن میرا زمانہ اور میرے مسائل مختلف ہیں۔ آج جس بے یقینی اور عدم اعتماد کی فضا میں میرے ہم عصر اور میں سانس لے رہے ہیں اس کی گھٹن ہی کچھ اور ہے۔ معاشرے میں ہر شخص سفاکی کی حد تک خود نگر ہو کر رہ گیا ہے۔۔۔ آج اگر Satelite کے ذریعے اولمپک شمع روشن کی جا سکتی ہے تو اس سے انسانی آبادیوں کو نیست و نابود بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا دکھ یہ ہے کہ نہ تو ہمیں حواس ہی کھونے ہیں اور نہ ہی خودکشی کرنا ہے۔ ہمیں اپنے حالات میں زندہ رہنا ہے آواز بھی اٹھانی ہے اور احتجاج بھی کرنا ہے۔''

(۴) ''ان حالات میں آج کی شاعری زمان و مکان کی قیود سے کس طرح آزاد رہ سکتی ہے۔ ایک مدت تک میں بھی اس لازمانی اور لامکانی کو شاعری کا عظیم ترین عنصر جانتا رہا، لیکن آج میں سمجھنے کی طرح سمجھتا ہوں کہ عصر حاضر اور لمحہ موجود کے حوالے کے بغیر کوئی شعری رویہ مکمل سچائی کا علمبردار نہیں ہو سکتا۔''

اس بیان پر جس کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں پیرزادہ قاسم کی شاعری پوری اترتی ہے، عصر حاضر اس شاعری میں اس طرح منعکس ہے جیسے تیز گرمیوں کے جھلسا دینے والے موسم میں نصف النہار کے چمکتے ہوئے، آفتاب کا عکس کسی خوبصورت جھیل، صاف و شفاف پانی میں دکھائی دے رہا ہو۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''تندہوا کے جشن میں'' اس پر شاہد ہے چند اشعار:

ولولہ ہائے شوق سب صرف مہاجرت ہوئے
اب سر منزل وفا ڈھونڈھ رہے ہو گھر کہاں

مجھ کو نشاط سے فزوں رسم وفا عزیز ہے
میرا رفیق شب رہا ایک دیا بجھا ہوا

درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے مری بساط کیا ایک دیا بجھا ہوا

رنگ نہیں لہو سہی، رونق فصل جاں تو ہے
گل نہ سہی مگر بہار، زخم تو کچھ کھلا گئی

گر وہ عاشقانہ تھا شہر گریہ ان کی منزل تھی؟
یہ رستے بھر بھی روتے آئے اب منزل پہ روتے ہیں

اچانک سارے رشتے سارے چہرے اجنبی ٹھہرے
بھری محفل میں ہم ویرانی محفل پہ روتے ہیں

قیامتیں گزر گئیں کسی کے انتظار میں
ہنوز منتظر ہوں میں قیامتوں کے درمیاں

یہ اشعار ''برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی ست'' کا نمونہ ہیں لیکن کہیں کہیں حرف برہنہ کی تلوار بھی میان سے باہر نکل آتی ہے اور درد اور دکھ کے گھنے بادلوں میں ایک بجلی سی چمک جاتی ہے اور نئی راہیں روشن ہو جاتی ہیں:

اس نے دونوں کو نوازا ہے مگر فرق کے ساتھ
تاج و اورنگ تمہیں جرات اظہار ہمیں

اس شعر کی تشریح اقبال کے ایک شعر سے کی جا سکتی ہے جو ''جاوید نامہ'' میں نظم ہوا ہے اور برطانوی سامراج کے خلاف تحریک آزادی کے انتہائی عروج کے زمانے کی یادگار ہے:

مرد فقیر آتش است، میری و قیصری خس است
فال و فر ملوک را حرف برہنہ بس است

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر آربری نے یونسکو کے لیے جاوید نامہ کے انگریزی ترجمے میں حرف برہنہ کو ننگی تلوار کہا ہے۔ The poor Man is a Fire Ruler Ship And Power Are Straw A Naked sword is Ample Enough For The August Pomp of Kings یہ سہو ہے (ممکن ہے طباعت کا سہو ہو) لیکن ایسا سہو جو اقبال کے مفہوم کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ جب ''حدیث خلوتیاں'' کا بیان مقصود ہو تو رمز و ایما اظہار کی جان ہیں اور جب میری اور قیصری کا سامنا ہو تو مرد فقیر کا حرف برہنہ آتشیں تلوار بن جاتا ہے پیرزادہ قاسم نے اپنے گھرانے کی اہم ترین روایت یعنی تصوف سے جو انسان دوستی اور دردمندی کی روحانی دولت حاصل کی ہے وہ ''لمحہ موجود'' کو نظر انداز نہیں کرتی۔ اس کو اقبال نے ''قیامت موجود'' کہا ہے۔

حدیثِ ناقہ و میزاں دراز تر گفتی
بگیر تم کہ نہ بینی قیامت موجود

پیرزادہ قاسم ''قیامت موجود'' کے شاعر ہیں اس مقام پر ان کا حرف برہنہ اس طرح نغمہ سرا ہوتا ہے:

غبار بارود، رقص شعلہ، دھمال میزائیلوں کا پیہم
یہ کیسا منشور امن عالم، ہوا پہ تحریر کر دیا ہے

جس انقلاب کی سرخی مرے لہو نے لکھی
وہ انقلاب مری داستاں بنا ہی نہیں

ان اشعار میں بھی ان کا لہجہ شائستہ ہے لیکن یہ فریاد کا لہجہ نہیں ہے۔ اس میں ایک للکار بھی چھپی ہوئی ہے:

ابھی شکست کیا، کہ رزم آخری اک اور ہے
پکارتی ہے زندگی ہزیمتوں کے درمیاں

اپنی مٹی میں ذرا اور بھی رس بس جاؤں
ہاں ابھی اور مرا خون بہایا جائے

جبر کہتا ہے کہ اب اس کو خداوند کہو
ایک شمشیر جو رقصاں ہے رگ جاں کے قریب

لیکن شاعر اقبال کے لہجے میں اس جبر کا جواب یوں دیتا ہے:

بے باکی و حق گوئی کی تشبیہ بھلا کیا
کچھ سائبہ آوے بھی تو تلوار میں آوے

یہ بہت بڑی بات ہے کہ پیرزادہ قاسم نے اپنے پہلے ہی مجموعے میں اپنی انفرادی نوا تلاش کر لی تھی۔ ان کا اسلوب بیان اور انتخاب الفاظ ان کی شاعری کی پہچان ہے۔ ان کی غزل تھوڑی سی رندی تھوڑی سی عاشقی اور تھوڑے سے تصوف کی آمیزش نہیں ہے بلکہ خون جگر کی کشید ہے۔ اس میں علم و دانش کا آب حیات بھی شامل ہے۔ غزل کے وہ استعارے اور کنائے جو اس دور میں بہت ارزاں ہو گئے ہیں اور مشاعروں کی ارزانی میں اپنا حسن اور معنویت کھو رہے ہیں پیرزادہ قاسم کے شاعرانہ الفاظ میں شامل نہیں ہیں۔ ان کے یہاں ساغر و مینا، بادۂ و ساقی، رقیب و محتسب قسم کے الفاظ نہیں ملیں گے۔ ایک صاف ستھری زبان جس میں کلاسیکی وقار اور جدید فکر کا نکھار ہے ان کی شاعری کا لباس ہے۔ وہ رنگ سخن جو پہلے مجموعہ میں پختہ ہو گیا تھا دوسرے مجموعہ میں کچھ اور شوخ ہو گیا ہے، احساس کی دھار تیز ہو گئی ہے، سادگی و پرکاری میں اضافہ ہو گیا ہے اور طنز کے نشتروں میں کچھ اور دلآویزی پیدا ہو گئی ہے۔ غالب کی زمین میں ایک غزل کے دو شعر ہیں:

نرخ بالا ہے اگر حسرت نظارہ تو کیا
نقد خواہش ہے بہت تیرے خریدار کے پاس
غم تو یہ ہے کہ پس زخم مزا کچھ بھی نہیں
طرز نو کوئی تو ہو عہد دل آزار کے پاس

غالب ہی کی زمین میں ایک اور بہت اچھی غزل کے اشعار ہیں:

اے ہوائے غم تو نے سب دئے بجھا ڈالے
پھر بھی خلوت دل میں دور تک چراغاں ہے

دار و گیر وحشت میں اب پناہ کیا ڈھونڈیں
یہ زمین دامن ہے آسماں گریباں ہے

اس شاعری میں غم ونشاط کی ایک ایسی دل آویز آمیزش ہے جو بار بار غالب کی یاد دلاتی ہے:

اجاڑ شہر کی گلیوں میں کون گھومتا ہے
دل تباہ میں حسن نگار خانہ لیے

ابھی خیال سا آیا تھا کچھ تبسم کا
بڑھا وہ دست الم غم کا تازیانہ لیے

ہماری طرح کوئی دوسرا ہوا بھی نہیں
وہ درد دل میں رکھا ہے جو لادوا بھی نہیں

عجیب طرح سے روشن ہوئی ہے خلوت غم
کہ روشنی ہے بہت اور دیا جلا بھی نہیں

آئینہ امروز میں سب مسخ ہیں چہرے
اک خواہش دنیا ہے کہ لگتی ہے حسیں اور

امروز کا ایک قصر ہمیشہ رہا آباد
ماضی کے مکیں اور تو فردا کے مکیں اور

ان اشعار میں کوئی ظاہری آرائش نہیں ہے صرف حسن معنی کی مشاطگی ہے اور آسمان وزمین سے دست وگریباں ہونے کا حوصلہ:

میں ہوں جب تلک باقی یہ مکالمہ ہوگا
اے حقیقت ہستی میرا نام انساں ہے

اس عہد تجارت میں جب مصر عالم میں زلیخاؤں کا بازار لگا ہوا ہے اور شہرت کی ہوس کو پورا کرنے اور بڑھانے کے لیے ریڈیو، ٹیلی ویژن، آڈیو کیسٹ اور ویڈیو کیسٹ موجود ہیں اور لوگ دیوانہ وار ان کی طرف دوڑ رہے ہیں تو ایک خود شناس شاعر جس کو اپنی عزت نفس کا بھی احساس ہے یہی کہہ سکتا ہے:

اب حرف تمنا کو سماعت نہ ملے گی
بیچو گے اگر خواب تو قیمت نہ ملے گی

تشہیر کے بازار میں اے تازہ خریدار
زیبائشیں مل جائیں گی قامت نہ ملے گی

لمحوں کے تعاقب میں گزر جائیں گی صدیاں
یوں وقت تو مل جائے گا مہلت نہ ملے گی

میں نے بہت سے مشاعروں میں پیرزادہ قاسم کی مقبولیت آنکھوں سے دیکھی ہے جس میں سامعین کی طرف سے احترام کا جذبہ بھی شامل ہوتا ہے۔ان کے چاہنے والے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں ایک میں بھی ہوں۔

''غزل میں مشاعرہ''

پیرزادہ قاسم کی شاعری (غزل) میں مشاعرہ اور ترنم سے الگ بھی ایک خاص مزہ ہے۔ایک لطف ہے۔ان کی کتاب ملی تھی تو حسب شد آمد قدیم ان کے متعدد شعر پہلی ہی ریڈنگ میں اپنی بیاض کے لیے چن لئے تھے۔

ڈاکٹر عابد رضا بیدار

''روح گرنوحہ کناں''

عزیز حامد مدنی

(●)

جدید تر گفتگو ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعرا تک آئی تھی اور اس کا سیاق و سباق بھی عصر نو اور بیسویں صدی کا تھا۔ ہمارا عہد اپنی تیز روی کی رو میں ہمیں کہیں ٹھہرنے نہیں دیتا مشرق میں اس کے خرام کی رفتار کم سہی مگر ایسے تغیرات میں زندگی کے منتشر اجزا جدید فکر پر اثر انداز ہوتے ہوئے خیال کا ایک دائرہ سا بناتے رہتے ہیں اور اسی میں ایک (Avant-Garde) کی سی کیفیت موجزن رہتی ہے۔ اسی میں روایت کی ایک زنجیر بھی جڑ جاتی ہے اور پھر خود ہی الگ ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال خوش آہنگ غزل میں بھی مل سکتی ہے اور نثری نظم کے ٹکڑوں میں بھی۔ میں نے یہ خصوصیت ۱۹۷۰ء کی دہائی کے پاکستان، ہندوستان اور بیرون جات کے ذہین و معیاری شعرا میں یکساں پائی ہے۔ آج کی دنیا اپنی جغرافیائی حدود میں اپنے مسائل الگ الگ رکھتی ہے مگر مواصلات اور نشر و اشاعت کی سہولت کی وجہ سے ایک عالمی تصور بھی ساری وحدت کا موجود ہے یہ سارے رجحانات شعر و ادب میں ایک نہ ایک رنگ میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں اور ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعرا میں بھی انہیں میلانات کی پرچھائیاں ہیں۔ مغرب کی فکر اور مغربی شعرا اور ان کے اثرات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لیے ان کا تذکرہ یہاں ضروری نہیں ہے۔ یہ اثرات موجود ہیں اور ان سے ہمارے ادب نے ایک نیا رخ پایا ہے جو ہماری روایت سے مل کر حسین تر ہو گیا ہے اور انہیں اثرات کی وجہ سے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعراء کی تخلیق ایک ذاتی نوٹ یا سلسلے پر ختم ہوتی ہے جو کسی ان دیکھے ملال کا سراغ بھی ہے اور ایک نئی امنگ کی شعلہ بیانی بھی۔

انہیں ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعراء میں ''تند ہوا کے جشن میں'' کے شاعر پیرزادہ قاسم ہیں جن کے ہم پیشہ پروفیسر صاحبان میں کئی ادیبوں اور شعرا سے میں ذاتی انس رکھتا ہوں ان میں عزیزی ڈاکٹر ظفر سعید سیفی بھی ہیں اور پروفیسر سحر انصاری بھی (سیفی جو شعر و ادب کا اچھا شعور رکھتے ہیں انہیں دوسرے شعبوں کی قدروں کو زیادہ کارگر پا کر شعر گوئی سے فاصلے رکھنے کی رائے میں نے دی تھی) ان دونوں صاحبان کے توسط سے مجھے پیرزادہ قاسم سے بھی شناسائی کا موقع ملا۔ سیفی نے مجھے ان کی ایک ابتدائی غزل کی ٹیپ ریکارڈنگ سنائی۔ اسے کئی سال گزر چکے ہیں۔ غزل تھی:

روح گر نوحہ کناں ہو تو غزل ہوتی ہے
دل کو احساس زیاں ہو تو غزل ہوتی ہے
دھیمے دھیمے سے سلگتے ہوئے جذبات کے ساتھ
میر کا طرز بیاں ہو تو غزل ہوتی ہے

الفاظ کی اس رو (روح نوحہ کناں، احساس زیاں، دھیمے دھیمے سلگتے ہوئے جذبات) میں ابتدائی سراغ اسی ذاتی اور نجی مرحلے کا تھا جو زندگی کا ''ملال حاصل'' ہے۔ میں ان کا مرتب کردہ مجموعہ ''تند ہوا کے جشن'' دیکھتا ہوں تو ان کی تعلیمی اور درسی پیشہ ورانہ صلاحیت سے الگ اسی ملال کے تجربے کی ایک پرائیویٹ ڈائری ملتی ہے۔ ان کے کلام میں وہ ایک ''حلقہ ملال'' جو آہنگ کی تلاش میں تھا اپنے درسی ماہرانہ شعبے کی اصطلاحات سے دور خود کی اور اپنے مثال کے لوگوں کی تلاش میں ایک خلوتی کی طرح نمایاں ہوا ہے۔ انہیں اکثر سامعین نے بڑی بڑی جلسہ گاہوں میں Public Performance کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے بھی ایک آدھ بار مشاعرے میں سنا ہے وہاں بھی مجھے ان کی محویت ایک خلوتی کی حیثیت سے ملتی ہے۔ چونکہ ان کا پیشہ ایک معلم کا ہے جس کے سامنے ہمیشہ ایک سامع رہتا ہے تو کوئی وجہ Stage Shy یا Microphone Shy ہونے کی نہیں ہے مگر ان کا کلام داد و تحسین کے درمیان کبھی اپنے خاص سامع کا انتخاب کرتا رہتا ہے۔ کبھی خود سے بات کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی ذات کی تنہائی میں کھو جاتا ہے کبھی اپنی شکست کے لے بن جاتا ہے۔ اس میں کئی رنگ زاویے کئی گردشیں ایک ہی غزل کی چکری میں لپٹے ہوئے ہیں۔ وہ ساری متصادم کیفیتیں، وہ سارے معاشرتی منتشر اجزا جو زندگی کا خاصہ ہو گئے ہیں۔ ان کے کلام میں جھلک اٹھتے ہیں:

ہماری ذات میں محشر بپا ہے مدت سے
مگر یہ ہم کہ کوئی فیصلہ نہیں کرتے
یاس کا اندھیرا بھی آس کا اجالا بھی
لوگ اسی کو کہتے ہیں جھٹپٹے کی ساعت کیا
یہ ناگہاں جو ہوئی سہم کر فضا خاموش
کچھ ایسا لگتا ہے، طوفان آنے والا ہے
اندازہ ہوا کے پیچ و خم کا
ہوتا ہے شکستہ بال و پر سے

ان متضاد کیفیات کے ساتھ میں نے یہ کہا ہے کہ ان کے کلام میں ذاتی اور نجی تجربات کی ایک ڈائری ملتی ہے جو پھر ''ملال حاصل'' پر ختم ہوتی ہے اس کی مثالیں نثری نظم کے ٹکڑوں میں بھی ہیں:

یہ یاد رکھنے کا ہنر آساں نہیں ہوتا
کسی کو یاد رکھنے میں
بہت کچھ بھول جانا بھی پڑتا ہے (یاد رکھنے کا ہنر)

یا

تمہاری بند مٹھی میں

یہ کیسی خاک ہے جس میں
میری خوشبو ہے
میرا رنگ ہے
اور لحہ لحہ سرد ہوتی زندگی کی
کچھ حرارت ہے
وہی اک دھیمی دھیمی بے سخن سی گفتگو ہے
جلتی بجھتی روشنی ہے
کچھ ادھورے خواب ہیں
خوابوں کی تعبیر ہیں (ایک مفرد مکالمہ)

ان کا کلام جب عمر کی منزلیں طے کر رہا تھا تو اس میں انہی کیفیات کا اظہار بغیر اپنا آہنگ کھوئے ہوئے دلپذیر تر ہوگیا۔ اس میں جدید فکر کے گوشے بھی نکلتے گئے اور روایت کا پاس بھی بڑھتا گیا جس کے بغیر کسی بھی کلام کا توازن قائم نہیں رہ سکتا۔

وہ اپنے ہم نواؤں میں اس دور کے اچھے نمائندہ ہیں۔ ان کے مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی جو کئی پیرائے میں ہیں۔ ان کی غزل میں درد کی ایک لہر شائستگی کے ساتھ نمایاں ہے۔ اس میں لب و لہجہ کی تازگی بھی ہے روایت کی پیوستگی بھی ہے اور سیاق وسباق کے بے دیاری نہیں ہے:

ضبط کی سوکھی زمیں کو کھیتوں کی ہے طلب
آہیں بونا چاہئیں، گریہ لگانا چاہیے
درد کی لے وقت سے آمیز ہو جائے تو پھر
خوب رونا چاہیے اور خوب گانا چاہیے
بس یونہی کچھ گماں سا تھا کوئی پس سخن بھی ہے
درد جو لب کشا ہوا مجھ کو یقین آ گیا
درد ہے کہ نغمہ ہے فیصلہ کیا جائے
یعنی دل کی دھڑکن پہ غور کر لیا جائے
اسی شہر طرب کے درمیاں تعمیر کرنا ہے
مجھے اک گوشہ آہ و فغاں تعمیر کرنا ہے

انہوں نے غزل کی ایک لے پالی ہے۔ پس سخن بھی کسی کے ہونے کا گمان ہے۔ ان کی غزلوں کی طرح ان کی نظموں میں مشاہدات، ذاتی تجربوں اور ایک سوچ کے جو مختلف سمتوں میں بٹی ہوئی ہے، کئی خوبصورت ٹکڑے ہیں۔ وہ تیز رفتاری جو معاشرے میں نئے تقاضوں کی وجہ سے کئی تغیرات کا باعث ہے اور تفصیلات میں ایک پھیلاؤ چاہتی ہے ان کے یہاں جانی پہچانی لغت شعری میں ہے اور کبھی کبھی ایسے سماجی تقاضے ایک دباؤ کی طرح زندگی کی مجبوریوں کی اس اساس کو نمایاں کرتے ہیں جو آج موجود ہے:

میں کتنی بار دنیا تج کے جا بیٹھا ہوں گوشے میں
مگر ہر بار دنیا کی ضرورت جاگ اٹھتی ہے
یہ سوچتے ہیں کب تلک ضمیر کو بچائیں گے
اگر یونہی جیا کیے ضرورتوں کے درمیان
ملے تھے ہم کہیں کار جہاں کے میلے میں
اسے بھی جلدی تھی اور میں بھی گھر گیا سر شام
اور اب تو کاروبار عشق بھی نہیں ہے بے سبب
جواب منفعت میں ہو تو پھر قدم اٹھایئے
کوئی بھی صورت حالات دیرپا نہ ہوئی
جو غم عزیز ہوا جاوداں بنا ہی نہیں

جمالیات نو کے مختلف شعبوں نے انسانی جذبات کی تسکین کے لیے کچھ اور چیزیں ترتیب دے رکھی ہیں۔ سارا نظام زندگی معاشرے میں ضروریات بہتر ذرائع آمدنی اور ایک محفوظ تر مقام کی طرف رجوع ہوگیا ہے۔ اس دوڑ میں سب شامل ہیں۔ الفاظ کا کارآمد صرف زندگی کے دوسرے شعبوں میں ہے۔ یہ سب باتیں ہمارے سامنے ہیں۔ زندگی کے یہ مختلف زاویے جو خیال کا ایک دائرہ پیدا کرتے ہوئے کھو جاتے ہیں اور بار بار اپنی گردش کا یا ایک طلسم پیدا کرتے ہیں۔ شاعر کو Avant Garde کی کیفیت میں مبتلا رکھتے ہیں۔ اس کا معاشرے سے تعلق ٹوٹا نہیں ہے۔ وہ بھی اپنی شکستگی دل لیے ہوئے ہجوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کی بھی آمدنی، پناہ اور سفید پوشی کا ذریعہ معاشرہ ہے۔ وہ بھی اپنی تخلیق میں کسی قدر چونکا دینے والی رو لے کر جو مقابلے کی سکت رکھ سکے، نئے تقاضوں کے اندر سما سکے، معاشرے میں شامل ہے جہاں خاندان کی استواری کی، دوستی کی، مرد و زن کے آپس میں اعتبارات کی قدریں اگر بالکل بدل نہیں گئی ہیں تو کچھ اور ہوگئی ہیں، ٹوٹ ٹوٹ کر ان قدروں میں نئے زاویے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سب باتیں بھی شاعر کے تجربات کا حصہ ہیں۔ اس شکست وریخت کے درمیان ایک نئے مزاج کی زندگی آ گئی ہے۔ اس بات کا احساس بھی پیرزادہ کی شاعری کا حصہ ہے:

کدروتوں کے درمیاں عداوتوں کے درمیاں
تمام دوست اجنبی ہیں دوستوں کے درمیاں
زمانہ میری داستاں پہ رو رہا ہے آج کیوں
یہی تو کل سنی گئی تھی قہقہوں کے درمیاں
ابھی شکست کیا کہ رزم آخری اک اور ہے
پکارتی ہے زندگی ہزیمتوں کے درمیاں

اور انہی ہزیمتوں سے ایک اور قرب اور دوری کے درمیاں دیکھئے:

گئے برسوں کی کتنی ساعتوں کو موسموں کو میں
اگر آواز دیتا ہوں

تو بس ایک ناشنیدہ سی صدا لبیک کہتی ہے
کوئی نادیدہ سی اک روشنی ہے جو نگاہوں میں
فروغِ شعلۂ خس کی طرح اٹھتی ہے
پھر معدوم ہوتی ہے
مہکتے موسموں کو یاد کرتا ہوں
تو اک نایافتہ خوشبو سی لہراتی تو ہے لیکن
مشامِ جاں کو آسودہ نہیں کرتی
بہت کوشش کروں تو ایک پرچھائیں سی آنکھوں میں
اتر آتی تو ہے لیکن
مجسم ہو نہیں پاتی

میں اپنی بے بسی اور بے کسی پر
صرف ماتم ہو چکا کب کا
مگر اک آس باقی ہے
کہ شاید پھر اچانک حادثہ ہو رونما کوئی
وہی اک حادثہ
جو شرطِ آغازِ محبت ہے
وہی اک حادثہ
جس میں تقاضا ہے بچھڑنے کا

پیرزادہ قاسم اور ان کے توسط سے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعرا میں جو خصوصیات میری سمجھ میں آتی ہیں میں نے ان کا تذکرہ کر دیا ہے۔

ابتدا میں ایک بات آئی تھی کہ عصر حاضر میں بھی شاعری کے بنیادی عناصر، تغزل اور علامت ہیں۔ تغزل (Lyricism) کو سمجھانے کی میں نے کوشش کی تھی۔ تغزل شاعر کی وہ کیفیت ہے جو اس کے جذبات میں آہنگ پیدا کرتی ہے۔ یہ کیفیت نظموں اور غزلوں میں یکساں آ سکتی ہے اور آتی رہتی ہے۔ اس میں ایک خود کلامی کی رو بھی ہوتی ہے اور ایک شعوری رو بھی جو متضاد عناصر کو ایک اکائی میں دیکھ سکے۔ یہ ۱۹۳۰ء کی دہائی سے ہر پیرائیہ سخن میں آتی رہی ہے۔ نظموں اور غزلوں میں یہ یکساں ہے مگر ہماری شعری روایت پر غزل کا قبضہ ہے۔ غزل کی روایت، سماعی، فیضِ سخن اور حافظے کی نفسیات سہل اور سیدھی ہے۔ زبان پر لغت شعری کا ایک مانوس حصہ ہے جو نوے فیصد شعرا کے کلام میں جاری اور ساری ہے۔ دس فیصد میں تغزل کا وہ عنصر آتا ہے جس میں فکر بھی ہے آہنگ بھی اور ان کا معیار بھی الگ ہے جس کی پرکھ کی دلیل ذوق سلیم ہے۔ اس نوع کے کئی شعرا ۱۹۷۰ء کی دہائی میں بھی ہیں اور انہی میں پیرزادہ قاسم بھی ہیں۔ ان کے یہاں تغزل کا عنصر ہے۔ غزل میں بھی اور نظم میں بھی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا میلانِ طبع غزل میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ ان کی غزل میں متضاد عناصر بھی اکائی بناتے ہوئے ملتے ہیں۔ مسلک اور مقام سے دور ان کی غزل میں بے ساختگی ہے جس کی ایک لے قائم کر کے انہوں نے ردیف میں چھپے ہوئے فکری رخ کو نمایاں کیا ہے:

خون سے جب جلا دیا ایک دیا بجھا ہوا
پھر مجھے دے دیا گیا ایک دیا بجھا ہوا
ایک ہی داستانِ شب ایک ہی سلسلہ تو ہے
ایک دیا جلا ہوا ایک دیا بجھا ہوا
مجھ کو نشاط سے فزوں رسمِ وفا عزیز ہے
میرا رفیقِ شب رہا ایک دیا بجھا ہوا
درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے میری بساط کیا ایک دیا بجھا ہوا
سب مری روشنی جاں حرفِ سخن میں ڈھل گئی
اور میں جیسے رہ گیا ایک دیا بجھا ہوا

یہ ان کی پسندیدہ غزل بھی ہے اور ہم سب کی بھی۔ ردیف میں چھپے ہوئے فکر کے رخ کا ادراک اس دور کے بڑے شعرا مثلاً فراق میں تو تھا ہی، جدید تر دور میں مجروح، ناصر کاظمی اور سلیم احمد میں بھی اس کی احتیاط آپ کو مل جائے گی۔ پیرزادہ قاسم اور ان کے ہم نواؤں میں اس کا پاس ہے۔ ان کی غزلوں کی بعض ردیفوں میں یہ رخ نکھر گیا ہے ردیف تو فعل ہی ہوتی ہے اور ماضی، حال، مستقبل اور ان کی ساری اقسام کا رخ کر سکتی ہے اس میں فکر کی جہتیں ہوتی ہے۔ بے ساختگی میں کہے ہوئے اشعار میں ردیف کھل اٹھتی ہے۔ ان کی ایک غزل کی ردیف ہے ’’گیا سرشام‘‘ اب اسی میں قافیے کی پیوستگی اور جذبات کا رخ دیکھئے:

یہ حادثہ مجھے حیران کر گیا سرشام
جو زخمِ صبح ملا تھا وہ بھر گیا سرشام
شبِ فراق کا احوال یاد آ ہی گیا
پھر ایک تیر سا دل میں اتر گیا سرشام

اسی طرح ایک ردیف ہے ’’جاگ اٹھتی ہے‘‘ یہاں بھی ردیف نے فکر کے مختلف زاویے دیے ہیں۔

بہت مسرور رہتا ہوں بہت چہرہ سجاتا ہوں
مگر آئینے میں اک اور صورت جاگ اٹھتی ہے
عجب دیکھا کرشمہ لفظ کی بازی گری کا بھی
سخن معدوم ہو جاتا ہے شہرت جاگ اٹھتی ہے

دو ردیفیں اور ہیں۔ ایک دو لفظی ہے ’’اچھا لگا‘‘ اور ایک چھ لفظی ہے ’’ہوا پہ تحریر کر دیا ہے‘‘۔ ان ردیفوں میں خیال کے نئے رخ کھلے ہیں:

تیرہ شبی کو باب سحر تک پہنچا کر
اب گھر چلیے، دل کا کہنا اچھا لگا
غم کے موسم نے یہ عجب احساس دیا
در دنیا اور زخم پرانا اچھا لگا

اور آج کی خوف وہراس کی دنیا کی طرف مڑتے ہوئے ردیف کیسی چسپاں ہوئی ہے۔

غبار بارود، رقص شعلہ، دھمال میزائیلوں کا پیہم
یہ کیسا منشور امن عالم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے

پیرزادہ قاسم کی غزلوں اور نظموں میں ایک اندر سے پیدا کردہ مدھم، لطف انگیز اور رواں آہنگ ملتا ہے۔ ان کے چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجیے جن کے فکری رخ میں ایک تنقید بھی ہے:

دن بھر میں اور کار زمانہ لیکن شام ڈھلے
ساتھ مرے گھر آجاتا ہے اک انجانا غم
اتنی سفاک ساعت بھی غضب ہے کہ جہاں
بات پوری بھی نہ ہو ہاتھوں میں پتھر آجائیں
پھر وہ ہوا کا قہقہہ کان میں گونجنے لگا
اور بھی اک دیا بجھا مجھ کو یقین آ گیا
ہم نے خستگی پائی، دل گرفتگی پائی
خیر ہم سے کیا پایا دل دکھانے والوں نے
عجب ہنر ہے کہ دانشوری کے پیکر میں
کسی کا ذہن، کسی کی زبان لیے پھیریے
میرا کشکول انا خیر سے خالی نہ ہوا
میں تہی دست رہا پھر بھی سوالی نہ ہوا
ایک سے سلسلے ہیں سب ہجر کی رت بیت گئی
پھر وہی صبح آئے گی پھر وہی شام آئے گی
میرے لہو میں جل اٹھے اتنے ہی تازہ دم چراغ
وقت کی سازشی ہوا جتنے دیے بجھا گئی
تازہ بریدہ شاخ گل تجھ کو تو ہوش ہی نہیں
دیکھ ترے قریب سے رقص کناں صبا گئی

اسی طرح شدت احساس سے پر کئی بند ان کی نظموں میں بھی ملتے ہیں جو ان کے تجربے ومشاہدے ہیں اور زندگی کی تمثیل میں کردار کی طرح ہیں:

تماشا گاہ ہستی میں عجب اک کھیل جاری ہے
ستارے چاند سورج آسماں اور بحر و بر سارے
ہوائیں اور خوشبو، نغمہ و آہنگ گر سارے
اسی اک کھیل میں تا حد امکاں صرف ہوتے ہیں
تماشا گاہ ہستی میں بلا کی گہما گہمی ہے
تو پھر اس میں تعجب کیا
اگر میں بھی اسی تمثیل ہستی میں
کہیں پر خرچ ہو جاؤں (تماشا گاہ ہستی میں)

ان کی نظمیں ''ملاقات''، ''بے سخنی'' اور ''عشق کہانی'' ذاتی تجربہ ہیں جس میں یاسیت کی ایک آہستہ روی سی شامل ہو جاتی ہے جو یوں بھی ان کے کلام میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ ان کی نظموں کے کچھ بند اس سلسلے میں سامنے آتے ہیں:

خواب خواب آنکھوں میں
روشنی سی لہرائی
درد کی ساعت میں
نغمگی سی در آئی
بے دلی کی ساعت نے
دل کی کچھ خبر پائی
وہ تھی، چاند تھا، میں تھا
یوں تو کتنے چہرے تھے
اپنی ذات کے اندر
ہم سبھی اکیلے تھے
سرد سرد اک چہرہ
زرد زرد اک چہرہ
گرد گرد اک چہرہ
درد یافتہ چہرے، ہجر یافتہ چہرے
جیسے روبرو اپنے آئینے سے رکھے تھے (ملاقات)

میرا لہجہ بے سخنی ہے
تم چاہو تو یہ لہجہ یہ بے سخنی
تم بھی اپنا لو
اور پھر اپنی خلوت جاں سے مجھے پکارو
میں تم سے یوں آن ملوں گا،
جیسے ہوا کی سرگوشی پر
زرد ہوئے بے قیمت پتے
کچھ نہیں کہتے
ٹوٹ کے اس سے آملتے ہیں (بے سخنی)

میں بے قیمت تم بے قیمت

پھر

یہ اپنی عشق کہانی کون سنے گا (عشق کہانی)

پیرزادہ قاسم ۱۹۷۰ء کی دہائی کے جدید تر شعرا کی صف میں ہیں۔ اس عہد کے نئے تقاضے اور وہ سارے تغیرات جو نئے علوم کے توسط سے ہر معاشرے میں ہو رہے ہیں۔ مشکل تر اجزا کی سمیٹ چاہتے ہیں، ایک ایسے معاشرے میں جو ترقی پذیری کی طرف مائل ہوتے ہوئے بھی نئے تعصّبات میں گھر جاتا ہے، شاعری میں توازن برقرار رکھنا آسان نہیں ہے۔ شاعری کا نیا دور فیض، مجاز اور راشد سے شروع ہوا تھا تو اس میں ان تقاضوں کی معیاری آگہی تھی جو ۱۹۵۰ء کی دہائی کے شعراء سے ہوتی ہوئی ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعر تک پہنچی ہے آنے والے دور میں شعراء پر سماجی شعور کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ مسائل بھی پیچیدہ ہیں اور ذہنی سکت کا مطالبہ بھی سخت تر ہے۔ ان سب باتوں کا احساس پیرزادہ کے کلام میں ملتا ہے:

کیا کوئی فردا کا غم اس کو نظر آ گیا
چہرہ امروز سے آج بحالی گئی
شعلہ بجاں عشق کا کیا یہی انجام ہے
آگ بجھا دی گئی، راکھ بچالی گئی

''راکھ بچالی گئی'' کا گہرا طنز ماحول پر تنقید ہے جس کی اور مثالیں بھی ہیں:

شعلہ اظہار شوق کیسے نمود پا سکے
اس پہ تو ہر دور میں خاک ہی ڈالی گئی
دست نادیدہ کی تحقیق ضروری مگر
پہلے جو آگ لگی ہے وہ بجھا دی جائے

ہمارے معاشرے کے پست و بلند حادثات و واقعات کا ایک ایسا تسلسل ہے کہ کچھ علامتیں بار بار سامنے آتی ہیں ہر زندہ تہذیب اپنی اقدار کے اندر نئی چیزوں کو سمیٹنے کی ایک مقناطیسی قوت رکھتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو پیچھے رہ جاتی ہے۔ اس کا پیمانہ صنعت و حرفت۔ نئے علوم کی پاسداری۔ نئی فکر کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور نئی فکر کو قبول کرنے کا معتبر ترین اظہار شعر و ادب ہے جس کا زاویہ کل کے مقابلے میں آج دوسرا ہے۔ پیرزادہ کے کلام میں یہ زاویے چند علامتوں میں آتے رہتے ہیں۔ اسی نوع کی ایک علامت سے ان کے مجموعے کا نام ''تند ہوا کے جشن میں'' منتخب کیا گیا ہے۔

تند ہوا کے جشن میں لوگ گئے تو تھے مگر
تن سے کوئی قبا چھنی سر سے کوئی ردا گئی
دل زدگاں کے قافلے دُور نکل چکے تمام
ان کی تلاش میں نگاہ اب جو گئی تو کیا گئی

انہی چند علامتوں کو انہوں نے اپنی دو غزلوں میں جو کلام کے ابتدائی حصے میں آتی ہے، دہرا کر اپنی فکر کا پس منظر اور حاصل دونوں سامنے کر دیا ہے۔ جو روایت اور تسلسل فکر بھی ظاہر کرتا ہے۔ روایت اور تسلسل فکر میں جب تک کوئی دوسرا زاویہ نہ آ جائے فکر رک جاتی ہے۔ شاعر تو اپنی ذات میں ایک متحرک ذہن رکھتا ہے جس کا ثبوت آج بھی ۱۹۳۰ء کی دہائی کے موجودہ شعراء علی سردار جعفری، جذبی، احمد ندیم قاسمی اور اختر الایمان کے کلام میں جاری ہے اور اس کی دوسری کڑی ۱۹۵۰ء کی دہائی کے شعراء مجروح، سلطان پوری، جمیل الدین عالی، ضیا جالندھری، منیر نیازی، حبیب جالب اور ان کے ہم عصروں میں ہے۔ اسی سلسلۂ گویائی کی کئی نئی آوازیں ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شعراء میں بھی ہیں۔ پیرزادہ قاسم کی آواز، ان آوازوں میں ایک آہنگ رکھتی ہے جو لطیف سے لطیف تر ہوتا چلا گیا ہے۔۔۔

☆

''حقیقت نگار شاعر''

پیرزادہ قاسم اپنی تمام تر کیفیات کے اظہار کے لیے وہ پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں جس میں ابلاغ کی ہر شرط پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ براہِ راست اظہار میں اس بالواسطہ طرز کو بھی برقرار رکھتے ہیں جس میں حقیقت نگاری اور شاعری یکجا ہو جاتے ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری

○○
○

''دانشوری کے پیکر''

ابوالخیر کشفی

(●)

میں نے پیرزادہ کی شخصیت اور آواز کو مرحلہ ہائے شوق طے کرتے دیکھا ہے۔ ان کی خوش نوائی، خوش گوئی، خوش فکری اور خوش عملی کے ارتباط کو ان کی شاعری کے قالب میں ڈھلتے دیکھا ہے۔ یہ تحریر ایک گواہ کا بیان ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ گواہ ایک معتبر گواہ ہے۔ پیرزادہ کی شاعری کے تمام پہلوؤں کا جائزہ اور احاطہ اس وقت میرا مقصد نہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ان کا یہ مجموعہ ان کے ایک استاد اور ہر دور میں اُن کی شاعری سے دلچسپی رکھنے والے ایک شخص کی شہادت کے ساتھ شائع ہو۔

ایک مرحلے پر پیرزادہ قاسم کے اس شعری مجموعہ کا نام ''ایک دیا بجھا ہوا'' تجویز ہوا تھا۔ سبب ظاہر ہے کہ یہ ردیف اردو دنیا میں پیرزادہ کی شناخت بن گئی ہے۔ اپنی زبان کی کسی ترکیب اور کسی اظہار کو اپنی شناخت بنالینا اپنی انفرادیت کے اعلان اور اظہار کی طرف پہلا بڑا اقدم ہے۔ ایسا قدم جو اپنے آپ میں جست کے امکانات رکھتا ہے۔ لیکن اس نام سے منفی پہلو کا جو احساس ابھرتا ہے (ویسے یہ ردیف اور یہ غزل منفی نہیں، اس پر آپ کو اگلی سطور میں گفتگو ملے گی) اس کا تقاضا تھا کہ کسی نئے نام کی جستجو کی جائے۔ میں نے پیرزادہ کے مزاج، اندازِ فکر اور اسلوبِ کلام کی تلاش انہی کے صحیفۂ حرف میں کی اور آخر یہ نام ہاتھ آیا ''تند ہواؤں کے جشن میں''۔ بجھے ہوئے دیے کا رشتہ بھی تو تند ہوا سے ہے۔ مگر یہاں بات بہت دُور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارا دور چوطرفہ ہواؤں کا دور ہے۔ وہ ہوائیں جو اقدار و تمدن کے چراغ بجھائے دے رہی ہیں۔ انیس کا دور دیا نتدار، روشنی بدست اور نور در قلب و ذہن لوگوں کا دور تھا۔ کوئی ہاتھ میں چراغ لے کر نکلتا تو ایسی آوازیں راستہ روک لیتیں۔

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

لیکن ہمارے دور میں تند ہواؤں کا راج ہے۔ تیز ہواؤں کے شور اور تیز ہواؤں کی گونج کو ''تند ہواؤں کا جشن'' قرار دینا انسان کے ثبات کا دعویٰ ہے۔ تند ہواؤں کا جشن آدمی کی شکست کا پہلا باب بن سکتا تھا کیونکہ ان ہواؤں نے ہمارے عہد سے ذوقِ نغمۂ نازک چھین لیا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایسے دور آئے ہیں کہ نغمہ گروں کو کہنا پڑا ہے کہ:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

لیکن پیرزادہ قاسم جیسے شاعر ''تند ہوا کے جشن میں'' اپنے لہجے کی نغمگی کو برقرار رکھتے ہیں اور یوں اپنے عہد کی گراں گوشی کو حسنِ سماعت کا تحفہ دیتے ہیں۔

اے عہدِ گراں گوش ترا حُسن سماعت
ہم سے ہے کہ اک شور مچاتے ہی رہے ہم

اپنے نغمے کو شور کہنا انکسار بھی ہے اور اس حقیقت کا اظہار بھی کہ نغمے کے بطن ہی سے وہ شورِ معنی خیز ابھرتا ہے جو تند ہواؤں کے جشن کو بامعنی بنا دیتا ہے۔ پیرزادہ انکسار کے ساتھ ساتھ متاعِ خودشناسی کا مالک ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس نے عہدِ شورِ بیکراں میں کرب کو حرفِ سخن بنا دیا ہے۔

کربِ نہاں کو کچھ ہمی حرفِ سخن بنا سکے
ورنہ یہ شورِ بے صدا کس کی سمجھ میں آسکے

ہمارے دور کے وہ لوگ جنہیں اردو کے چالیس سالہ ادب میں کوئی فکری، تعمیری اور انقلابی آواز سنائی نہیں دیتی، خاص طور پر اس عہدِ گراں گوش کا اشارہ بن گئے ہیں۔ اب یہ آوازیں ان کے کان تک کیسے پہنچیں۔

بے حسی کی دنیا سے دو سوال میرے بھی
کب تلک جیا جائے اور کیوں جیا جائے
دستِ نادیدہ کی تحقیق ضروری ہے مگر
پہلے جو آگ لگی ہے وہ بجھا دی جائے
کوئی بتائے تو سہی یہ ساعتِ چمن ہے کیا
خزاں کا نام دفعتہً بہار کیسے ہو گیا

پیرزادہ قاسم چراغ، دیے کا نغمہ خواں ہے۔ ان استعاروں کو جمع کیجیے تو حاصل جمع روشنی ٹھہرتی ہے۔ خود بجھا ہوا دیا بھی روشنی کا اشارہ اور استعارہ ہے۔ پیرزادہ کی غزل:

خون سے جب جلا دیا ایک دیا بجھا ہوا

پر نظر ڈالیے تو اس ردیف میں اثبات کے نہ جانے کتنے ہی پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔ خون سے بجھے ہوئے دیے کو جلانا (عمل) بجھے ہوئے دیے کو جلانے کے لیے قبول کرنا (ذہنی رویہ) بجھے ہوئے دیے کا وصال سا لگنا (جذباتی رویہ) جلے اور بجھے ہوئے دیے کو ایک سلسلہ کے طور پر دیکھنا (تضاد میں وحدت کی تلاش و یافت) بجھے ہوئے دیے کی رفاقتِ شب اور بجھا ہوا دیا بھی تو اپنی ایک شخصیت رکھتا ہے۔ بجھنے سے پہلے اس نے فضا میں روشنی کی لکیر کھینچی تھی۔

درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے میری بساط کیا، ایک دیا بجھا ہوا

اور اگر بجھنے کا یہ عمل وقوع پذیر نہ ہوتا تو روشنیٔ جاں حرفِ سخن میں کیسے ڈھلتی۔ اس بجھے ہوئے دیے کا سلسلۂ نسب میرؔ صاحب کے والد کی اس وصیت و نصیحت سے جا ملتا ہے کہ بیٹا! عشق اختیار کرو۔ یہی نورِ حیات ہے، یہی نارِ حیات ہے۔ عشق خود بھی مشعلِ جاں ہے اور ہمیں بھی شمع صفت بناتا ہے (محبوبی

میں نہیں، پگھلنے میں) یہی دیا، اقبالؔ کی وہ شمع ہے جو سب سے جدا، سب کی رفیق ہے اور یہ شمع یا دیا تو شاعر کی ذات بن جاتی ہے۔ ویسے مری بساط کیا۔۔۔ پیرزادہ قاسم کا یہ شعر اپنے پہلوؤں اور گیرائی کی بنا پر رضا علی وحشتؔ کے اس شعر پر اضافہ اور نئے حاشیہ کا درجہ رکھتا ہے۔

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

پیرزادہ قاسم نے شمع سے اجتناب برتتے ہوئے ''چراغ'' اور ''دیا'' کو اپنی بنیادی علامت کے طور پر اختیار کیا۔ اس علامت اور استعارے کے تلازمے ان کی شاعری میں بڑی جامعیت اور ہمہ گیری رکھتے ہیں اور ہوا بھی ان کے رشتۂ معنوی کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ مجموعہ کی پہلی غزل ''دیا بجھا ہوا'' کے حوالے سے چند باتیں عرض کی جا چکی ہیں۔

اب اسی حوالے سے چند اور مقامات ملاحظہ ہوں۔ زندگی بُتِ ہزار شیوہ ہے اور شاعر اپنی بصیرت اور لفظوں کے لینس (LENS) سے اس کی اداؤں کو اس طرح گرفت میں لیتا ہے کہ جب وقت کی کرن ان تصویروں پر پڑتی ہے تو معنوں اور تلازموں کی نئی جگمگاہٹ ان نقوش کے بطن سے ابھر آتی ہے۔

میرے لہو میں جل اُٹھے اُتنے ہی تازہ دم چراغ
وقت کی سازشی ہوا جتنے دیے بجھا گئی

یہاں حوصلہ اور حالات دیے کے تلازمے ہیں۔ پہلے مصرع میں چراغ، دیے سے الگ ایک علامت ہے۔ یہ لہو ہی ہے کہ جس کی تازہ دمی نے روشنی بن کر اسے چراغ بنا دیا۔

یہ آج کس کو اچانک مرا خیال آیا
چراغ راہ میں یہ کون دھر گیا سرِ شام

یہاں چراغ کے تلازمے ہیں محبت (خیال) اور رہنمائی (روشنی) یہاں مجھے راجندر سنگھ بیدی کی کہانی یاد آ رہی ہے۔ ''بھولا'' جس کی معصومیت نے طوفانِ ہوا کے مقابل سر راہ روشنی رکھ دی تھی۔ روشنی نہ ہو تو معصومیت اندھیروں میں گم ہو جائے گی خواہ شاعر کی ہو یا ''بھولا'' کی:

مصیبتوں نے بے چراغ کر دیا اگر تو کیا
دیا بجھا دیا گیا ہے دل تو مت بجھایئے

یہاں دیا وسائل کی علامت ہے اور دل ذات کی۔ دیے کے اس تلازمے کو فعلِ مجہول نے کس طرح ابھارا ہے۔ شادؔ عظیم آبادی یاد آ گئے کہ ''تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں'' فعلِ مجہول کا رشتہ جبر سے قریبی ہے۔ قواعد گلیوں کے طومار کا نام نہیں، یہ زبان کا تخلیقی مطالعہ ہے:

دستِ ظلمت پہ تہی بخت نہ بیعت کر لیں
پھر سرِ شام دیا بھی نہ جلایا جائے

یہاں دیے کا تلازمہ ہے حق اور جہاد اور ظلمت سے مقابلہ۔ شام اور دیے نے ہماری صورتِ حال کو شامِ کربلا کی فضا عطا کر دی ہے:

یہ بات بجھتے دیوں نے کسی سے پوچھی تھی
جلے تم ہم تھے مگر خیر جگمگائے کون
یہاں تو اپنے چراغوں کی فکر ہے سب کو
دیا جلایا ہے سب نے دیے جلائے کون
یہاں تو صبح سے پہلے ہی بزم برہم ہے
دیا بجھا ہے کوئی پر دیا بجھائے کون

پہلے شعر میں بجھنے کا علاقہ معنوی روشنی پھیلانے کے عمل سے ہے۔ اس عمل میں بجھنا ہی دیے کی جزا ہے۔ رہا یہ سوال ''جگمگائے کون''۔ دوسروں میں بے غرضی پیدا کرنے کی کوشش کے سوا کچھ اور نہیں، ورنہ دوسرا شعر شاہد ہے کہ ''دیا'' جلانا بھی عملِ خود غرضی ہو سکتا ہے۔ ہمارے دور میں اپنے چراغوں کی فکر چھوڑیے۔ لوگ لاشوں کے گننے کے عمل میں بھی اپنوں اور پرائیوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ دیے، دوسرے شعر میں بے غرضی اور اجتماعی عمل کا اشاریہ ہے۔ اور آخری شعر میں دیا بجھانا سلیقے سے بساطِ بزم اٹھانے کا عمل ہے، جو بزم کے برہم ہونے کے مقابل ہے۔

''دیے اور چراغ'' کے علاوہ پیرزادہ قاسم کی دوسری علامتیں ''دنیا'' اور ''سفر'' ہیں۔ دنیا میں زمانہ اور وقت بھی شامل ہیں اور سفر کی بہت سی سمتیں اور جہتیں ہیں۔ بقول اقبالؔ

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

پیرزادہ قاسم بھی اپنی حیات اور اپنی ذات کو سفر نصیب قرار دیتے ہیں۔ زندگی ایسا سفر ہے جس میں ہم ہر لحہ کچھ سے کچھ بن رہے ہیں۔ تشکیل و تعمیر کا یہ سلسلہ جاری ہے اور ہم اپنے کوزہ گر کے ہاتھوں میں اس تشکیلی سفر سے گزر رہے ہیں۔ خدائی ہاتھ ہمیں بنا رہا ہے، بنا رہا ہے اور یوں ہمارے مقدر کی تشکیل ہو رہی ہے۔

سفر نصیب ہیں ہم کو سفر میں رہنے دو
سفالِ جاں کو کفِ کوزہ گر میں رہنے دو

پیرزادہ قاسم کی لفظ تراشی پر گفتگو کو آگے بڑھانے اور ان کے اسلوب شعری کی نقش بندی کے عناصر کا ذکر کرنے سے پہلے DYLAN THOMAS کی ایک بات یاد آ گئی جو اس نے غالباً اپنے شاعرانہ منشور (POETIC MANIFESTO) میں لکھی ہے کہ ''میں شعر اس لیے لکھنا چاہتا تھا کہ مجھے لفظوں سے عشق ہو گیا تھا۔ لفظوں کے معنی کیا ہیں یہ بات ثانوی اہمیت کی تھی۔ جو بات اہم تھی وہ لفظوں کا آہنگ اور ان کی آواز تھی۔ مجھے اُن رنگوں سے دلچسپی تھی جو لفظ میری آنکھوں کے سامنے بکھیر دیتے تھے۔'' یہ بات شاعر کے علاوہ شاعر کا قاری بھی محسوس کرتا ہے۔ جب اقبالؔ کے اشعار کا مفہوم

ذہن میں نہ آتا تھا تو محض اس کے لفظوں کا آہنگ اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

یہ بات میں نے اپنے ایک مضمون ''اقبالؔ کے ساتھ ساتھ'' میں قدرے تفصیل سے بیان کی ہے۔ پیرزادہ قاسم کے ہاں لفظوں کا آہنگ دیکھئے:

کیا سروقدی قامتِ فن یوں ہے کہ جیسے
سائے رہیں سایوں کے برابر متواتر
کیا یہی اشکِ ندامت ہے جو رخشندہ ہے
آپ کی جان سے دور، آپ کی مژگاں کے قریب

میں نے لفظ و معانی کے ارتباط سے انکار نہیں کیا ہے، لیکن شاعری کے آہنگ اور رقص کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اگلی سطور میں لفظ اور معنی و تخیل کے تعلق ہی کا ذکر ہے۔

لفظ تراشی سے شاعر کے تخیل، مشاہدہ اور مشاہدہ و مطالعہ کی پیوند کاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنی شعری روایت میں اس کے مطالعہ اور نظر کا بھی۔ پیرزادہ صاحب کی تراکیب اور لفظ تراشی سے ہی اُن کی شخصیت پر میرؔ صاحب اور مرزا نوشہؔ کے اثرات کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

میری طرح دشت بھی مجبور ہے
اس کو بھی اک خاک بسر چاہیے
میرؔ کے اندازِ سخن کے لیے
صرف ہُنر کیا ہے، جگر چاہیے

کیا باک مجھے صدق کے اظہار میں آوے
غالبؔ کا ہے فیضان جو اشعار میں آوے

شاید مجھے وہ بھول گیا ہے کہ ناگہاں
آئی شکستِ شیشۂ دل کی صدا ابھی

پیرزادہ قاسم نے اردو غزل کو ارد و غزل بنانے والے دونوں شاعروں کی صحبت میں ادب اور توجہ کے ساتھ اپنا وقت گزارا ہے اور ان دونوں کی شاعری اور ذات کو کس انحصار کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ میرؔ صاحب نے ہنر اور جگر داری کے پھول اپنی ذات کی شاخ پر کھلائے ہیں۔ جو آدمی عیب کرنے کے لیے ہُنر کا تقاضا کرے اس کی معیت میں ماہ و سال گزارنے کے لیے جگر چاہیے۔ اور ہمارے مرزا صاحب کا تو دعویٰ ہے۔

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اور اسی کے ساتھ شاعری میں صدق کے پیرایے۔ ''ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے'' اور ''کیوں نہ فردوس کو دوزخ میں ملالیں یارب'' سامنے آتے ہیں۔

ہمارے عہد کی شاعری پر فیض احمد فیضؔ کے فیضان سے کون انکار کرے گا۔ پیرزادہ صاحب بھی اس جادو سے کیسے بچتے۔ فیضؔ نے اپنے خونِ دل میں انگلیاں ڈبوئی تھیں اور جب بات پیرزادہ قاسم تک پہنچی تو یاروں نے ان کے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر داستاں رقم کر لی۔

کس ہُنر سے یاروں نے داستاں رقم کر لی
میرے خونِ دل میں ہی انگلیاں ڈبونے سے

اور پیرزادہ نے بھی سچ کہا ہے کہ یہ فغاں اعجاز ہوتی ہے:

بھلا یہ آہ و زاری شعبدہ بازوں کے بس کی ہے
فغاں اعجاز ہوتی ہے، فغاں ایجاد کیا کرتے

میں نے ادبی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے میرؔ، غالبؔ اور فیضؔ کا ذکر کیا تھا، لیجیے آہ و فغاں نیم شب کی سطح پر اقبال بھی سامنے آ گئے۔ اقبال کے نزدیک سخن وری ''کہی'' اور ''ان کہی'' دونوں سے عبارت تھی۔

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا؟
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

یہی وہ منزل ہے جس کے مضافات میں پہنچ کر پیرزادہ قاسم کو کہنا پڑا:

نہ پوچھیے کہ کہا کیا ہے، ان کہی کیا ہے
عذاب جھیل رہا ہوں سخنوری کیا ہے
پسِ نظر ہو اگر مقصدِ حیات تو پھر
یہ زیست وقت گزاری ہے زندگی کیا ہے

افراد اور قومیں، آرزو اور مقصد ہی سے زندگی پاتی ہیں۔ یہ نکتہ پیرزادہ نے زندگی کے علاوہ اقبالؔ سے بھی سیکھا ہوگا۔ یہ ایک نئے تصوف کی نشان دہی بھی ہے۔ ایک تصوف تو وہ تھا جس میں اقبالؔ کو ''محکومی و مسکینی و نومیدیٔ جاوید'' کے عناصر نظر آئے، اور دوسرا تصوف وہ ہے جو شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلتا اور جبروتِ شاہی کے پردوں کو چاک کرتا تھا۔ اسی کے نمائندے معین الدین چشتیؒ اور مجدد الف ثانیؒ تھے۔ یہی تصوف نظام الدّین اولیاؒ کی پیشانی پر دربارِ شاہی سے بے نیازی کی صورت میں خورشید بن کر چمک رہا تھا۔ ایسا تصوّف خدا اور خودی کو کس طرح ہم آہنگ کرتا ہے، اس کا پیرزادہ کو ادراک ہو چکا ہے۔ ابھی ان کی زندگی میں تو یہ رنگ اُبھر کر نہیں آیا مگر اُن کے لہو میں اُن کے اجداد کی مبارزت طلبی کی صدائیں میں سن رہا ہوں۔ بات ہو رہی تھی ادراکِ خدا اور خودی کی، سو یہ شعر سُنیے:

شعورِ حق پہ بہت گفتگو ہوئی لیکن
شعورِ ذات ہی ہر گفتگو کا حاصل تھا

زمین ایجادی اور اس کا سلسلہ پیرزادہ کی فکر اور شخصیت کے ایک نمایاں عنصر تک جا پہنچا۔ زندگی کی طرح خیال بھی شاخ در شاخ اپنی نمود اور نمو

چاہتا ہے۔ فغاں کا تعلق اعجاز سے ہے، مگر اظہار تو ایجاد کے مرحلوں سے گزرتا ہے۔ اسی ایجاد میں طبع خداداد کے ساتھ ساتھ خونِ رگِ معمار بھی شامل ہے۔ پیرزادہ قاسم کی غزل کی ان زمینوں کو دیکھئے:

خُون سے جب جلا دیا ایک دیا بجھا ہوا
میانِ کارِ فن لفظوں کی قسمت جاگ اُٹھتی ہے
کسی نے اک حرفِ زیست پیہم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے
میرے کام بہت آتا ہے اک انجانا غم
چاند بھی بجھا ڈالا دل دکھانے والوں نے
کارِ خلوصِ یار کا مجھ کو یقین آ گیا
دیر سے تیز رو تو ہم خاک و ہوا کے ساتھ ہیں

ردیفوں کی یہ نشان دہی اس مجموعے کے ابتدائی صفحات سے کی گئی ہے۔ بالعموم طویل ردیفوں کی اساس فعل ہوتا ہے اور یوں تسلسل پیدا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ پیرزادہ قاسم کے ہاں افعال کے ساتھ ساتھ ایسی زمینیں بھی ہیں جن میں فعل کی جگہ اسم یا اسم اور صفت یا فعل ناقص کے امکانات کو ابھارا گیا ہے۔ پہلی ہی غزل ''ایک دیا بجھا ہوا'' مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ ''اک انجام غم'' اور ''چاند بھی بجھا ڈالا دل دکھانے والوں نے'' دوسری مثالیں ہیں۔ پیرزادہ قاسم یوں بھی کہہ سکتے تھے:

دل دُکھانے والوں نے چاند بھی بجھا ڈالا

لیکن نحوی زور (STRESS) بدل جاتا اور بجھانے کا عمل، دل دُکھانے والوں پر غالب آ جاتا۔ دوسری بات یہ کہ دل دُکھانے والوں کا دائرۂ عمل کیسے سامنے آتا۔ دل دکھانے کے کتنے پہلو، گوشے اور زاویے ہیں اور پھر یہ دل دکھانے والے تو وہ ہیں جو ہماری دعاؤں کا مرکزی کردار بھی ہیں۔ یہ وہ ہیں جو ہماری زندگی کو درد کی معنویت اور دل گرفتگی کی صفت عطا کرتے ہیں:

ہم نے خستگی پائی، دل گرفتگی پائی
خیر ہم سے کیا پایا دل دکھانے والوں نے

دوسرے مصرعے کا زیریلی لہجہ اور تحت بیانی (UNDER-STATEMENT) آج کی غزل میں آسانی سے ملنے والی خصوصیات نہیں۔ اس کے لیے جگر کو خون کرنا پڑتا ہے۔ یہ میر صاحب کا ورثہ ہے اور اسے پانے کے لیے محبت کے ظلمت سے نور کا ڑھنے کی تفہیم کے مرحلہ سے گزرنا پڑتا ہے۔

پیرزادہ قاسم نے طویل ردیفوں کے بغیر بھی مسلسل غزلیں کہی ہیں:

کدورتوں کے درمیاں، عداوتوں کے درمیاں
میانِ کارِ دنیا ہم سے دل ناشاد کیا کرتے
نغمۂ نے سے خروشِ بیکراں پیوند ہو
ملتے ہی گئے خضر سے رہبر متواتر

''کے درمیاں'' کی ردیف صورت حال اور مختلف صورت ہائے حال کے تضاد کو گرفت میں لینے کا شاعرانہ اور فنی وسیلہ ہے۔ شاعر میں قومی جذبات اور فطری سرعتِ حسن و فکر کے ساتھ اگر غزل کی ترکیبِ صنفی اور حرفت (CRAFT) سے باخبری ہو تو آبگینۂ تندئ صہبا سے پگھلنے لگتا ہے۔ ردیف اور قوافی اندھے کی لاٹھی بننے کی جگہ خیال کی ترسیل اور نغمگی کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ ردیف و قافیہ کی چوٹیاں سر کرنے والے شاعر کی غزل کوہِ ندا بن جاتی ہے اور جب اس پہاڑ سے آواز ہم تک پہنچتی ہے تو وہ ہمیں اپنی ہی آواز معلوم ہوتی ہے۔ کتنا عجیب ہے یہ کوہِ ندا کہ سننے والا اس کی طرف بھاگنے کی بجائے اپنی ذات کی سمت سفر کرنے لگتا ہے۔

غزل کو فراقؔ صاحب نے انتہاؤں کا سلسلہ (A SERIES OF EXTREMES) کہا تھا۔ پیرزادہ کی یہ غزل اس قول کی مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

کدورتوں کے درمیاں عداوتوں کے درمیاں
تمام دوست اجنبی ہیں دوستوں کے درمیاں
شعورِ عصر ڈھونڈتا رہا ہے مجھ کو اور میں
مگن ہوں عہدِ رفتگاں کی عظمتوں کے درمیاں

پیرزادہ قاسم کو شہرت اور وہ بھی مشاعروں کی شہرت خراب نہ کر سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شہرت کے خلاف اپنا دفاع کرتے رہے ہیں:

عجب دیکھا کرشمہ لفظ کی بازی گری کا بھی
سخن معدوم ہو جاتا ہے شہرت جاگ اٹھتی ہے

پیرزادہ نے ایجاد اور اعجاز کے نکتے کو بھی سمجھا ہے اور شہرت کی خاطر انہوں نے نہ اپنی قربانی دی ہے اور نہ اپنے فن کی۔

جن غزلوں کے مصرعے میں نے پیش کیے ہیں اُن میں ردیف کے استعمال اور اس کے نتائج کے بارے میں طویل گفتگو کی جا سکتی ہے مگر غزل مجھ سے اختصار اور ایجاز کا مطالبہ کر رہی ہے۔ پیرزادہ کے اس مجموعے میں غیر مُردّف غزلیں بھی ہیں اور یہاں قوافی کی ہم صوتیت فضا کی تشکیل و تعمیر میں مصروف نظر آتی ہے۔ ایسی فضا جس کی حُزنیہ لَے اور روشنی میں شاعر کی دردمند شخصیت براگندہ نقاب نظر آتی ہے۔ غزل تو زندہ رہنے اور زندگی کرنے کا بہانہ بن جاتی ہے ورنہ شخصیت کا توازن بکھر کر رہ جائے۔ پیرزادہ قاسم کے ہاں جینے کا یہی ہنر ہے جو ادبی سطح پر ان کی غزل بن گیا ہے۔

اب تو یہی موسم ہے اور قریۂ جاں اپنا
کچھ درد کی چہکاریں کچھ زخموں کی گل کاری

پیرزادہ کی زندگی اور غزل شائستگی اور شائستہ لہجے سے عبارت ہیں۔ یہ شائستگی ان کے توازن کے سبب ہے۔ اسی شائستگی سے کارِ غم اور کارِ جہاں کے ہنگامے ان پر سہل ہوئے ہیں۔ ان کی غزل میں آج کی اجتماعی فضا اور ماحول کا عکس اور بازگشت موجود ہیں، لیکن ماحول کا انتشار، ان کے ہاں فکری،

جذباتی یا فنی انتشار نہیں بنا ہے۔ آج کے بہت سے لکھنے والے، بالخصوص جدیدیت کے نقیب زندگی کی لایعنیت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے فن کو ''لایعنیت'' کا سمبل قرار دیتے ہیں۔ وہ لوگ کہ فن کی اقدار اور قوت دونوں پر یقین رکھتے ہیں، اس بات کے قائل ہیں کہ ادب محض زندگی کی نقالی یا عکاسی نہیں بلکہ زندگی اور اس کی اقدار عالیہ کی باز آفرینی ہے۔ خود انسانی زبان باز آفرینی اور انبساطِ روحی و معنوی REGENERATION کی سب سے جامع اور وسیع مثال ہے۔ (یہ الفاظ جو میں نے اس مطالعے میں لکھے ہیں اس ترتیب سے پہلے کبھی نہیں لکھے تھے اور نہ آپ نے پڑھے تھے، لیکن ہم ایک دوسرے سے بات کر سکتے ہیں۔ روز مرّہ کی زندگی کی گفتگو بھی اسی باز آفرینی کی مثال ہے۔ اور تحریر و تقریر میں لفظ کبھی علامت بن جاتا ہے اور کبھی استعارہ، لیکن قاری اور سننے والے سیاق و سباق اور لفظ کے معنوی مضمرات کی وجہ سے بات سمجھ لیتے ہیں) پیرزادہ کی غزل میں ہمارے آج کے اجتماعی حالات کا عکس ہی نہیں اس کی تاویل و توجیہ بھی ہے اور اس پر تبصرہ بھی اور یوں کہ ہم حالات کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ یہ تجربہ شاید آج کے حالات کے سوا کسی اور ذریعہ سے شاعر کی زندگی اور ہماری غزل میں نہیں آ سکتا تھا۔ سو اس شعر پر غور فرمایئے:

اب تو میرا دشمن بھی میری طرح روتا ہے
کچھ گلے تو کم ہوں گے ساتھ ساتھ رونے سے

ایک اور غزل کے دو شعر دیکھئے۔ پہلا شعر تو بحیثیت قوم ہماری آج کی حالت کا عکس اور اس پر تبصرہ ہے اور دوسرے شعر میں کراچی کے نسلی فسادات کو پڑھیے۔ فرق ہوا ہے تو اتنا کہ ''سال'' کی شرط ختم ہو گئی۔

جی چھوڑ کے بیٹھا ہو جو قافلہ رستے میں
اب اس کی بلا جانے ہو جس کی ہو سالاری
ہر سال لگاتے ہیں ہم پود کدورت کی
ہر سال ہی کرتے ہیں ہم دل میں شجر کاری

اسی حوالے سے ان دو اشعار پر بھی نظر ڈالیے:

بے زمین پودے بھی لہلہائے ہیں کیا کیا
ہم بھی زخم کھا کھا کر مسکرائے ہیں کیا کیا
اپنی مٹی میں ذرا اور میں رچ بس جاؤں
ہاں ابھی اور مرا خون بہایا جائے

پیرزادہ کے فن اور فکر پر ان کی غزل کے حوالے سے چند باتیں عرض کی گئیں۔ وہ اپنی ذات سے قریب ہیں اور اسی ذات کے حوالے سے حرفِ غزل پیش کرتے ہیں مگر انہوں نے اپنی ذات کو اپنا زنداں نہیں بنایا ہے۔ جو دیوار بھی ان کے سامنے آتی ہے وہ اس میں در پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کی غزل اسی عملِ تسخیر اور سفرِ مسلسل کی داستان ہے۔ ان کے عملِ تسخیر کی تمنّا اور آخری منزل یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مسخر کر لے۔ کائنات کو تو وہ مسخر کر ہی رہا ہے مگر اب وہ مرحلہ آ گیا ہے کہ اگر اپنے اندھے ارادوں اور بے سمت خواہشوں کو انسان نے بصیرت اور سمت نہ دی تو یہ دنیا ایک دھماکے سے ختم ہو جائے گی۔ اور دوسری طرف اس سفرِ مسلسل میں تعمیر دوست اور تعمیر پسند فنکار اپنے وجود کی نفی کرتے ہوئے اپنے بطون کو نورِ قدیم کا مسکن بنانا چاہتا ہے:

کرن وہ نور کی کس طرح روح تک آتی
کہ راہِ وصل میں میرا وجود حائل تھا

مگر یہ معاملہ وجود کو مٹانے کا نہیں، اسے شفاف کرنے کا ہے، بدلنے اور نئے قالب میں ڈھالنے کا ہے۔ پیرزادہ قاسم کی شاعری کے بارے میں جو چند باتیں پیش کی گئیں ان کو اگر سمیٹوں تو یہ کہوں گا کہ ان کی غزل ان کے ذہن کے عقلی وظیفے اور تخلیقی جوہر سے عبارت ہے۔ یہ پوری ذات کی شاعری ہے اور یوں پیرزادہ ان شاعروں میں شامل ہیں جن کا حرفِ غزل کا جواز ہے۔ میں نے کہیں یہ بات عرض کی ہے کہ غزل کو اپنا اظہار بنانا تہذیب اور تخلیق کا نکتۂ آخر ہے، کیونکہ غزل میں ہماری صدیاں سمٹ آئی ہیں اور یہ تہذیبی ارتکاز شاید ہی کسی زبان کی کسی صنف میں مل سکے۔ غزل ایک متمدن اور مہذب صنف ہی نہیں بلکہ یہ ربط و تہذیب کا درس بھی دیتی ہے۔

اس مجموعے میں غزلوں کے بعد آزاد نظمیں اور چند نثری نظمیں بھی ہیں۔

غزل ہماری دنیائے شاعری کی شہزادیٔ شہرزاد ہے۔ غزل کے وسیلے سے ہمارے بہترین تخلیقی ذہنوں نے اپنا اظہار کیا ہے اور یوں کہ حیات و کائنات کو نئی معنوی سطحیں مل گئی ہیں۔ غزل لفظ، نظر اور انسانی فکر و احساس کا سنگم ہے مگر یہ سچ ہے کہ غزل پوری زندگی نہیں۔ بعض خیال اور جذبے اپنے اظہار کے لیے دوسرے سانچوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ابھی پیرزادہ قاسم اس مرحلے پر نہیں پہنچے کہ طویل نظموں کے ذریعہ اپنے مربوط، مرتب اور زیادہ پیچیدہ خیالات کا اظہار کریں۔ ابھی وہ بنیادی طور پر غزل کی نقش گری میں مصروف ہیں۔ غزل چاول کے دانے پر سورۂ اخلاص رقم کرنے کا عمل ہے اور یہ فن عظیم اور بلند و بالا محرابوں اور عمارتوں کی پیشانی پر آیاتِ قرآنی، طغرے اور تاریخیں لکھنے کے فن سے مختلف ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب پیرزادہ قاسم طویل نظمیں لکھیں گے تو وہ وقت کی محراب اور اس کے ایوان کی پیشانی پر ثبت کی جانے والی تحریروں کے مثل ہوں گی۔ اس یقین کا سبب یہ حقیقت ہے کہ پیرزادہ شخصی احساس کے مالک اور تصوف کی رویت کے امین ہونے کے ساتھ ساتھ سائنسی علم بھی رکھتے تھے جو ماورائیت اور طبیعیات و مابعد الطبیعیات کے بوجھ کو برداشت کر سکتا ہے اور یہ نئی شاعری کا مقدر ہے کہ وہ انسان اور کائنات کے پورے بوجھ کو اپنے کاندھوں پر سہار سکے۔

پیرزادہ قاسم کی کئی مختصر نظمیں ایسے خطوط کی طرح ہیں جو کسی کو بھیجے نہ جا سکے یا وہ ایسی گفتگو اور یک طرفہ مکالمہ ہیں جو نظر کی زبان سے ادا کیا گیا اور

پھر کاغذ پر حروف کی صورت اختیار کر گیا:

تمہاری بند مٹھی میں
یہ کیسی خاک ہے جس میں
مری خوشبو ہے
میرا رنگ ہے
اور لحہ لحہ سرد، ہوتی زندگی
کچھ حرارت ہے

میں پوری نظم نقل کرنے جا رہا تھا مگر خیال آیا کہ ''ایک مفرد مکالمہ'' آپ پڑھ ہی لیں گے اور

میرا سخن اب خاموش ہے
میرا لہجہ بے سخنی ہے
تم چاہو تو یہ لہجہ، یہ بے سخنی
تم بھی اپنا لو (بے سخنی)

یہ سارے لفظ، لفظوں کی جگہ خیال کا رُوپ نظر آتے ہیں، مگر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ لفظ کے بغیر آدمی سوچ نہیں سکتا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فکر کا عمل زبان کے تابع نہیں اور کچھ یہ سوچتے ہیں کہ آدمی خواب بھی زبان سے آزاد ہو کر نہیں دیکھ سکتا۔ بہر حال یہ بے سخنی بھی سخن بن کر ہم تک آ گئی ہے۔

پیرزادہ کی زیادہ تر نظمیں دل کہانی ہیں مگر وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ شاعر اپنی ذاتی کہانی کو انسان کی کہانی بنا دیتا ہے۔ اس حقیقت کو ہمارے شعرا نے جس جس اسلوب اور پیرایوں اور حسن سے بیان کیا ہے مغرب کی تنقید بیان کی اس سطح تک نہیں پہنچ سکی۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
سے لے کر

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

اور ''عشق کہانی'' تک۔ اگر کوئی شخصی تجربہ انسانی تجربہ نہ بن سکے تو وہ ادبی تجربہ، اظہار اور حقیقت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہمیں کیا پڑی ہے جو دوسروں کی محبت کے قصے پڑھیں یا دوسروں کے دکھ درد کو اپنائیں اگر وہ ہماری محبت اور دکھ درد نہ بن سکیں۔ غالبؔ کے خطوط میں ان کی جسمانی معذوریاں، آب و نان سے دوری، کُھری چارپائی، موسم کے شدائد اور قرض خواہوں کے تقاضے، سب انسانی تجربات بن جاتے ہیں اور ہم غالبؔ کے لکھے ہوئے لفظوں میں انسانی مقدر اور انسانی مجبوریاں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ پیرزادہ نے ''عشق کہانی'' میں یہ سب کچھ بیان کر دیا ہے۔ سلیقہ، حسن اور قوت کے ساتھ۔

یہ مختصر نظمیں خیال اور فکر کے وہ بیج ہیں جن میں خیال و فکر کے قد آور درخت سو رہے ہیں۔ اب اچھی مٹی، سازگار موسم، معتدل بارش اور حیات بخش دھوپ ملے تو یہ چھپے ہوئے اور سوئے ہوئے درخت سوتے سے جاگ اٹھیں اور کلبلانے لگیں اور بیج کے حصار کو توڑ کر آزاد فضاؤں سے اپنا رشتہ جوڑ لیں۔

اس مجموعہ میں نثری نظمیں بھی ہیں۔ میں ایک صنف ادب کے طور پر نثری نظم کے خلاف نہیں لیکن میری دانست میں یہ صنف اپنے ن۔م۔ راشدؔ کے انتظار میں ہے۔ اب تک تو نثری نظم کے نام سے جو نمونے ہمارے سامنے آئے ہیں وہ نقشِ بے حیات ہیں۔ بعض خواتین کی نثری نظم کی چند سطروں میں حیات کی ابتدائی شکل نظر آتی ہے۔ خورشیدؔ الاسلام کی نثری نظموں کے بعد پیرزادہ قاسم کی نثری نظموں میں ایک وعدۂ خفی نظر آتا ہے۔ نثری نظم جس قوت اور بے محابا اظہار کا مطالبہ کرتی ہے۔ ابھی ہمیں اس کا انتظار کرنا ہے۔

ایک بات طے ہے کہ پیرزادہ کے ہاں نثری نظم نہ تو چونکانے کی خاطر ہے اور نہ عجز کی نشانی ہے۔ پیرزادہ قاسم کی غزل ان کی قوتِ شاعرانہ اور نظم واحتیاط کی دستاویز ہے۔ خیال کی بعض لہریں آزادی طلب ہوتی ہیں اور انہوں نے ایسی ہی لہروں کی خاطر نثری نظم کی طرف رُخ کیا ہے۔ ان کی نثری نظم، ان کی غزل اور آزاد نظم کے تسلسل ہی کا ایک حصہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُن کی نثری نظم پر اس سے بہتر اور غیر جانبدارانہ تبصرہ ممکن نہیں کہ:

میری آتش فکر اور شعلہ نوائی
بے حس ساعتوں سے مکالمہ کرتے کرتے
تھک گئی تو پھر
راکھ کے لہجے میں گفتگو کرنے لگی (تسلسل)

میرؔ کا لہجہ

پیرزادہ قاسم کی شاعری پر میرؔ کے لب و لہجے اور ان کے سوز دروں کا اتنا اثر ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ پیرزادہ نے اردو کے چند دوسرے شعراء کی طرح اپنی آواز میرؔ ہی کے لب و لہجے میں دریافت کی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

پروفیسر ممتاز حسین

○

''خون سے جب جلایا دیا''

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

(●)

پیرزادہ قاسم نے جب اس دنیا میں آنکھ کھولی تو وہ واقعی تند ہوا کے جشن کا دور تھا۔ ۱۹۴۳ء یعنی ہندوستان کی آزادی اور آزاد پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے چار سال قبل کا زمانہ۔ تاریخ نے دنیا کے کسی حصے یا کسی خطے میں تند ہوا کا ایسا جشن نہیں دیکھا ہوگا۔ اور پھر جب پیرزادہ قاسم نے شاعری کی ابتدا کی ہوگی پندرہ سولہ برس کا ان کا سن ہوگا۔ یعنی دوسرے لفظوں میں ہندوستان کی آزادی کو اور پاکستان کو معرض وجود میں آئے بس گیارہ سال گزر چکے ہوں گے تو پیرزادہ قاسم نے دیکھا ہوگا کہ تند ہوا کا یہ جشن پہلے سے زیادہ شدید ہو گیا ہے۔

میں نے یہاں ہندوستان اور پاکستان کا ذکر کسی سیاسی تناظر میں نہیں کیا ہے بلکہ اس پس منظر میں کیا ہے کہ دو بھائی ایک مکان میں اکٹھے نہیں رہ سکتے تو مکان کو تقسیم کر لینا بھی ہمارے دکھوں کا ایک حل ہے لیکن الگ الگ مکانوں میں رہنے کے باوجود دلوں میں میل کیوں باقی رہے دونوں کے دلوں میں شکوک وشبہات کیوں باقی رہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صرف شکوک وشبہات ہی نہیں رہے بلکہ دو یا تین بار دونوں میں باہمی جنگ بھی ہو گئی۔

کہا جاتا ہے کہ ان جنگوں میں فلاں ملک کا ہاتھ تھا، فلاں ملک اس کے پیچھے تھا اگر یہ حقیقت ہے تو یہ ہمارے لیے اور زیادہ شرم کی بات ہے کہ ہمیں دوسروں ملکوں کی کٹھ پتلیاں بنتے ہوئے کوئی ندامت محسوس نہیں ہوئی۔ کوئی ذلت محسوس نہیں ہوئی۔ یہ ہماری وہ احمقانہ سیاست تھی جس نے ہماری سماجیات کو متاثر کیا۔ صرف متاثر ہی نہیں کیا بلکہ ہماری سماجیات کے اندر گھس گئی اور آج آپ ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کو چھوڑیے، خود ہندوستان اور پاکستان کی اندرونی حالت کو دیکھیے۔ ہم پہلے بھی اپنی تمام تر خرابیوں کا ذمہ دار غیر ملکی حکومت کو قرار دیتے تھے اور آج بھی ہمارا طرز فکر یہی ہے۔ کاش ہم اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ سکتے!

خیر میں نے ہندوستان اور پاکستان کا نام اس تحریر میں علامت کے طور پر لیا ہے۔ کسی سیاسی مسئلے کو الجھانے یا سلجھانے کے لیے نہیں۔ اور میں اپنی بات چیت میں یہ کوشش بھی نہیں کر رہا ہوں کہ میں پیرزادہ قاسم کی شاعری اور ہندو پاکستان کے بیرونی یا اندرونی مسائل کے مابین ایک رشتہ قائم کروں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان ایک ماحول سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اگر نہیں ہوتا تو پھر وہ کھلی آنکھوں اور کھلے دل والا شاعر نہیں ہے۔ شاعر کا سیاست سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق رکھنا تو ضروری نہیں ہے لیکن اس کے ماحول میں جو اتار چڑھاؤ اسے نظر آ رہا ہوں اس سے اور ان زیریں لہروں سے جو اس اتار چڑھاؤ کا باعث بنتی ہیں بے خبر اور بے تعلق رہنا بھی اس کے لیے کوئی قابل تحسین امر نہیں ہے۔

آزادی سے بہت پہلے کی بات ہے انگریز نے دہلی اور پنجاب میں مارشل لاء کے نام پر ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی۔ اس وقت میرے والد محترم محروم صاحب نے ایک قطعہ کہا تھا:

شاعر کا فرض ہے اسے دیکھے بچشم غور
دنیا میں اس کے سامنے جو کچھ ہو رونما
ہو کر اثر پذیر کرے نظم میں بیاں
کچھ اس طرح کہ کھینچ دے تصویر ماجرا
دل تھا اسی خیال میں میرا کہ غیب سے
آئی بہ گوش ہوش یہ حسرت بھی صدا
جو واقعات دہلی و پنجاب میں ہوئے
محروم ان پر نظم نہ لکھ اشک خون بہا

اسی زمانے میں ایک اور واقعہ بھی ماحول میں گونجا تھا۔

ہر زائر چمن سے یہ کہتی ہے خاک باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

اس وقت تک اور اس کے بہت بعد تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس قطعے کا خالق کون ہے۔ یہ گتھی غلام رسول مہر، فقیر سید وحید الدین مرحوم اور شیخ اعجاز احمد نے کھولی کہ یہ قطعہ علامہ اقبال کا ہے۔

دیکھئے اپنے قطعے میں محروم کہہ رہے ہیں شاعر اپنے ماحول پر گہری نظر رکھے۔ پھر اسے اپنے شعور میں ڈھالے اور یوں کہ فکر فکر محسوس بن جائے۔ خیال جذبہ بن جائے لیکن اس سے بھی آگے کی منزل یہ ہے کہ وہ فکر محسوس یا جذبہ اشک خوں کی صورت اختیار کرے۔ یہی فن اور فن کار کا کمال ہے۔

یہی بات اقبال نے کہی۔ تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے۔ اب اشک خوں ہو یا آنسو ہو اس کے معنی شاعری کی زبان میں درد و گداز ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو شعر تاثیر سے خالی رہے گا۔ ملٹن ہوں یا اقبال، کالی داس ہوں یا سنت تلسی داس ہوں یا شیخ سعدی، دانتے ہوں یا فردوسی ان کے یہاں فکر چاہے کتنی بلندی پر کیوں نہ پہنچ جائے، جادو اس وقت جاگتا ہے جب وہ جذبہ بن کر شاعری کی زبان میں ڈھلتا ہے۔

میں نے جب پہلے پہل پیرزادہ قاسم کو کراچی کے ایک مشاعرے میں سنا اور یہ کئی برس کی بات ہے تو ان کی شاعری کے اسی پہلو نے مجھے بے حد

متاثر کیا اور یہ تاثر کوئی وقتی تاثر نہیں تھا۔ یہ تاثر اس وقت بھی رہا جب کبھی کبھار ان کی کوئی غزل یا نظم سننے یا پڑھنے کو ملتی تھی، خواہ پاکستان میں ہوں، متحدہ عرب امارات میں، یا ہندوستان میں اور اس وقت بھی برقرار ہے جب ان کا مجموعہ کلام مطبوعہ صورت میں ''تند ہوا کے جشن میں'' میرے سامنے ہے اور واشنگٹن سے شکاگو، شکاگو سے لاس اینجلس، لاس اینجلس سے اٹلانٹا اور اٹلانٹا سے میامی میں اسے اپنا رفیق سفر بنائے ہوئے ہوں۔ اور اس وقت جب کہ میامی میں اس پر کچھ لکھنے بیٹھا ہوں تو یہ صرف میری نظر کے سامنے ہی نہیں ہے بلکہ میرے دل میں بھی اتر چکا ہے۔ دراصل پیرزادہ قاسم نے اس مجموعے کی بلکہ اس کے مسودے کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی کراچی کے ایک سفر میں مجھے عنایت کی تھی۔ اس وقت اس کا نام انہوں نے ''ایک دیا بجھا ہوا'' رکھا تھا۔ ایک دیا بجھا ہوا ان چار لفظوں میں شدت احساس اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن خدا بھلا کرے ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کا جن کے مشورے سے پیرزادہ قاسم نے اس شدت احساس سے لبریز عنوان والے مجموعے کا نام ''تند ہوا کے جشن میں'' رکھا۔ تند ہوا کے جشن کا رشتہ بھی دیے ہی سے ملتا ہے۔ تند ہوا دیے کو بجھا بھی دیتی ہے لیکن دیے کے تعلق سے تند ہوا کے جشن کا جواز یہ ہے کہ دیا پھر روشن ہو جاتا ہے۔ تند ہوا اسے پھر بجھاتی ہے اور وہ پھر جگمگا اٹھتا ہے اور فن کار کا کمال یہی ہے کہ تند ہوا کے جشن کے باوجود اس کا دیا روشن رہے۔ اقبال نے کیا عمدہ کہا ہے:

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیے ہیں انداز خسروانہ

یہاں میں ایک ضمنی سی بات کا ذکر کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں نے اپنے تازہ ترین مجموعہ کلام کا نام جو میری پروف ریڈنگ کے انتظار میں ہے ''بجھتا ہوا چراغ'' رکھا ہے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ پیرزادہ قاسم نے اپنے مجموعہ کلام کا نام ''ایک دیا بجھا ہوا'' کی جگہ ''تند ہوا کے جشن میں'' رکھا ہے تو مجھے پرانی نسل اور نئی نسل کے درمیان فکری ہم آہنگی بہت بھلی لگی کہ پیرزادہ قاسم نے اپنے مجموعہ کلام ''ایک دیا بجھا ہوا'' کی جگہ زیادہ معنویت سے لبریز نام ''تند ہوا کے جشن میں'' پسند کیا ہے۔ اور میں نے اگرچہ میں عمر کے اس حصے میں ہوں جب کہ فکر و نظر کے چراغ بجھنے کے قریب ہیں، اپنے چراغ کو بجھتا ہوا چراغ کہا ہے، ''بجھا ہوا چراغ'' نہیں کہا تو میرے دل سے پیرزادہ قاسم اور ان کی شاعری کے لیے دعا نکلی کہ خدا کرے ان کے فکر اور سخن کا دیا ہمیشہ تند ہواؤں کی زد میں رہے اور ہمیشہ پہلے سے زیادہ روشنی بھی پہنچاتا رہے اور گرمی بھی۔

تو کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ چند سطور قبل ماحول کے اتار چڑھاؤ اور یہ اتار چڑھاؤ پیدا کرنے والی امواج زیریں کا ذکر جو میں نے کیا ہے وہ کہیں اپنے تناظر کے اجلے اندھیرے اور کہیں اس کی دھندلی روشنی سمیت پیرزادہ قاسم کی شاعری میں اس طرح ڈھل گئے ہیں کہ پس منظر کو منظر نامے سے الگ کر کے دیکھنا دشوار ہو گیا ہے۔ میں نے ہندوستان اور پاکستان کی سیاست کی ''روشنی'' میں دونوں ملکوں کے ''دانشوروں'' کے اس خیال پر تبصرہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنے اپنے ملکوں کے مسائل کی ذمہ داری دوسرے ملکوں پر ڈالتے ہیں اب دیکھئے اس اہم مسئلے کو پیرزادہ قاسم نے کس نظر سے دیکھا ہے۔ لیکن اتنی ہی اہم بات یا اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ انداز نظر خیال بنتے ہی کس طرح خالص شاعری میں تبدیل ہو گیا ہے۔

یہ سوچتے ہیں کب تلک ضمیر کو بچائیں گے
اگر یونہی جیا کیے ضرورتوں کے درمیان
عجب ہنر ہے کہ دانشوری کے پیکر ہیں
کسی کا ذہن کسی کی زباں لیے پھریے

اور پھر

دست نادیدہ کی تحقیق ضرور ی ہے مگر
پہلے جو آگ لگی ہے وہ بجھا دی جائے
بہت ہم کو رلایا ماضی و امروز نے سو اب
نشاط گریہ ایسا ہے کہ مستقبل پہ روتے ہیں
غبار بارود، رقص شعلہ دھمال میزائیلوں کا پیہم
یہ کیسا منشور امن عالم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے

میں نے ابھی ان اشعار کا ذکر کرنے سے قبل انہیں خالص شاعری سے تعبیر کیا ہے میں دراصل خالص شاعری یا خالص آرٹ کی ترکیب استعمال کرتے ہوئے ڈر جاتا ہوں کیونکہ ایک بار ماسکو کے ایک سیمینار میں ایک مقالہ نگار نے خالص آرٹ کے ساتھ ناخالص مقاصد کی ترکیب وابستہ کر دی تھی۔ ان کے مقالے کا عنوان یہ تھا:

Pure Art with Impure Aims

میں نے جواب میں میر، غالب، اقبال کے کلام سے مثالیں پیش کی تھیں کہ خالص آرٹ خالص مقاصد کا حامل بھی ہو سکتا ہے لیکن بعض حضرات کو ان شعرا کے خالص مقاصد بھی ناخالص نظر آئے تاہم میرا نظریہ تو ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ مقصدی شاعری کے معنی ہی یہی ہیں کہ مقصد خالص بنتا چلا جائے۔ مقصد فن پر حاوی نہ ہو بلکہ فن مقصد پر حاوی ہو۔ ہماری خالص شاعری میں کہیں کہیں ناخالص مقاصد لازم و ملزوم ہیں۔ میں نے اوپر پیرزادہ قاسم کی شاعری سے صرف چند اشعار مثال کے طور پر پیش کیے ہیں جنہیں میں خالص شاعری اور خالص مقاصد کا امتزاج سمجھتا ہوں۔ اس قسم کے خوبصورت امتزاج سے ''تند ہوا کے جشن میں'' کے اوراق جگمگا رہے ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال اور پیش کرتا ہوں۔

بساط زندگی تو ہر گھڑی بچھتی ہے اٹھتی ہے
یہاں پر جتنے خانے جتنے گھر ہیں
سارے
خوشیاں اور غم انعام کرتے ہیں

یہاں پر سارے مہرے
اپنی اپنی چال چلتے ہیں
کبھی محصور ہوتے ہیں، کبھی آگے نکلتے ہیں
یہاں پر شہ بھی پڑتی ہے
یہاں پر مات ہوتی ہے
کبھی اک چال ٹلتی ہے
کبھی بازی پلٹتی ہے
یہاں پر سارے مہرے اپنی اپنی چال چلتے ہیں
مگر میں وہ پیادہ ہوں
جو ہر گھر میں
کبھی اس شہ سے پہلے اور کبھی اس مات سے پہلے
کبھی اک برد سے پہلے کبھی آفات سے پہلے
ہمیشہ قتل ہو جاتا ہوں

لیکن شاعری میں غم دوراں ہی سب کچھ نہیں ہے۔ غم جاناں اور غم ذات کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا میرا تو غم دوراں کے بارے میں بھی یہ خیال ہے کہ جب تک وہ شاعر کے دل میں اتر کر اس کے اپنے مزاج اور شخصیت کا حصہ نہیں بن جاتا وہ شعر کا جادو نہیں بن سکتا۔ میں جب ''بال جبریل'' میں نظم ''مسجد قرطبہ'' پڑھنے کے بعد مسجد قرطبہ کو دیکھنے کے لیے ۱۹۶۲ء میں اسپین گیا تو مسجد قرطبہ پر نظر ڈالتے ہی پہلا تاثر میرا یہ تھا کہ یہ وہ مسجد قرطبہ نہیں ہے جسے دیکھ کے اقبال نے نظم کہی ہے بلکہ یہ مسجد قرطبہ جب آنکھوں کے راستے اقبال کے دل میں اتری اور وہاں سے باہر کاغذ پر آئی تو وہ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کا روپ دھار چکی تھی۔ اس وقت تک رکے کی تحریر میری نظر سے نہیں گزری تھی کہ شاعر جب کسی درخت کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک درخت اگنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور جب ان کی یہ تحریر میری نظر سے گزری تو اپنے خیال کی صداقت کا مجھے اور زیادہ یقین آ گیا کہ:

یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

خیر ان چند جملوں کو آپ جملہ معترضہ ہی سمجھئے میں دراصل پیرزادہ قاسم کی شاعری کے ایک اور پہلو کی جانب اشارہ کر رہا تھا اور وہ پہلو ہے روایت سے ان کی گہرے لگاؤ کا پہلو۔ روایت کے ساتھ ان کے اس تعلق کو روایت پرستی سمجھنا غلط ہوگا۔ یہ وہ تعلق خاطر ہے جو ہر لحہ روایت کو آگے بڑھانے کا متمنی ہوتا ہے۔ دراصل پیرزادہ ہمارے ان شعراء میں ہیں جنہوں نے روایت اور جدت میں ایک ایسا رابطہ قائم کیا ہے جو اردو شاعری کے لیے ایک نیک فال کی حیثیت رکھتا ہے۔ ورنہ جس دور میں پیرزادہ قاسم نے شاعری شروع کی وہ دور اصطلاحی جدید شاعری کی زد میں تھا۔ یہ تو ان کی انفرادیت تھی جو انہیں اس سیلاب سے بچا لے گئی ورنہ اس دور میں تو اصطلاحی جدید شعراء کا پلڑا ''بھاری'' تھا۔ اپنے اس خیال کی وضاحت میں شاید پیرزادہ قاسم کے ان اشعار سے کر سکوں گا:

شکست دل میں بھی ایک زندگی نظر آئی
دیا بجھا تو ہمیں روشنی نظر آئی
لہولہان ہوئے سنگ دوستاں سے تو آج
دیار جاں میں بھی رونق نئی نظر آئی
وہ رکھ رکھاؤ نہ دیکھا دیے کے جلنے میں
جو اس کے بجھنے میں شائستگی نظر آئی
کبھی ہوا تو کبھی خاک رہگزر ہونا
مرے نصیب میں لکھا ہے در بدر ہونا
قدم اٹھے بھی نہیں اور سفر تمام ہوا
غضب ہے راہ کا اتنا بھی مختصر ہونا
قرار غم زدگاں کیا یہی کہ رو لینا
بجھے جو زخم تو نشتر نیا چبھو لینا
پھر قافلہ یادوں کا ٹھہر جاتا ہے اور پھر
وہ اس سے بچھڑ جانے کا منظر متواتر

شاعری کی دلکشی میں حسن بیان کا بڑا حصہ ہے۔ اگرچہ حسن بیان کی تعریف کرنا میرے لیے خاصا مشکل ہے لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ صوتی آہنگ بھی ایک طرح کا حسن بیان ہے اور فکر کو جذبہ بنانے کا عمل بھی حسن بیان پر آ کر منتج ہوتا ہے۔ الفاظ کا تخلیقی استعمال بھی حسن بیان کا ایک پہلو ہے اور ماورائے سخن بھی ہے اک بات، بھی۔ ان وضاحتی بیانوں میں کسی کو بھی قطعی قرار دیے بغیر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ پیرزادہ قاسم کے کلام کی دلکشی ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کی تفسیر ہے۔ اس میں صوتی آہنگ کی دلاویزی بھی ہے اور فکر کو جذبہ بنانے کا تاثر بھی ہے۔ الفاظ کا تخلیقی استعمال بھی اس میں جادو جگا رہا ہے اور ماورائے سخن والی بات بھی دلوں کو چھو رہی ہے۔ لیکن ایک اور خصوصیت جس کا ذکر میں نے ابھی تک نہیں کیا ہے وہ پیرزادہ کے یہاں بھی ردیفوں کے استعمال کا حسن ہے۔ ہماری اردو شاعری میں بھی ردیفیں ذوق اور شاہ نصیر کی بدولت خاصی استوار ہو چکی ہیں خدا تو بھلا کرے اقبال کا کہ انہوں نے طویل ردیفوں کو اس انداز سے چھوا ہے کہ وہ آسمان تک پہنچ گئی ہیں، خواہ وہ ردیفیں ''مسجد قرطبہ'' میں آئی ہوں خواہ ''ذوق و شوق'' میں۔ اب اقبال کی روایت کو برقرار رکھنا اور اسے آگے بڑھانا ہر فنکار کے بس کی بات نہیں۔ پیرزادہ قاسم نے اس ضمن میں اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے اور ہماری شاعری کو ایسی خوبصورت اور طویل ردیفیں دی ہیں جن کی تازگی، شگفتگی دلربائی اور دلآویزی اردو غزل کی ایک متاع جاوداں بن گئی ہے۔

خون سے جب جلا دیا ایک دیا بجھا ہوا
پھر مجھے دے دیا گیا ایک دیا بجھا ہوا
کوئی ہے جو شکست ضبط غم ہونے نہیں دیتا

میں رونا چاہتا ہوں اور وہ رونے نہیں دیتا
میان کارفن لفظوں کی قسمت جاگ اٹھتی ہے
غزل تخلیق کرتا ہوں محبت جاگ اٹھتی ہے
کدرتوں کے درمیان عداوتوں کے درمیان
تمام دوست اجنبی ہیں دوستوں کے درمیان
سفر نصیب ہیں ہم کو سفر میں رہنے دو
سفال جاں کو کف کوزہ گر میں رہنے دو
میرے کام بہت آتا ہے اک انجانا غم
روز خوشی میں ڈھل جاتا ہے اک انجانا غم
چاند بھی بجھا ڈالا دل دکھانے والوں نے
کچھ اٹھا نہیں رکھا دل دکھانے والوں نے
کار خلوص یار کا مجھ کو یقین آ گیا
اتنا شدید وار تھا مجھ کو یقین آ گیا
کسی نے ایک حرف زیست پیہم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے
سو میں نے بھی اپنا شجرہ غم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے
یہ جو دل بہ دل اب تک یاریاں بہت سی ہیں
خوش گمانیاں شاید درمیاں بہت سی ہیں
روح گر نوحہ کناں ہو تو غزل ہوتی ہے
دل کو احساس زیاں ہو تو غزل ہوتی ہے

طویل ردیفوں کے ذکر میں جس قدر اشعار میں نے اوپر نقل کیے ہیں یہ میرا انتخاب نہیں ہے۔ میں نے صرف چند مطلعے نقل کر کے اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے اگر انتخاب کرتا تو اس طرح کے بیسیوں اشعار جن میں سے بعض میں نیچے رقم کر رہا ہوں نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔

سب مری روشنی جاں حرف سخن میں ڈھل گئی
اور میں جیسے رہ گیا ایک دیا بجھا ہوا
عجب دیکھا کرشمہ لفظ کی بازی گری کا بھی
سخن معدوم ہو جاتا ہے شہرت جاگ اٹھتی ہے
غبار بارود، رقص شعلہ دھمال میزائیلوں کا پیہم
یہ کیسا منشور امن عالم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے
دست نادیدہ کی تحقیق ضرور ہے مگر
پہلے جو آگ لگی ہے وہ بجھا دی جائے

کسی بھی شاعر کے کلام پر مضمون لکھتے وقت ردیف یا قافیے کو موضوع بحث بنانے کا دور اب گزر چکا ہے۔ ہماری نئی تنقید اب ان ''فروعی'' امور سے آگے نکل گئی ہے لیکن میں علامہ اقبال کا مقلد ہوں اور ان کے اس مصرعے کو کہ:

نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

انہی معانی میں استعمال کرتا ہوں جن معانی میں خود اقبال نے استعمال کیا ہے۔ یعنی ردیف کی بات تو دور کی بات ہے۔ میں تو مصرعے یا شعر میں ایک لفظ کے استعمال کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہوں کیونکہ لفظ جب لغت سے نکل کر ایک فنکار کے ہاتھ میں آتا ہے تو وہ محض لغت کا لفظ نہیں رہتا بلکہ ایک فن پارے کی اس طرح تشکیل کرتا ہے جس طرح ساز کا ایک سر پورے نغمے کی تشکیل کرتا ہے۔ اس سلسلے میں فلابیئر نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ لکھنے والے کا قلم لفظ کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے، اور پیرزادہ قاسم کے یہاں لفظ کے تخلیقی استعمال نے لفظ کو جس طرح رموز و ملائم کا آئینہ خانہ بنایا ہے اسے دیکھ کر فلابیئر کی بات پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

''مختلف شعری لحن''

انہوں نے اپنی تخلیقی اور شاعرانہ لے کو ایسا رنگ دے دیا ہے کہ ان کی شاعری دوسرے ہم عصر شعراء سے بہت الگ ہو گئی ہے۔ اتنی الگ کہ ہم ان کی شاعری کو شعری مجموعوں کے بڑے بڑے انبار میں بھی بہت آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

○○
○

''جذبۂ خاک پروری''

جون ایلیا

(●)

میں جب کراچی آیا تو میں نے حلقۂ اربابِ ذوق اور اس کے بدذوق اور نافرجام وارثوں یعنی جدیدیت پسند شاعروں اور ناقدوں سے جو ہرزہ سرائی بار بار سنی وہ یہ تھی کہ کوئی شریف آدمی بڑا شاعر یا اچھا شاعر نہیں ہو سکتا۔ اس طائفے کی ژاژ خائی اور یاوہ اندیشی آج بھی وہی ہے۔ میں اس طائفے کو ابداعی سیرت اور تخلیقی آداب سے اشتعال انگیز حد تک محروم پاتا ہوں۔

یہ لوگ انیسویں صدی کے فرانسیسی شاعر میلارمے، انگلستانی شاعر بائرن اور بیسویں صدی کے فرانسیسی شاعر ژاں ژینے سے بری طرح متاثر ہیں۔ ذہنی طور پر یہ جنایت کوش، جرائم پیشہ اور جاہل مطلق غول فکری فعل وافعال اور فنی نظام جمال کے ادراک سے المناک حد تک محروم ہے۔ میرا بس چلے تو میں ان کے سر منڈوادوں اور ان کے چہروں پر کالک مل کے ان کو گدھوں پر بٹھادوں اس طرح کہ ان میں سے ہر ایک کی پیٹھ گدھے کے منہ کی طرف ہو اور ان کا منہ گدھے کی دم کی طرف۔

میں نے ان جانداروں سے اکثر یہ پوچھنا چاہا کہ کیا مہاکوی کالیداس اور شاعرِ شاعراں رودکی غیر شریف آدمی تھے؟ کیا فردوسی ایک شریف ترین اور لطیف ترین کردار کا مالک نہیں تھا۔ وہ غریب فردوسی جو محمود غزنوی جیسے قاہر سلطان کی بدعہدی پر برافروختہ ہو کر دیناروں کے بجائے اس کے ''بخشے ہوئے'' درہموں کی حمّامیوں اور فُقاعیوں میں لٹا کر غزنی سے خالی ہاتھ رخصت ہو گیا تھا۔ کیا شیخ سعدیؔ، حافظؔ، عرفیؔ، نظیریؔ، تلسی داس، رحیمنؔ، ولی دکنی، میرؔ، نظیرؔ، غالبؔ اور انیسؔ بائرن میلارمے اور ژاں ژینے کسی طرح کے بے حس اور لوفر تھے؟ یہاں ''بے حس'' کے مرکب کو بنیادی حیثیت اور اہمیت حاصل ہے ورنہ خوش فعلی کی حد تک ''لوفر'' ہونا کوئی بری بات نہیں۔

شام ہے اور میرے حسابوں حسبِ دستور ایک اُداس شام ہے۔ شام اور میں، میں اور شام۔ شام سے میرا ایک عجیب خیالی اور ملالی رشتہ ہے۔ اور پیرزادہ قاسم کے مجموعہ کلام ''تند ہوا کے جشن میں'' کے احساس آگیں مطالعے نے میرے اس خیال اور ملالی رشتے کو اور بھی ماجرا ناک بنا دیا ہے۔ میرا یہ سلسلۂ خیال وتعال قاسمؔ کی شخصیت اور شاعری کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے ایک فعّال انفعال کا نتیجہ ہے۔ قاسم ایک شائستہ ترین اور شریف ترین شہری اور ایک شائستہ ترین اور نفیس ترین شاعر ہیں۔ اگر ایک دل انگیز اور جاں آں شائستگی کسی شخص کے وجود میں صورت پذیر ہو تو وہ قاسمؔ جیسے کسی شخص کا سراپا شاعر قسم کے کسی شخص کا اخلاقی وجود ہوگا۔

قاسم علم وعرفان کے برگزیدہ حاملوں رہنماؤں، ادیبوں، مفکّروں اور شاعروں کے ایک ارجمند ترین خانوادے کے رکن ہیں۔ میں یہاں اس خانوادے کے چند اکابر کے نام لینا چاہتا ہوں جو یہ ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن، حافظ ابراہیم، ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری، حضرت نہال سیوہاروی، ریاض بھائی (ڈاکٹر ریاض الاسلام) اور خورشید بھائی (ڈاکٹر خورشید الاسلام) وغیرہم۔

میں نے قاسمؔ کے خون اور خانوادے کا ذکر اس لیے کیا کہ میں کسی شاعر کی شاعری کو سمجھنے کی طرح سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اس کا جینیاتی (Genetical) مطالعہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا قاسم ایک عالی شان تہذیبی روایت کے وارث ہیں۔ اس عالی شان تہذیبی روایت کی تخلیقی کارفرمائی ہمیں ان کی شاعری میں ایک فرخندہ طور وطراز کے ساتھ حال انگیز نظر آتی ہے۔ میں نے ان کے ماضی اور اُن کے خانوادے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی شاعری کے اقداریاتی مزاج، اس کی احساساتی نہاد، اس کی تخیلاتی جذباتی اور فکری افتاد اور اس کے فنّی اور جمالیاتی مبدو معاد سے غیر متعلق ہو کر نہیں لکھا۔ اور اس طرح میں نے ان کی تہ دار شاعری کی فہم کے سلسلے میں قارئین کے ساتھ ایک قابلِ لحاظ تعاون کیا ہے۔

شاعر حضرات عام طور پر ''تلامیذ الرحمٰن'' ہوتے ہیں یعنی یہ باعظمت نفوس پڑھے لکھے نہیں ہوتے (یعنی عام طور پر) راقم الحروف بھی چشم بدور وچشم بدبیں دور شاعر حضرات کے اسی باعظمت گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ بھلا ''اس سے کیا کسر شان میں آئی'' مگر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم شاعروں کی اس اقلیت کے فرد واقع ہوئے ہیں جو صاحبِ علم وفضل ہے۔ وہ اپنی تعلیم کے لحاظ سے مغربی اور تہذیبی لحاظ سے از سرتاپا مشرقی ہیں۔ ان کی شخصیت کی اس پُر مایہ ثنویت نے ان کی ابداعی ذات میں ایک عجب فردمند وحدیت پیدا کی ہے جو ان کی شاعری کی تہہ داری کا قبول ہے۔ وہ ایک عالم آدمی ہیں اور میں تو انہیں عارف بھی سمجھتا ہوں۔ یوں بھی وہ علم وعرفان کے برگزیدہ حاملوں کے وارث ہیں۔ علم وعرفان پر مجھے قاسمؔ کے ان جدِ عظیم کا خیال آ گیا ہے جن کی ہمنامی قاسم کے لیے وجہِ شرف ہے۔ میرا اشارہ امام الحرمین حضرت قاسمؓ ابنِ حضرت محمدؒ ابن حضرت ابوبکرؓ کی طرف ہے۔

میں نے سالہا سال پہلے ایک مثنوی کہی تھی جس میں حضرت قاسمؓ اور اُن کے بزرگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہاں میں یہ عرض کر دوں کہ حضرت قاسمؓ کی دخترِ طاہرہ حضرت امّ فروہ فاطمہ اثنا عشریوں کے پانچویں امام حضرت امام محمد باقر کی اہلیہ اور چھٹے امام حضرت جعفر صادق کی والدہ تھیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ قاسم علم وعرفان کے برگزیدہ حاملوں کے وارث ہیں اب رہی خود ان کی حیثیت تو وہ ایک عالم شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت میں علم اور شائستگی کا خجستہ ترین امتزاج پایا جاتا ہے ان کی شائستگی نے ان کی شاعری کو

ایک فرخندہ جمال عطا کیا ہے۔''شائستگی'' کے لفظ پر مجھے ان کا ایک شعر یاد آ گیا۔

وہ رکھ رکھاؤ نہ دیکھا دیے کے جلنے میں
جو اس کے بجھنے میں شائستگی نظر آئی

بجھنے کی شائستگی اُسی شاعر کو نظر آ سکتی ہے جو سکرات کی حالت میں بھی حسن تلاش کرنے کی جرأت رکھتا ہو۔اور قاسم میں یہ نادر الوجود جرأت پائی جاتی ہے۔

قاسم احساس تفعل، تخیل اور جذبے کی مجموعیت کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا زندگی کی صرف چند جہتوں سے تعلق نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کی تمامیت کو اپنے فن کا مواد بناتے ہیں۔اس دور کی شاعری مجموعیت (Totality) اور کلیّت (Universality) سے یکسر عاری ہو کر رہ گئی ہے۔ بہر حال قاسم کے چند شعر سنیئے اور انہیں احساس تخیل اور جذبے کے ساتھ محسوس کیجیے:

طلوع ذات سے لے کر غروبِ ہستی تک
بس اک سفر ہے تمنا سے نا امیدی تک

آساں کی بیگاریں کچھ زمیں کی بیگاریں
ہم سے ناتوانوں نے بوجھ اٹھائے ہیں کیا کیا

''طلوعِ ذات سے لے کر غروبِ ہستی تک'' سفر ''تمنا سے'' ''ناامیدی تک'' کا سفر ہے تو کیا یہ زندگی کی ایک عذاب ناک حقیقت نہیں ہے، ایک کلّی حقیقت؟

آساں کی بیگاریں کچھ زمیں کی بیگاریں
ہم سے ناتوانوں نے بوجھ اٹھائے ہیں کیا کیا

ظاہر ہے کہ یہاں ''ہم سے ناتوانوں'' سے نوع انسانی مراد ہے جو لحہ لحہ اپنے اساطیری عقائد، منظم مذاہب اور عمرانی اور سیاسی معاملات کی نسبت سے اپنے وجود کے ایک ہمت شکن ابتداء سے دوچار رہی ہے اور آج بھی اس کی مشقت برداشت کر رہی ہے۔

اس نے اپنے ذوق کی تسکین چاہی اور پھر
کائناتِ زیست کو صورت نئی بخشی گئی

اس شعر پر آپ کو یہ ارشاد ضرور یاد آیا ہوگا ''کُنت کنزاً مخفیاً فاحببت اَن اُعرفَ فخلقت الخلق''

بے کراں اک تیرگی کو روشنی بخشی گئی
خاک کو تاثیر دی اور زندگی بخشی گئی

''بے کراں تیرگی''۔''روشنی بخشی گئی'' اور ''زندگی بخشی گئی'' اس شعر میں قاسم نے اپنی سائنسی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کونیاتی (Cosmological) آگہی سے ایک کیفیت انگیز استفادہ کیا ہے۔ یہ شعر کونیات (Cosmology) سے سکہ بند تعلق ہے مگر کونیات سے ایک سکہ بند تعلق رکھنے کے باوجود قاسم نے اس شعر کی شعریت میں کوئی کمی نہیں کرنے دی بلکہ اسے فزوں کیا ہے۔اس موقع پر شعر و شاعری کے موضوع سے قطع نظر کرتے ہوئے میں اس شعر کے بارے میں ایک ضمنی مگر اہم بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اس شعر میں قاسم نے ظہور کائنات کی کھربوں اور سنکھوں برس کی تاریخ رقم کر دی ہے۔

زمان (Time) قاسم کے لیے بالکل میری طرح ایک نہایت خیال انگیز ابداعی محرّک کی حیثیت رکھتا ہے۔زمان یا وقت نے عظیم عالمی شاعری میں ایک بے حد فکر خیز اور احساس پرور کردار ادا کیا ہے۔ یہاں مجھے فیضؔ کا ایک شعر یاد آ گیا ہے نہ جانے کیوں؟

امروز نہ شاعرِ حکیم دانندۂ حارث وقدیم

اب زمان کے تعلق سے قاسم کے چند شعر سنیے۔ یہاں میں یہ ضرور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ تقریباً چھٹی صدی قبل مسیح کے یونانی فلسفیوں کے حلقوں سے لے کر بیسویں صدی کے فلسفیوں کے حلقوں تک ''زمان'' کے مسئلے کو ایک مہتم بالشان مسئلے کا مرتبہ حاصل رہا ہے۔زمان کو آئن سٹائن نے ''بعد رابع'' (Forth Dimention) قرار دیا ہے۔ اس فلسفیانہ اور سائنسی مسئلے کو قاسم نے اپنی ابداعی کارگزاری کے ساتھ غزل کا موضوع بنایا ہے اور اپنی احساس آگینی، جذبہ پردازی اور فنی سحر کاری کے ذریعے اسے دل و جاں کا معاملہ بنا دیا ہے۔

یہ حادثہ مجھے حیران کر گیا سر شام
جو زخم صبح ملا تھا وہ بھر گیا سر شام
ملے تھے ہم کہیں کار جہاں کے میلے میں
اسے بھی جلدی تھی اور میں بھی گھر گیا سرِ شام
خیالِ یار کی فرصت بھی اب کسے نہیں نصیب
یہ پھول صبح کھلا اور بکھر گیا سرِ شام

دل و جاں کے ابدی اور جاودانی رشتوں کی نسبت سے کیا یہ ''حادثہ'' حیران کن ترین نہیں ہے کہ محبت کا جو ''زخم''، ''صبح'' لگا ہو وہ ''سرِ شام'' بھر جائے۔اور اس کے بعد کچھ اور وقت گزر جائے اور دل و جاں ''کارِ جہاں کے میلے میں'' اتفاقاً کہیں مل جائیں اور دونوں یکسر بے روح آدابِ ملاقات ادا کرنے کے بعد عجلت کے ساتھ بروقت اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف روانہ ہو جائیں اور جبرِ وقت بات کو یہاں تک پہنچا دے کہ ''خیالِ یار کی فرصت'' بھی نصیب نہ ہو۔زمان یا وقت اور جبر وقت کے سلسلے میں چند شعر اور سنیے:

ہے جبر وقت کا قصّہ عجب سنائے کون
میں یاد اس کو کروں اور یاد آئے کون

وہ فرصتیں گئے دنوں کی یاد کیا دلائیے
زمانہ تیز رَو ہے اب شکست مان جائیے
وہ آستانِ یار تو گئے دنوں کی بات ہے
یہ شاہراہِ وقت ہے سو بوریا اٹھائیے

ان شعروں میں قاسم نے دانش کو دل اور دل کو دانش بنا دیا ہے۔ بلکہ شاید یوں سخن کرنا چاہیے کہ احساس اور اظہار کا یہ وہ ماجرا ناک مرحلہ ہے جہاں شعور کیفیتوں اور حالتوں سے شہیدانہ معاملت کر رہا ہے۔ جبر وقت کی یہ کیسی سفّاکی ہے کہ یادِ تو غنیرہ کو کیا جا رہا ہو اور یادِ سمیرا آ رہی ہو۔ لمحے لمحے کے رشتے ہیں جو جوڑے جا رہے ہوں اور ٹوٹے جا رہے ہوں۔ جابر و قاہر زمان ہے جو دل و جاں کی کائنات میں اپنے فیصلے نافذ کر رہا ہے۔ سو جو معاملہ پیش آنا ناگزیر ہے وہ یہ ہے کہ:

وہ فرصتیں گئے دنوں کی یاد کیا دلائیے
زمانہ تیز رَو ہے اب شکست مان جائیے

وقت یا شعورِ وقت کا شاعر مسلسل سفّاکی پر کاربند ہے۔ کیا دل اور کیا دلدار، کیا جبیں اور کیا ''آستانِ یار''۔ وقت ہی وقت ہے اور ''شاہراہِ وقت ہے'' ''سو بوریا اٹھائیے''۔

ان شعروں میں قاسم نے اپنی ابداعی دانش کو دل اور دل کو دانش بنا دیا ہے۔ یہ ہے وہ شاعری جو فلسفے کی اکادمی میں جا کر اسے معزول کر دیتی ہے اور اس کی جگہ خود ممکن ہو جاتی ہے۔ میں ایک اچھے خاصے شاعر کی حیثیت سے قاسم کے ان فکر انگیز احساس خیز جذبہ ریز اور خیال بیز شعروں پر صرف رشک ہی کر سکتا ہوں۔

قاسم کی غزلوں میں ہمیں ایک خاص طورِ احوال ملتا ہے۔ یہ ایک ایسا طورِ احوال ہے جس میں شاعری کے چاروں بُعد یعنی احساس تخیل تعقل اور جذبہ واقعہ پرور دکھائی دیتے ہیں۔ یہ طورِ احوال ذات، غیر ذات، وصال، فراق، ان کی نفری، ماضی، حال، دل اور دنیا سبھی کچھ کو محیط ہے

حجرۂ ذات سے باہر تو نکل کر دیکھو
تم کسی دوسرے پیکر میں بھی ڈھل کر دیکھو

بے حسی کی دنیا سے دو سوال میرے بھی
کب تلک جائے اور کیوں جیا جائے

''بے حسی کی دنیا سے'' یہ ''دو سوال'' معاشرے کی تاریخ کا ایک فرد بھی کر سکتا ہے اور پورا معاشرہ بھی ہے کہ نہیں؟

دائرہ وار تھا سفر عشقِ جنوں صفات کا
ہجر و وصال کچھ نہ تھا مجھ کو یقین آ گیا

گروہِ عاشقاں تھا شہرِ گریہ اُن کی منزل تھی
یہ رستے بھر بھی روتے آئے اب منزل پہ روتے ہیں
اگر چلو تو مرے ساتھ ہی چلو لیکن
کٹھن سفر سے زیادہ ہے ہمسفر ہونا

''تند ہوا کے جشن میں'' کا شاعر اپنے طورِ احوال میں کبھی کبھی ''دل کی دھڑکن'' سے بھی غور و غوض کے ساتھ معاملت کرتا ہے۔

درد ہے کہ نغمہ ہے فیصلہ کیا جائے
یعنی دل کی دھڑکن پر غور کر لیا جائے

قاسم اپنی نہاد اور افتاد میں نہایت بے ضرر آدمی ہیں۔ اگر اُن کا کوئی ہم نشیں قدرے اداس ہو تو وہ خندۂ زیرِ لب کو بھی اپنے اوپر حرام سمجھتے ہیں۔ انہوں نے شاید ہی کبھی کسی ''جاندار'' کو ٹھیس پہنچائی ہو۔ مگر اپنی شاعری میں یہ بے ضرر ترین جوان جابہ جا بے نہایت سفّاک نظر آتا ہے، اس کے لہجے کی کاٹ! ارے توبہ۔ اس کی طنز کوشی، معاذ اللہ۔ آیئے اس سفّاک اور قاتلانہ حد تک طنز کوش شاعر سے ملیے:

زخم دیجے تو ایک نیا تیر چلا دیا کرو
دوستو! اپنا لطفِ خاص یاد دلا دیا کرو
ایک علاجِ دائمی ہے تو برائے تشنگی
پہلے ہی گھونٹ میں اگر زہر ملا دیا کرو
جذبۂ خاک پروری اور سکون پائے گا
خاک کرو ہمیں تو پھر خاک اڑا دیا کرو
شہر طلب کرے اگر تم سے علاجِ تیرگی
صاحبِ اختیار ہو آگ لگا دیا کرو

حرفِ سخن کیا کہ لوگ اتنے سخن سیر ہیں
رسمِ سماعت جو تھی وہ بھی اٹھالی گئی

اک سزا اور اسیروں کو سنا دی جائے
یعنی اب جرمِ اسیری کی سزا دی جائے

ہم ان کی غزل کی ساختاں (Structure) میں ایک کرشمہ کار جمالیاتی دروبست کو کیفیت آفریں پاتے ہیں۔ یہ کیفیت آفرینی معنی آفرینی سے بہت آگے کا معاملہ ہے۔ اور کیفیت تو یوں بھی معنیٰ سے کہیں زیادہ برتر حقیقت ہے۔

کیا یہی اشک ندامت ہے جو رخشندہ ہے
آپ کی جان سے دور آپ کی مژگاں کے قریب

اک خنک موج صبا کے مانند
کوئی آیا ہے حیا کے مانند

رنگ نہیں سہو سہی رونقِ فصلِ جاں تو ہے
گل نہ سہی مگر بہار زخم تو کچھ کھلا گئی
دل زدگاں کے قافلے دور نکل چکے تمام
ان کی تلاش میں نگاہ اب جو گئی تو کیا گئی

ہوا کی شاخ پہ خوشبو کا ایک پھول کھلا
یہ کارِفن تھا سو اس میں ہمیں زمانے لگے

''اشک ندامت ہے جو رخشندہ ہے'' ''آپ کی جان سے دور۔۔'' ''خنک موج صبا'' ''۔۔۔حیا کے مانند'' ''۔۔۔رونقِ فصلِ جاں تو ہے'' ''گھر نہ سہی مگر بہار۔۔۔'' ''دل زدگاں کے قافلے''۔

آپ ان شعروں میں جو ایتلاف، انسجام اور آہنگ محسوس کریں گے وہ اس دور کے نمائندہ شاعری میں کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ یہ وہ جنس ہے جو سخن کی ہر دکان پر دستیاب نہیں۔

میں آخر میں ایک خاص بحر یعنی ''رجز مثمن مطوی نحبون'' کی نسبت سے ان کی شاعری کے بارے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ بحر ''تند ہوا کے جشن میں'' عجب سحر کاری کے ساتھ نور پرداز ہوئی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اس بحر میں فارسی اور اردو کے شاعروں میں سب سے زیادہ غزلیں میں نے اور قاسمؔ نے کہی ہیں۔ یہاں میں فیاضؔ غورث کی زبان میں یہ کہوں گا کہ ان کی شاعری میں (خاص طور پر اس بحر کے تعلق سے) ایک سیّاراتی آہنگ پایا جاتا ہے۔ سو اب میں قاسم کی ایک شہرۂ آفاق غزل کے چند شعر گنگنانا چاہتا ہوں جو اس بحر میں کہی گئی ہے۔

خون سے جب جلا دیا ایک دیا بجھا ہوا
پھر مجھے دے دیا گیا ایک دیا بجھا ہوا
ایک ہی داستانِ شب ایک ہی سلسلہ تو ہے
ایک دیا جلا ہوا ایک دیا بجھا ہوا
درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے مری بساط کیا ایک دیا بجھا ہوا
سب مری روشنیِ جاں حرفِ سخن میں ڈھل گئی
اور میں جیسے رہ گیا ایک دیا بجھا ہوا

ارسطو نے کہیں کچھ اس قسم کا کلام کیا ہے کہ شاعری تاریخ سے کہیں زیادہ مستند تاریخ ہے۔ اس غزل میں شاعر نے اپنے معاشرے کی جس چہار بُعدی (Fourth Dimentional) تاریخ کو رقم کیا ہے وہ احساس، تخیل، تعقل اور جذبے کی ایک نادر صورت گری ہے۔

''خون سے جب جلا دیا۔۔۔'' ''پھر مجھے دے دیا گیا۔۔۔''
''ایک ہی داستانِ شب'' ''ایک ہی سلسلہ۔۔۔'' ''درد کی کائنات میں۔۔۔''
''سب مری روشنی جاں۔۔۔'' ''اور میں جیسے رہ گیا۔۔۔''

اس غزل کا واحد متکلم کا ''میں'' ایک فرد کا ''میں'' نہیں ہے بلکہ ایک ارجمند معاشرے، زخم رسیدہ معاشرے اور ایک خجستہ مگر خوں گشتہ تہذیب کا ''میں'' ہے۔

میں اس غزل کو ایک غزل سے زیادہ ایک تہذیبی گروہ، غلطیدہ بخوں گروہ کا مرثیہ قرار دیتا ہوں۔ ''خوں''۔ ''داستانِ شب''۔ ''درد کی کائنات'' ''اور میں جیسے رہ گیا۔۔۔''

اس غزل میں شاعر نے شاعری کو تاریخ کی تاریخ بنا دیا ہے۔ عمومی طور پر تاریخ وقوعوں کے ایک غیر ذاتی بیان سے عبارت ہے اور پیشہ ور مورخوں کے نزدیک یہی رویہ تاریخ نگاری کو ایک سائنس کا درجہ دیتا ہے لیکن یہ رویہ ارضیات، جمادیات، نباتیات اور حیوانیات کی تاریخ کی حد تک تو یقیناً بے حد مستند اور معتبر حیثیت رکھتا ہے لیکن انسانوں اور معاشروں کی نسبت سے اس روّیے کو بے روح، بے احساس، بے کیف اور بے حقیقت ہر زہ نگاری اور ایک عامیانہ پُر گفتاری کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

میں نے قاسمؔ کی غزلوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہت عاجلانہ طور پر لکھا ہے۔ بہر حال اب رہی قاسم کی نظموں کی بات تو میں ''بے بسی'' ''عشق کہانی'' ''یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے'' ''کل جو آنے والا ہے'' ''سفاری پارک'' اور ''انسان'' اس دور کی بہترین نظمیں ہیں۔ اختتام کلام کے مرحلے میں مجھے شدت کے ساتھ یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میں قاسمؔ کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کر سکا اور اس کی وجہ میری روزمرہ کی وہ صورت حال ہے جس میں انسان محض ایک عاجز جاندار بن کے رہ جاتا ہے۔ بہر حال میں قاسم کی شاعری کے ساتھ جو انصاف نہیں کر سکا اس کی تلافی شاید میرا یہ جملہ کر سکے کہ قاسمؔ میرا شاعر ہے۔

''شیشہ گری''

شاعری کا رگِ شیشہ گری ہے۔ غزل دراصل ایک شعری تہذیب ہے۔ اس کے لیے ذوقِ سخن، ریاضتِ فن اور فطری میلان شرطِ اوّلین ہے۔ بات کرنے کا سلیقہ، حسنِ معنوی سے مل کر شعری پیکر بن جاتا ہے۔ یہ خوبیاں اور یہ صلاحیتیں ہی شاعر کے مقام اور مرتبے کی ضامن ہوتی ہیں۔

پیرزادہ قاسم کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ ان میں یہ عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں ایک اچھے شاعر کی اس سے بڑھ کر پہچان اور کیا ہو سکتی ہے۔

مجروح سلطان پوری

''درد کی زمینوں میں''

شہزاد احمد

(●)

پیرزادہ قاسم جب اس دنیا میں آئے تو یہ دنیا اپنی سب سے بڑی تبدیلی سے ہمکنار ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی، عملی طور پر اس بات کا فیصلہ بھی ہو چکا تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں ہٹلر کامیاب نہیں ہو سکتا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا عفریت بھی اپنی صورت گری کا منتظر تھا جس نے بعد میں ہیروشیما اور ناگاساکی کو جلا کر راکھ کر دیا تھا اور کرۂ ارض کی مخلوق کو مکمل معدومیت کی خبر سنا دی تھی۔ یہی وہ لمحہ ہے جب دنیا کی تاریخ دو حصوں میں تقسیم ہوئی، ماضی اپنی خون آشامی کے باوجود بہت نتھرا نظر آتا ہے مگر مستقبل اپنی تمام تر ترقی اور خود شعوری کے باوصف ایک اندھے غار کی طرف رخ کیے ہوئے ہے۔

پیرزادہ قاسم ان دو زمانوں کے سنگم پر کھڑا ہے اور اس کے ہاتھ میں بیدار خیالی اور باضمیری کی مشعلیں ہیں، شعلوں کی اس لہراتی ہوئی روشنی میں اسے جو منظر نظر آ رہا ہے اسے ''تار دید دو رنگ'' ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ روشنی اور تیرگی کا محض تصادم نہیں ہے، بلکہ دونوں کی آمیزش سے بنا جانے والا ایک جال ہے جس کے اندر ہماری زمین ہی نہیں اور بھی بہت کچھ لپٹا ہوا ہے، ہمیں اپنے اردگرد جس قدر رنگ نظر آتے ہیں وہ انسانی ارتقاء کی بہت آخری منزلوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے دنیا صرف سفید اور سیاہ تھی، اور انسان اس وقت بھی اس سیاہ و سفید کا مالک نہیں تھا، آج بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ انسان نے تخریب ذات کے ساتھ ساتھ تخریب حیات کا ہنر بھی سیکھ لیا ہے۔

آج کی ترقی ایک ایسا جشن ہے جو تند ہوا میں برپا کیا گیا ہے، اس عمل کو ایک عظیم پیراڈوکس کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، ایک ایسا پیراڈوکس یا متفاقضہ جس میں سے کئی پیراڈوکس جنم لیتے ہیں، اب کوئی شے یقینی نہیں ہے ہر شے احتمالی ہے، امکانی ہے لہٰذا جب تک کوئی واقعہ وقوع پذیر نہ ہو جائے اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہا نہیں جا سکتا، پیرزادہ قاسم ایک طرف تو میر وغالب کی روایت سے رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ذہن میں جو مثالی معاشرہ آباد ہے اس کے سارے تعینات اپنی اپنی جگہ موجود ہیں، ان کا دوسرا رشتہ لمحۂ موجود کے حوالے سے جدید علوم کے ساتھ ہے، جس کی حالیہ صورت Juxta Puzzle کی سی ہے، مگر اس میں دشواری یہ ہے کہ اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر کوئی مربوط تصویر نہیں بنتی، کچھ ٹکڑے تو ایسے ہیں جو بالکل Blind ہیں، اور ان کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا، بقول پیرزادہ اب یہ ممکن ہے کہ دروازے پر دستک ہو، اور وہ یہ جاننے کے لیے دروازہ کھولیں کہ باہر کون ہے، تو ہو سکتا ہے کہ آنے والے کے ہاتھ میں کلاشنکوف ہو۔ یہ المیہ صرف کراچی شہر کا نہیں ہے پوری انسانیت کا ہے، اب یہ سوچنا پڑے گا کہ ترقی کے نام پر خودکشی تو نہیں کی جا رہی ہے۔

پیرزادہ کے اس شعری مجموعے پر برصغیر کے کچھ مقتدر ادیبوں نے اپنی آرا کا اظہار کیا ہے۔ اور بہت سی باتوں کے ساتھ ان کی دردمندی اور گہرے دکھ کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ مگر دردمندی تو شاعری کی تیسری جہت ہے اگر یہ نہ ہو تو شاعری استری کیے ہوئے رومال کی طرح ہو جاتی ہے۔ مگر پیرزادہ کی دردمندی میں ایک تشویش کا عنصر نمایاں ہے اس تشویش کے اندر ایک تسلسل ہے، جسے وہ لمحۂ موجود کے دونوں طرف محسوس کرتے ہیں۔ اس کی ابتدا ان کی پہلی غزل سے ہو جاتی ہے:

خون سے جب جلا دیا ایک دیا بجھا ہوا
پھر مجھے دے دیا گیا ایک دیا بجھا ہوا

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ یہاں جمع متکلم کی بجائے واحد متکلم کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ پیرزادہ نے انسانیت کو بطور کل نہیں لیا بلکہ فرد کے طور پر دیکھا ہے۔ یہ بھی بیسویں صدی کا المیہ ہے کہ فرد اہم ہوتا چلا جا رہا ہے اور معاشرہ سکڑنے اور بکھرنے لگا ہے، حالانکہ کلاسیکی غزل میں تمام تر افراتفری اور زبوں حالی کے باوجود معاشرہ اقدار کی سطح پر بکھرتا ہوا نظر نہیں آتا، البتہ ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جن میں معاشرے کی شکست و ریخت کی جھلکیاں نظر آتی رہتی ہیں، پیرزادہ کے ہاں معاشرہ خاص حد تک بکھر چکا ہے بلکہ Entropy کے عمل میں گرفتار ہے، انٹروپی کے عمل کے تحت آنے والا ہر لمحہ بکھراؤ اور انتشار کو شدید سے شدید تر کرتا چلا جاتا ہے:

میں کب سے اس تندی ہوا کے مقابلے میں ڈٹا ہوا تھا
مگر یہ اک دست محرمانہ جو آج مجھ کو بجھا رہا ہے
ہمیں جلدی بہت تھی عشق میں برباد ہونے کی
سو پیش و پس میں پڑ کے وقت کو برباد کیا کرتے

روایتی غزل اور جدید غزل میں بنیادی فرق شاید یہی ہے کہ روایتی غزل میں معاشرے کو اہمیت حاصل ہے اور تخلیق کاری کے عمل میں مبتلا ہر شخص معاشرے کے ساتھ تھوڑی بہت آویزش کے باوجود اس کے تعینات کو قبول کرتا ہے، مگر جدید غزل میں فرد کے مسائل معاشرے کے مسائل سے جداگانہ ہو گئے ہیں، اس دوران جو فلسفے تشکیل دیے گئے ہیں وہ بھی فرد ہی کے المیے کو بیان کرتے ہیں، پیرزادہ قاسم کے ہاں Outsider بہت اہمیت کا حامل ہو گیا ہے، وہ روایت کے ساتھ ایک مضبوط رشتہ قائم رکھنے کی خواہش کے باوجود ایک بیگانگی کے عمل میں گرفتار ہیں، یہ بیگانگی ویسی نہیں جیسی صوفی کے ہاں نظر آتی ہے،

حالانکہ پیرزادہ کے ہاں اس روایت کا بھی تھوڑا بہت عمل دخل ضرور دریافت کیا جا سکتا ہے۔ آج کے زمانے میں جدید سائنسی علوم نے ویسے بھی سائنس اور تصوف کے تفاوت کو ختم کر دیا ہے۔ اب سائنس داں بھی صوفی کی طرح سوچنے پر مجبور ہے اس کے لیے بھی دنیا ایک حقیقت کے طور پر نہیں بلکہ ایک خیال کے طور پر موجود ہے، ایک ایسا خیال جس کے اندر بہت سے تضادات پائے جاتے ہیں اس میں کوئی چیز متعین نہیں ہوتی ہر شے امکانی ہوتی ہے اور اس سارے عمل میں خود دیکھنے والا بھی شامل ہوتا ہے۔

لہٰذا نظر آنے والی دنیا اور محسوس کی جانے والی دنیا میں بہت فرق ہے، عملی اور منطقی سطح پر تو ممکن ہے ہمیں نظر آنے والی دنیا کو جوں کا توں قبول کرنا پڑے مگر ایک شاعر اور تخلیق کار کی حیثیت میں ہم صرف اپنی واردات اور تجربے ہی کو درست تسلیم کر سکتے ہیں، یہی وہ فرق ہے جو کلاسیکی دنیا کو جدید دنیا سے الگ کرتا ہے۔

پیرزادہ کی شاعری بظاہر بہت سیدھی، صاف اور سمجھ میں آنے والی شاعری ہے اور اس کی آواز کے جادو میں لپٹ کر جب وہ قاری یا سامع تک سفر کرتی ہے تو دلوں میں اتر جاتی ہے، ہمیں یہ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ ہم نے کیسی پیچیدہ شے کو قبول کیا ہے، بالکل اسی طرح جیسی کلون (Cologn) استعمال کرنے والوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں۔ یہ اجزاء بعض اوقات سینکڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں، خوشبو سونگھنے والوں کا تعلق تو محض خوشبو سے ہوتا ہے، جو اپنی تمام تر پیچیدگی کے باوجود بہت آسانی سے سونگھی اور قبول کی جا سکتی ہے۔

آج کا سائنس دان یا جدید صوفی دنیا کو تیاگنے کے عمل میں گرفتار نہیں ہے، وہ ایک بھرپور زندگی گزارتا ہے، جسمانی سطح پر بھی اور روحانی سطح پر بھی، صوفی اور سائنس دان کی واردات کو بیک وقت بیان کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے شاعری کے روپ میں بیان کیا جائے، زمانہ قدیم میں بھی شاعروں ہی نے زندگی کے بنیادی اصول دریافت کیے تھے اور آج بھی شاعری کسی مفلسی کا شکار نہیں ہے۔ مگر شاعر اور قاری کے مابین جو رشتہ ہے اس میں کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں اور وہ بھی پیرزادہ قاسم کی حد تک نہیں، وہ اپنی بات آسان ترین اور مترنم ترین انداز میں پیش کرنے پر قدرت رکھتا ہے:

سچے شعر کا کھلیان اور بھرتا جاتا ہے
درد کی زمینوں میں غم کی فصل بونے سے

''نئے عہد کا آہنگ''

شاعری کی دنیا میں زمیں سخت اور آسماں دُور ہے۔ آئے دن شہر میں بنتی اور مسمار ہوتی ہیں۔ ادب کی دُنیا میں اپنی پہچان قائم کرنا اور اپنی آواز کا جادو جگانا آسان کام نہیں ہے۔ بزرگوں نے لطفِ سخن اور قبولِ عام کو خداداد کہا ہے اور مشرقی روایت میں اس بات کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تاہم تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لانا اور اس پر جِلا کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ میں نے جب آج سے سات برس پہلے کراچی کی ایک محفل میں ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کو سُنا تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ منصبی اعتبار سے وہ سائنس داں ہیں لیکن جذبات کی پرتوں سے جس باریک بینی سے سطحِ شعر پر وہ معائنہ کرتے ہیں اور اپنے خاص دھیمے ملائم اور نرم لہجے میں پُرسوز انداز سے تازہ معنویت کا جادو جگاتے ہیں، وہ خاص ان کی اپنی چیز ہے۔ ان کا دامن روایت سے جُڑا ہوا ہے اور جدید عہد کے تقاضوں سے بھی وہ متاثر ہیں۔ ان کی غزل میں نئے عہد کا آہنگ ملتا ہے۔ میں جب ان کا کلام سُنتا یا پڑھتا ہوں، جی چاہتا ہے کہ ایسے شاعر اردو میں اُبھرتے رہیں تاکہ ان کے ہاتھوں اُردو شاعری کا مستقبل تابناک رہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

○○
○

''خواب ہوجانے سے پہلے''

ڈاکٹرعزیزاندوری

(اندور، بھارت)

یقین و بے یقینی کے اس عہد میں سانسیں لینے والی نئی نسل کی ذہنی کشمکش اور مزاجی تذبذب سے بھری پڑی ہے ہمارے اس عہد کی غزل۔۔۔ سماجی فضا ہو یا مذہبی ماحول سیاسی سطح ہو یا تعلیمی معیار۔۔۔سب پر انتشار اور بے اعتباری کا سفاک سایہ مسلط ہے۔

آج عملی اور فکری سطحیں بڑی حد تک نمائشی بن کر رہ گئی ہیں۔تخلیقی رویے پر بھی زندگی کی چھاپ ڈھیلی پڑتی جارہی ہے۔اکثریت ان تخلیقی صورتوں کی تقلید میں گم ہے جو وقتی تلذذ یا کرب نا کی کا حصار تو توڑ نہیں سکتیں،اسی لیے بے یقینی ذہن و دل کو اپنی گرفت میں لے چکی ہے۔

شاعری اور خصوصاً غزل کی موجودہ صورت بھی اسی حصار میں گھرے رہنے اور اسے توڑنے میں مصروف ہے۔اس حصار کو توڑنے والے نئی نسل کے بہت سے شعراء میں پیرزادہ قاسم کا شمار ہوتا ہے۔جو فکری اور عملی سطحوں پر ان اندیشوں سے گذر رہے ہیں جو آفاقی پیمانے پر ابھر کر انسانی ذہنوں کے انتشار کا سبب بن رہی ہیں اور انسانی فاصلوں میں مزید اضافہ کرتی جارہی ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں:

غبار بارود رقص شعلہ دھمال میزائیلوں کا پیہم
یہ کیسا منشور امن عالم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے

انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ اس قحط الرجال زمانے میں سعی پیہم۔ہر دل جواں پیہم رواں۔زندگی کے اصول سازی کے لیے بھی ناکافی ہوگئی ہے۔تو وہ بڑی حد تک مایوس سے ہوجاتے ہیں:

جس انقلاب کی سرخی مرے لہو نے لکھی
وہ انقلاب مری داستاں بنا ہی نہیں

مگر اپنی سعی پیہم پر انہیں اعتماد بھی ہے۔

درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے مری بساط کیا ایک دیا بجھا ہوا

بجھے بجھے سے دل و دماغ اگر روشنی کی ایک کرن کو بھی شوخ بنا دیتے ہیں تو وہ شوخ کرن ظلمات لامتناہی کو رفتہ رفتہ ختم کردینے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

پیرزادہ قاسم اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو کھلے دل اور وسیع فکر سے اقدار حیات کا مطالعہ کر کے اس سے تجربے حاصل کرتے ہیں۔ان کا یقین ڈھیلا نہیں پڑتا۔وہ مظہر کائنات میں ان دھڑکتے ذرّات کو تلاش کر لیتے ہیں جن سے انسان دوستی کا جذبہ تر و تازہ رہے''موسم میرے دل کے'' یہ مصرعے:

میرے دل کے آنگن میں بھی
یہ جانے پہچانے موسم
آتے اور جاتے رہتے ہیں
لیکن یہ اک بات عجب ہے

کشت دل میں جتنی قسموں کے بھی پول کھلا کرتے ہیں:

سارے سرخ ہوا کرتے ہیں
اور پت جھڑ میں یخ بستہ بے مہر ہوا
جب رقص زمستاں کا آغاز کیا کرتی ہے
شاخوں سے گرنے والے پتے بھی
سبز ہوا کرتے ہیں

دل کے موسموں کو محض بناوٹی بہاروں سے پیرزادہ منسوب نہیں کرتے نہ وہ ان موسموں کو رقص بہاراں۔۔۔یا کیف و سرور محفل سے تعبیر کر کے خوش ہوتے ہیں۔ بلکہ فکری اعتبار سے وہ ان سرخ پھولوں کو کھلانا چاہتے ہیں جہاں شاخوں سے گرنے والے پتے بھی سبز ہی رہیں۔ایک خوش حال زندگی کا تصور زوال پذیری کے باوجود اور یہ رجائیت ہی پیرزادہ کو اپنے عہد کی اس نئی نسل سے بلند کردیتی ہے جو حالات کی کشمکش اور تذبذب کے حصار کو توڑنے میں ناکام ہوجانے کے بعد قنوطیت کا بری طرح شکار ہوگئی ہے وہ اپنے اس عہد کی اسی نسل سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں:

میں ایسے شخص کو زندوں میں کیا شمار کروں
جو سوچتا بھی نہیں خواب دیکھتا بھی نہیں

پیرزادہ قاسم زندگی کو ایک بگولا نہیں سمجھتے جو اٹھتا تو ہے بڑے زور و شور سے مگر دیکھتے ہی دیکھتے فضاؤں میں گم ہوجاتا ہے۔اس کیفیت کو وہ زندگی کی شائستگی کے خلاف سمجھتے ہیں۔وہ زندگی کو گرد ملال بھی نہیں مانتے۔۔۔وہ اس کی تزئین کے لیے شائستہ جذبوں کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔زوال پذیری کے باوجود نقش جاوداں بن جانا اہل ظرف ہی کا کام ہوسکتا ہے:

ہوئے جو خاک تو شائستگی کا ظرف ملا
کہ دشت جاں سے بگولا کوئی اٹھا ہی نہیں

ان کا دل''جذبہ عشق'' سے اس لیے سرشار رہنا چاہتا ہے کہ عشق کا رزیاں سہی مگر حیات انساں کو یہی زیاں دائمیت بھی بخشتا ہے اور انسان کو کمیاب بنا دیتا ہے:

تا عمر وہی کار زیاں عشق رہا یاد
حالانکہ یہ معلوم تھا اجرت نہ ملے گی
آئینہ صفت وقت ترا حسن ہیں ہم لوگ
کل آئینے ترسیں گے تو صورت نہ ملے گی

''چہارسُو''

یہ پیش گوئی کوئی چلتی پھرتی یا سطحی فکر کا نتیجہ ہرگز نہیں۔ یہ اس ذہن سے ابھری ہے جو اپنے مسموم عہد سے بیزار تو ضرور ہے مگر نا امید بالکل نہیں۔ اسی لیے وہ خود کو ایسا خاک نشین ثابت کرتے ہیں جو صحرا نشین ہونے کے باوجود اپنی ذہنی تر و تازگی پر اتراتا ہے۔

انسان۔ خوابوں کی دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا اس کا جسم اور ذہن اگر بیدار ہے تو وہ اسے اس حصار سے باہر نکال ہی لیتا ہے۔ مگر کچھ خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جو انسان کو بیداری کے مقابلے میں زیادہ شاداب اور تر و تازہ بنا دیتے ہیں اور اس کی تمناؤں کو اس قدر مستحکم کر دیتے ہیں کہ عالم بیداری پر عالم خواب کو ترجیح دینی پڑتی ہے:

کتنا شاداب مرا خواب تمنا ہے کہ میں
ٹوٹ جاتا ہوں مگر خواب بکھرتا بھی نہیں

مگر پیرزادہ جب دیکھتے ہیں کہ عالم بیداری بھی منتشر ہے اور اس کے اثرات کی وجہ سے عالم خواب بھی بکھرا بکھرا نظر آتا ہے۔ اس کی ساری شادابیاں مرجھا جاتی ہیں تو وہ ایک بار پھر سے مایوس ہو جاتے ہیں:

جس طرف نظر کیجیے وحشتوں کا ساماں ہے
زندگی ہی کیا اب تو خواب تک پریشاں ہے

اور اسی انتشار اور بکھراؤ کا نتیجہ ہے کہ انسان کی تمام اولوالعزمی فنا ہو چکی ہے وہ صرف خواہشات کے سہارے زندہ رہنا چاہتا ہے وہ ارادے باندھتا ہے اور پھر ذہنی کشمکش کی وجہ سے انہیں خود ہی توڑ بھی دیتا ہے۔ گویا اسے اپنی منزل کی تلاش میں جس طاقت پرواز کا اظہار کرنا چاہیے اس سے وہ قطعی محروم ہو چکا ہے۔ خوش فہمیوں کے دائروں میں محصور ہو کر وہ وقتی سکون کو حاصل حیات سمجھنے لگا ہے۔ پیرزادہ ایسی ہی بے عملی پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جستجوئے منزل تو پر سمیٹے بیٹھی ہے
صرف خواہش پرواز اب فضا میں رقصاں ہے

اور اسی خواہش پرواز کا نتیجہ بھی پیرزادہ کے سامنے آنے لگتا ہے:

بے حسی کے سناٹے پھیلتے گئے اتنے
از دیار جسم و جاں روح تک بیاباں ہے

ویرانی کی یہ وسعت روز بروز پھیلتی ہی جا رہی ہے، زمین و آسمان سب اس کی گرفت میں آ چکے ہیں، اس کا تجزیہ آج بھی بیدار ذہن و فکر کا انسان جب کرتا ہے تو اداس ہو جاتا ہے:

دار و گیر و حشت میں اب پناہ کیا ڈھونڈیں
یہ زمین دامن ہے آسماں گریباں ہے

اس کے باوجود پیرزادہ قاسم سرحد شب پر بیدار نظری لیے ہوئے حالات و کائنات کا جائزہ لینے پر آمادہ ہیں جو ان کی اعلیٰ ہمتی اور ژرف نگاہی کا ثبوت ہے:

بخت بھی سوئے ہیں اور گھر کے مکیں بھی لیکن
سرحد شب پہ کہیں ایک دیا جاگتا ہے

خواب ہو جانے سے پہلے کوئی حرف خوش کام
اسی امید پہ یہ ذہن رسا جاگتا ہے

غرض یہ کہ پیرزادہ قاسم تمام تر مسموم فضاؤں میں سانسیں لینے کے باوجود حالات سے نبرد آزمائی کرنے اور ذہنی تازگی کے ساتھ حالات کی سفاکی کے مقابل آنے کا جو حوصلہ رکھتے ہیں وہ انہیں اس عہد کی اس نسل کا شاعر بنا دیتا ہے جو آج بھی زندگی کی رجائیت کی قائل ہے۔

''تازہ موسموں کی تلاش''

پیرزادہ کا اسلوب خوش گوئی، نرم کلامی، لہجے کی شائستگی اور جمالیاتی گفتار کے رنگ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے انہوں نے اپنے تجربوں کے تخلیقی اظہار کے لیے جو شعریات مرتب کی ہیں وہ جدید اسالیب کی شعریات ہیں۔ جن کے درمیان پیرزادہ قاسم کی شخصی شائستگی بھی ان کے تخلیقی عمل میں توازن کا سبب بنی ہے۔

ان کی پوری شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ برابر اپنے تخلیقی تجربوں میں رسمی دائروں سے نکل کر تازہ موسموں کی تلاش میں سرگرداں ہیں انہوں نے اس روایتی دلدل سے اپنے پاؤں چھڑا لیے ہیں جو نئے وجود کو نگل جاتی ہے۔

پیرزادہ قاسم نے شاعری کی تہذیبی روایت سے اور زندگی کی عصری آگہی سے خود کو اس طرح پیوست رکھا ہے کہ ان کے اندر غیر مہذب آوازوں کا کوئی بے ہنگم شور نہیں ہے اور ان کی شاعری کہنگی، قدامت یا فرسودگی کے بنجر پن سے بہت فاصلوں پر ہے۔ پیرزادہ جدید آدمی کی داخلی اور خارجی آگہی سے علمی اور تخلیقی اظہار کا تاریخی و تجرباتی شعور رکھتے ہیں اور ان کے اندر ایسا امکان موجود ہے جو انہیں قبیلۂ آئندگاں کا ایک اہم فرد بنا سکتا ہے۔

جاذب قریشی

○

''ایک خواب نادیدہ''

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

(●)

پیرزادہ قاسم واقعتاً شاعری کی اعلیٰ روایات کے خُوگر شاعر ہیں۔ گزشتہ چند برس سے اُن کی شاعری میں تمامتر یاسیت زدہ ماحول کے باوجود، رجائیت کا عنصر نمایاں ہوتا جارہا ہے۔ ان کی شاعری میں تغزل ایک منفرد انداز لیے ہوئے ہے اور یہ عنصر اسی وقت راس آتا ہے جب انسانی اقدار تہہ و بالا ہو رہی ہوں اور فضا پر حُزن وملال کی کیفیت چھارہی ہو۔

پیرزادہ قاسم کی شاعری کے اب تک دو مجموعے شائع ہوئے ہیں ''تند ہوا کے جشن میں'' اور ''شعلے پر زباں'' نئے مجموعہ ''مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا'' (۲۰۰۶) کے علاوہ جو دو مجموعوں کے انتخاب اور حالیہ شاعری پر مشتمل ہے اُن کے تمام مجموعے اپنے دور کے اہم شخصی اور اجتماعی مسائل پر گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ پیرزادہ قاسم کا تغزل ان کے لہجہ کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسے شائستہ طبع شاعر کا تغزل ہے جسے اپنی محبوبہ کے ہجر میں بھی وصال کی یادیں بھی عزیز ہیں۔ شاید پیرزادہ قاسم شعرا کی اُس مختصر فہرست میں شامل ہیں جو عشق کے ظرف میں بھی ادب اور تہذیب کو مظروف پاتے ہیں۔ جب میر تقی میر نے کہا تھا کہ:

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

جبھی تو پیرزادہ قاسم کہتے ہیں:

وصال لمحے نے بیکراں ہجر موسموں کی نوید پا کر
سلام آخر بہ چشمِ پرنم ہوا پہ تحریر کر دیا ہے

میں نے پیرزادہ قاسم کے علاوہ ہم عصر شاعروں اطہر نفیس کے یہاں بھی اسی نوع کی کیفیات محسوس کی ہیں۔ مثلاً:

جسے کھو کر بہت مغموم ہوں میں
سنا ہے اس کا غم مجھ سے سوا ہے

مثل بادِ صبا تیرے کوچہ میں اے جانِ جاں آئے ہیں
چند ساعت رہیں گے، چلے جائیں گے سرگراں آئے ہیں

پیرزادہ قاسم نے اپنی ایک غزل مسلسل میں ایک ایسے شائستہ لہجہ میں اسی نوع کے سیاسی احساسات بیان کیے ہیں جو سکّہ بند سیاسی موضوعات پر شاعری کرنے والوں کے یہاں نظر نہیں آتے۔ اس غزل میں ''آپ بڑے عجیب ہیں'' کے اعادہ مسلسل نے شائستہ لہجے کے جس رخ کو واضح کیا ہے وہ تہذیب عشق ہی کا لہجہ ہے۔ اس لہجہ میں شعری زبان میں جس حد تک کنٹرول ہے وہ قابلِ داد ہے۔

یہ لہجہ زبان و بیان کے انتخاب سے شعری ڈکشن تک اپنے خلق کے مخصوص شعری مزاج کا ترجمان ہوتا ہے۔ شعری مزاج (Poetic Temperament) کا خلقی نظام ہی شعری لہجہ کی خصوصیت ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ ایک شاعر کے کلام میں متعدد لہجے بیک وقت شامل ہوتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی شاعر کے یہاں لہجہ ہموار ہے۔ پیرزادہ قاسم صاحب اسلوب شاعر ہیں اور ایک اہم شاعر کے لیے یہ بنیادی وصف ٹھہرتا ہے۔ پیرزادہ کا بیشتر کلام ایک مخصوص شعری مزاج کا آئینہ دار ہے ورنہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر شاعروں کے ڈکشن میں متعدد لہجے بیک وقت راہ پاجاتے ہیں۔ غالباً اسے شاعری کی آوارہ مزاجی rambling ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

پیرزادہ قاسم شمالی ہند کے مخصوص اُردو کلچر کے نمائندہ ہیں۔ ان کے یہاں زبان کی تہذیب ادبی اقدار کی پاسداری میں مضمر ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے حالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ آخر ایسا کون سا شاعر و ادیب ہے جو اپنے اردگرد کے حالات سے متاثر نہیں ہوتا لیکن متاثر ہونے اور حالات کے رُخ پر بہہ جانے میں بہت فرق ہے۔ میں حالات کے رُخ پر بہہ جانے والوں کو بھی اپنے ضمیر کی آواز سمجھتا ہوں لیکن کچھ شاعر حالات کی اضطراری کیفیت میں بھی اپنی ثقافت کی دوامی روح کو خیر باد نہیں کہہ پاتے۔

مثلاً آپ پیرزادہ قاسم کا درج ذیل شعر دیکھئے:

ہوا کی شاخ پہ خوشبو کا ایک پھول کھلا
یہ کارفن تھا تو اس میں ہمیں زمانے لگے

اس شعر میں ثقافتی اقدار کے دوام کا احساس کارفرما ہے یعنی یہ نظریہ کہ کلچر ودیعت میں نہیں ملتا بلکہ فرد کو اس کے حصول کے لیے اپنی سی سعی کرنا پڑتی ہے اور تب کہیں جا کر یہ لاشعور سے شعور کی منزل سے گزر کر فکر و نظر بنتا ہے۔

ہزار سایۂ دیوار و در میں ہوں، لیکن
مرے وجود میں اک بے کنار صحرا ہے

اپنے وجود میں بے کنار صحرا ہونے کا احساس بیک وقت صحرا کی محدودیت اور اس کی بے کناری کے احساس کو پیش کرتا ہے اور یہ بے کناری اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب شاعری وقت پر کمند ڈالنے کا وظیفہ ہو، محض تفنّن طبع نہ ہو۔

پیرزادہ قاسم کی شاعری میں تغزل کی فراوانی نے تغزل کے عاشقوں کو پیرزادہ کی تعریف و توصیف کے لیے زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔

پیرزادہ قاسم کا محبوب جیتا جاگتا محبوب ہے۔ ہر چند کہ وہ ''تصوّف'' کے حسنِ نظر کے قائل نظر آتے ہیں لیکن وہ حقیقت اعلیٰ کی طرف بھی مجاز ہی کے راستے سے جاتے ہیں۔ وہ اپنی وارداتِ قلبی کے مختلف النوع

احساسات کو جس خوبصورتی اور فنی چابکدستی کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں وہ بذاتِ خود ہر زبان کی مترنم شاعری کا لازمی خاصہ ہوتا ہے۔

تغزل کے شاعر کے یہاں بھی کسی نہ کسی نظریۂ حیات کا قائل ہونا لابُدی ہوتا ہے چونکہ ہر شاعر ادبی نظریہ (Literary Theory) سے مبّرا اور منزّہ نہیں ہوسکتا۔ پیرزادہ قاسم کی شاعری ایک اسلوب زیست کی شاعری ہے اور ان کے یہاں یہ ملاپ اس درجہ نمایاں نظر آتا ہے کہ یہ وصف پیرزادہ قاسم کی شاعری کا نمایاں پہلو بن چکا ہے۔ وہ جدت پسندوں کی طرح شخصیت سے فرار اور شاعری کے متن میں اپنی ذات کی موجودگی presence کا قائل ہوتا ہے۔ اس لیے پیرزادہ قاسم نے ترقی پسندی کی بلند آہنگی اور جدیدیت میں شخصیت سے گریز کے رجحان سے الگ راہ نکالی، بہت کم شاعر اس مشکل امتحان میں کامیاب ہوسکے ہیں۔

پیرزادہ قاسم نے ایک ایسے دور (ستّر کی دہائی) میں اُردو غزل کی آبرو رکھنے والی نئی نسل کے سرخیل کی حیثیت اختیار کی جنہیں یقین تھا کہ اُردو غزل محض ایک صنفِ سخن نہیں ہے بلکہ ایک اسلوبِ زیست کی صنفِ سخن ہے۔ یہ اسلوبِ زیست نازک سے نازک اور پیچیدہ سے پیچیدہ احساسات کے لیے موزوں اظہار کی دولت سے مالا مال ہے اس لیے وہ صحیح معنوں میں ہمارے کلچر کی اعلیٰ اقدار کے شاعر ہیں۔ درج ذیل اشعار پڑھیے اور سر دھنیے کہ ان اشعار کی سرگوشی میں وہ سب کچھ شامل ہے جو خوبصورت بین السطوری اظہار کا خاصہ ہوتا ہے:

ایک خوابِ نادیدہ روز ٹوٹ جاتا ہے
زخم خوردہ آنکھوں میں کرچیاں بہت سی ہیں

ہزار سایۂ دیوار و در میں ہوں ، لیکن
مرے وجود میں اک بے کنار صحرا ہے

ہم تو مثالِ برگ ہیں اپنا قیام و کوچ کیا
کل تھے شجر کے دوش پر آج ہوا کے ساتھ ہیں

سب مری روشنیِ جاں حرفِ سخن میں ڈھل گئی
اور میں جیسے رہ گیا ایک دیا بجھا ہوا

شہر اگر طلب کرے تم سے علاجِ تیرگی
صاحبِ اختیار ہو آگ لگا دیا کرو
ہوا کی شاخ پہ خوشبو کا ایک پھول کھلا
یہ کارِ فن تھا تو اس میں ہمیں زمانے لگے

یہ حادثہ مجھے حیران کر گیا سرِ شام
جو زخم صبح ملا تھا وہ بھر گیا سرِ شام

پیرزادہ قاسم اردو شعر کی تہذیب کے بہت دور بین عارف ہیں۔ وہ انسانی اور سائنسی علوم کے امتزاج پر یقین رکھتے ہیں اور شاید علوم انسانی اور سائنسی ملاپ کے بہت بڑے وکیل، سر چارلس اسنو (Sir Charles Snow) کے ذہن میں پیرزادہ قاسم جیسی نمائندہ شخصیت ہی مثالی شخصیت کے طور پر قابلِ قبول ہوسکتی ہے۔

پیرزادہ قاسم کی شاعری کا ایک اور منہاج ہے۔ وہ شاعروں کی اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو دنیا کی سب سے بڑی ہجرت کے تجربہ سے گزری۔ یہ وہ تجربہ تھا، جس نے انسانی سرشت کی مثبت اور ہمت افزا تمثالوں (Images) کے ساتھ ساتھ اندوہناک رُخ بھی دیکھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ انسان اور انسانی مقدر کے بارے میں بنے بنائے نظریات سے اور رویّوں سے مختلف ہیں۔

سفر نصیب ہیں ہم کو سفر میں رہنے دو
سفالِ جاں کو کفِ کوزہ گر میں رہنے دو

میری طرح دشت بھی مجبور ہے
اُس کو بھی اک خاک بسر چاہیے

یہ وہ نسل ہے جس نے ماضی کے بارے میں بے جا فخر و مباہات کے بجائے حقیقت پسندانہ رویوں کو درست محسوس کیا اور اس طرح یہ نسل اپنے آباء کی نسل سے یک بیک مختلف نسل ہے۔ ادبی نظریات میں بھی پیرزادہ قاسم کے لیے روایتی ترقی پسندانہ اور جدید نظریات اپنی Face value پر اچھے اور بُرے نظریات نہیں ہیں بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ نئی حسیّت کی تفہیم اسی وقت ممکن ہے جب ترقی پسندانہ خیالات (Ideas) اور جدید انداز نظر کی واقعیت پسندی سے صرف نظر نہ کیا جاسکے۔

پیرزادہ قاسم کی شاعری ایک شائستہ اور مہذب طبیعت کے شاعر کے یہاں پائے جانے والے احساسِ جمال کی ترجمانی ہے۔ یہ شاعری از دل خیزد و بر دل ریزد کے مصداق ہے۔ پیرزادہ قاسم کی شاعری بر بطِ احساس کو اس طرح جھنجھوڑتی ہے کہ قاری خود کو پُرنم آنکھوں کے ساتھ گہرے سکوت میں گم ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ شاعری ناقابلِ برداشت انسانی صورت حال کو بھی ایک سطح پر قابلِ برداشت بنا دینے کا معجزاتی فن ہے۔ یہ فن کی سطح پر ناممکن کو ممکن بن سکنے کا ایک ایسا فن ہے جس کے سامنے بدترین حالات میں بھی ایک بہتر فضا کا امکان موجود رہتا ہے۔

میں پیرزادہ قاسم کی شاعری کو اس بنا پر بھی قابلِ توجہ شاعری سمجھتا ہوں کہ پیرزادہ قاسم کے شعری مزاج اور قوت تخیل کے شاعر تاریخِ ادب میں بہت بلند مقامات پر فائز رہتے آئے ہیں۔ پیرزادہ قاسم ہمارے درمیان، شاعری کے

لوازمات اور جرات اظہار کے مثالی اور قابلِ نمونہ کی ''حاضر'' مثال ہیں۔

شاید میں پیرزادہ قاسم کی شاعری پر برجستہ طور پر داد دینے والے اوّلین قارئین وسامعین میں سے ایک ہوں۔ جب بھی پیرزادہ قاسم کی شاعری پر غور کیا ہے اسے اپنے بہت ہی نجی خیالات کا ترجمان پایا ہے۔ غالباً ان سے پہلی ملاقات ساٹھ کی دہائی کے نصف آخر میں ہوئی تھی اور پھر یوں ہوا کہ ان کے یہاں میرے لیے اور میرے یہاں ان کے لیے اپنائیت اور ان کے فن کی تہہ در تہہ معرفت کا ایک ایسا رشتہ پیدا ہوا جسے کبھی اظہار کی ضرورت پیش نہ آئی۔ میں نے انہیں سفر وحضر دونوں صورتوں میں دیکھا۔ اس پر جامعہ کراچی کے ایک ساتھی استاد کی حیثیت مستزاد تھی۔

ان کے ساتھ اشتراک ذوق کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ میں بھی ان کی طرح مصوّری اور مصوّروں سے ہم رشتہ ہوں۔ میں نے ڈاکٹر سلیم الزّماں صدیقی کے بعد بہت کم کسی سائنسدان کو شاعری اور مصوّری کے ساتھ رشتۂ موانست کو وقعت دیتے دیکھا ہے۔ پیرزادہ قاسم کی شاعری میں بھی جگہ جگہ مصوّرانہ کشش اور زاویہ ہائے نظر ابھرتے ڈوبتے نظر آتے ہیں۔ جیسے الفاظ رنگوں سے کام لے رہے ہوں اور اشعار کی جگہ Canvases پر کام کر رہے ہوں۔ اُن کی شخصیت شعروں میں موجود ہوتی ہے۔ یہ ایک بڑی خوبی ہے اور ایک عرصہ تک یہ خوبی بے جا تنقید کی زد میں رہی۔ اب دھند چھٹ رہی ہے ''منفی جدیدیت'' دم توڑ چکی ہے اور ترقی پسند جدیدیت سماجی ومعاشی تناظر کو ادب کی تفہیم کے لیے ضروری سمجھتی ہے۔

پیرزادہ قاسم مابعد جدیدیت کے بعض نظریات کے قائل نہیں ہیں جو Non-essentialism, Non-foundationism and Non-realism سے متعلق ہیں جس کے باعث وہ لبرل ازم اور کشادگی ذہن کے وکیل بن کر سامنے آئے ہیں۔ یہ اُن زندگی گریز مابعد جدیدیت پسندوں کا خیال ہے جو شاعری کو اپنے سماج کی تہذیبی اقدار سے الگ تھلگ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ تہذیبی اقدار میں موسمِ خزاں کے وہ زرد پتے بھی ہوتے ہیں جنہیں کوڑے کے ڈھیر میں ڈال دیا جاتا ہے اور موسمِ بہار کے پھولوں کی وہ نو دمیدہ کونپلیں بھی جو وقت کے خوبصورت تسلسل اور دلفریب رعنائیاں بھی ہیں۔ پیرزادہ قاسم اُس شعری نظریہ کے قائل ہیں جو موروثی طور پر کسی حد تک کم اور اکتسابی طور پر زیادہ بہتر طریقہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ایک مہذب خاندان کے لیے بھی اپنے ارکان کو تہذیبی اقدار منتقل کرنے کا فریضہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اب ہمارے تعلیمی نظام میں لائقِ تحسین ادبی ذوق کی منتقلی کا کام ''اتفاق یا اتفاقات'' پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

پیرزادہ قاسم صاحب نے ایک موقعہ پر ادبی ذوق کی تحصیل پر زور دیا تھا اور اسے کسی ادبی روایات کی بقا اور افزائش سے عبارت کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک اچھے سائنسدان اور ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص وجدان اور مشاہدہ و تجزیہ کو لازم وملزوم نہ جانے اس وقت تک وجدان میں گہرائی اور مشاہدہ میں صداقت اور تاثیر پیدا نہیں ہوتی۔ پیرزادہ قاسم میں یہ دونوں انتہائی ضروری شرائط دلکش تناسب کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کی روایت کے شاعر ہیں، میرا ذاتی تجربہ ہے کہ وہ ہمارے شہر اور ملک کے بیشتر مصوروں کے کام اور اس کام کی اہمیت سے اس درجہ واقف ہیں کہ ان کی شہرت کا ایک دائرہ Visual Arts سے متعلق فنکاروں کے ساتھ گہرے تعلق سے بھی بنتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں شخصیت سے فرار کے ''جدید'' تقاضوں سے شعوری انکار کی تمثالیں Images زندگی افروز رنگوں کی شکل میں ابھرتی ہیں جیسا کہ آدرشوں اور انسانی تاریخ کے ارتقا سے احساسات مرتب ہونے والے Cognitive Conscious کے بظاہر غیر منطقی لیکن شعری طور پر درست اظہار سے ہونا چاہیے۔ یہ Cognivive Consciousness نفسیات کی Consciousness سے علیحدہ شعبہ ہے اور اس میں درایت روایت اور روایت درایت کے ساتھ اس درجہ شیر وشکر ہوتی ہے کہ ان کے علیحدہ علیحدہ ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا اور تعجب ہوتا ہے کہ ایک بیک وقت پیرزادہ جیسے مقبول شاعر میں یہ وصف کس خوبصورتی کے ساتھ کیونکر قدرتی طور پر موجود ہے۔ ہر چند کہ پیرزادہ قاسم اپنی شاعری میں ''عشق'' کے مقبول عام Concept کے قائل معلوم ہوتے ہیں لیکن انہوں نے عشق اور عقل کے مابین مبارزہ آرائی کے باوجود ایک نوع کے Relativism سے کام لیا ہے جو ایک منفرد شاعر کا خاصہ ہوتا ہے اور یہی وہ وصف ہے جو پیرزادہ قاسم کو ایک سماجی اور تہذیبی شعور سے مالا مال شاعر بناتا ہے۔

خوبصورت کلام

پیرزادہ قاسم مجسم خوبصورتی ہیں۔ وہ خود خوبصورت ہیں اور جس طرح ان کا مزاج و کردار خوبصورت ہے اسی طرح ان کا کلام بھی خوبصورت ہے۔ ان کی غزل ماضی کی زندہ رہنے والی روایات کو بھی الفاظ و معنی میں سموتی چلی جاتی ہے اور ساتھ ہی وہ غزل کی جدید روایات بھی قائم کرتے چلے جاتے ہیں۔

○ احمد ندیم قاسمی

''مرادوں کی کھیتیاں''

محسن احسان

(●)

غالباً ۱۹۸۲ء کی بات ہے کراچی سے حیدرآباد مشاعرے میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے تو نصیر ترابی کی گاڑی میں محشر بدایونی، شاذ تمکنت، پیرزادہ قاسم اور راقم الحروف تھے۔ محشر بھائی (خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) بڑے دلچسپ مشفق اور مزیدار آدمی تھے۔ شاذ تمکنت (اللہ انہیں بھی جنت فردوس میں جگہ عطا فرمائے) بڑے وضعدار تیکھے اور طرحدار انسان تھے۔ محشر بھائی نے چپکے سے لطیفوں کی پوٹلی کھولی اور دیکھتے دیکھتے گاڑی لطیفوں سے لبریز ہوگئی۔ ہنسی مذاق ہو رہا تھا شاعری اور سیاست بھی زیر بحث آ رہی تھی۔ مگر ہم سب میں سنجیدہ باوقار اور کم گو شخص پیرزادہ قاسم تھا۔ جو اپنی نیک طینتی نیک سیرتی اور نیک صورتی کی وجہ سے سب کو بھلا لگتا تھا۔ وہ ہماری باتوں پر کبھی کبھار مسکرا دیتا۔ اور کبھی کبھی ایک آدھ چٹکلا سنا کر گاڑی میں اپنے وجود کا احساس دلا دیتا۔ اس کی مرنجاں مرنج شخصیت مجھے اچھی لگی۔ وہ سائنس کا طالب علم اور استاد بھی۔ ادب کا شیدائی بھی تھا اور خوبصورت غزلوں اور دلنواز ترنم کا مالک بھی پھر ہماری ملاقاتیں بڑھتی رہیں۔ مختلف محفلوں اور مشاعروں میں اسے سنا۔ درون ملک اور برون ملک بھی ملتے رہے۔ مجھے وہ محبتوں کا پیکر نظر آیا۔ اور پھر جب اس کا مجموعہ کلام ''تند ہوا کے جشن میں'' چھپ کر آیا تو ادبی حلقوں نے اس کا بھرپور سواگت کیا اس نے اپنے شعر کے لیے ایک پیمانہ وضع کر لیا:

ہوا کی شاخ پہ خوشبو کا ایک پھول کھلا
یہ کارِ فن تھا تو اس میں ہمیں زمانے لگے

یا

نہ پوچھیے کہ کہاں کیا ہے ان کہی کیا ہے
عذاب جھیل رہا ہوں سخنوری کیا ہے

عذاب جھیل کر سخن کی تخلیق کرنے والے اس شاعر نے انہی تازہ فکری اور شگفتہ خیالی کے اتنے بہت سے چراغ افق شاعری پر روشن کیے ہیں کہ تیز ہوا بھی اپنی پوری شدت کے باوجود انہیں نہیں بجھا سکتی۔ اس نے سخنوری اور ہنروری کے درمیان ایک دلکش توازن پیدا کر لیا ہے جو پڑھنے والوں کو تادیر اپنی گرفت سے نہیں نکلنے دیتا۔ اس کے ذہن اس کی فکر اور اس کے فن میں وہ تازہ کاری اور بانکپن موجود ہے جو روایات کی بنیادوں پر استوار ہو کر ماضی کو اپنے حال سے جوڑ کر مستقبل کی تابناکیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کی آواز ایک ایسے دکھی انسان کی آواز ہے جو سربوں میں چشمۂ آب کی جستجو میں سرگرداں ہے۔ روایت سے جدت کا ظہور اور قدامت سے تازگی کی مہک پیدا کرنا پیرزادہ قاسم کا کمال فن ہے۔ وہ ذہن انسانی کی پیچیدگیوں کا شناسا ہے اور ان کے اظہار کا تخلیقی فریضہ بصد عجز و افتخار ادا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے:

سخن محاسبہ ایسا اگر میں جھوٹ لکھوں
ردیف تنگ کرے قافیہ ستانے لگے

ہیں زخم زخم تو نغموں میں چاشنی کیسی
جو دل بجھا ہو تو باہر سے جگمگائیں کیا

یہ بجھے دل کا شاعر باہر سے خود نہ جگمگا رہا ہو تو دوسری بات مگر اس کے محسوسات کا نیا اظہار قاری کے ذہن میں نئی کہکشاں کو جگمگا دیتا ہے۔ اسی لیے اس کے کلام میں زندگی کے حادثات، واقعات، تجربات اور مشاہدات کئی حوالوں سے سامنے آتے ہیں۔ ان میں آس کی لو بھی ہے اور حسرت کی رو بھی امید و ناامیدی کی تگ و دو بھی ہے اور کشمکش تکمیل تمنا کی ضد بھی:

زمانہ میری شکست دل کا سوال ہی کیوں اٹھا رہا ہے
ابھی مرے زخم ہنس رہے ہیں ابھی مرا درد گا رہا ہے
میں بے سخن اور مرا فسانہ بھی ناشنیدہ رہا ہے لیکن
یہ آج کیا ہے کہ جس کو سینے مری کہانی سنا رہا ہے
یہ برگ و بار بھی لے جاؤ چوب جاں بھی مگر
نمو کی ایک رمق تو شجر میں رہنے دو
جینے کے لیے آخر جینے کا ہنر سیکھا
اب کا ہے کا اندیشہ اب کون سی دشواری
شکست دل میں بھی اک زندگی نظر آئی
دیا بجھا تو ہمیں روشنی نظر آئی
اب مرا درد بجھ گیا اب مرا زخم بھر چکا
پھر وہی دوست آئے گا مجھ کو یقین آ گیا

پیرزادہ قاسم نے اسلوب اظہار سے نئے قرینے تخلیق کر کے نہ صرف غزلوں کی کلاسیکی روایت کو زندہ رکھا بلکہ خیال و فکر اور جذبہ و احساس کی نت نئی قندیلیں روشن کر کے غزل جزیرے کو پرکشش اور دلنواز بنا دیا ہے۔ آنکھوں سے جھانکنے، دلوں میں دھڑکنے اور چہروں پہ تحریر اندوہ و غم کے اس آئینہ دار نے غزل کو رخسار و۔۔۔ اور چشم و لب کی فسوں گری سے نکال کر اس کے دامن کو وسیع کر دیا ہے اس کی آواز ذات کے دکھوں سے نکل کر کائنات کے المیوں میں ڈھل گئی ہے اور یوں یہ زندگی کی صدائے بازگشت بن گئی ہے۔ اس کے لہجے میں کہیں بھی کسی تلخی یا درشتی کا احساس نہیں ہوتا۔ خود ضبطی کے جوہر کو وہ کمال متانت سے سنبھالے ہوئے ہے:

ہم تو مثلِ برگ ہیں اپنا قیام و کوچ کیا
کل تھے شجر کے دوش پر آج ہوا کے ساتھ ہیں
کبھی ہوا تو کبھی خاک رہگزر ہونا
مرے نصیب میں لکھا ہے در بدر ہونا
ہم نے خستگی پائی دل گرفتگی پائی
خیر ہم نے کیا پایا دل دکھانے والوں سے
میانِ کارِ فن لفظوں کی قسمت جاگ اٹھتی ہے
غزل تخلیق کرتا ہوں محبت جاگ اٹھتی ہے

پیرزادہ قاسم کی ہر غزل میں حرف و معنی کی نت نئی پرتیں کھلتی ہیں وہ لفظ کو پرانے موضوع کے ساتھ نہ دہراتا ہے نہ اس خیال یا مضمون کا اعادہ کرتا ہے۔ وہ داخل سے خارج اور خارج سے داخل کا سفر کرتے ہوئے ایک دائرہ سا بناتا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے اس کی بیشتر غزلوں میں ایک ہی کیفیت کی زیریں لہریں ملتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں پیکر تراشی اور مصوری کی دلکش تصویریں نگاہوں میں تیر جاتی ہے اس نے اپنے کلام کو قنوطیت اور شکست خوردگی کی دلدوز آواز اور ناآسودگی اور خود رحمی کے جذبات کے اظہار کو وسیلہ نہیں بننے دیا۔ بلکہ اسے ایک نئی رجائیت بخش کر صنف غزل کی آبرو میں جاندار اضافہ کیا ہے:

میں کتنی بار دنیا تج کے جا بیٹھا ہوں گوشہ میں
مگر ہر بار دنیا کی ضرورت جاگ اٹھتی ہے

میرے لہو میں جل اٹھے اتنے ہی تازہ دم چراغ
وقت کی سازشی ہوا جتنے دیے بجھا گئی

اے عہد گراں گوش ترا حسن سماعت
ہم سے ہے کہ اک شور مچاتے ہی رہے ہم

درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے مری بساط کیا ایک دیا بجھا ہوا

ننھے دیئے کی جرأت و ہمت دیکھو تو
کیسا شب آشام ، ہوا ہے حیرت ہے

نہ لہلہائیں مرادوں کی کھیتیاں جن میں
تم ایسی آنکھوں میں خوابوں کی فصل بو لینا

پیرزادہ قاسم نے اپنے فن میں دھیمے دھیمے کرب ذات کو اس تمام اجتماعی دکھ کی تصویر بنا دیا ہے جس میں زندگی کی تعمیر کا سفر مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر بکھر گیا ہے۔ اس کا لہجہ نہ صرف ہمیں مرعوب کرتا ہے بلکہ ہمارے ذہنوں کو جھنجھوڑتا بھی ہے۔

کیا اسے بے حسی کہوں اب جو نہ دادِ سخن ملے
کرب تو سارے زیست کے آج نوا کے ساتھ ہیں

پیرزادہ قاسم نے شعر کو کارِ ہنرمندی ٹھہرا کر نصابِ زندگی بنا لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اب وہ زندگی کے افسانے کو اسی ندرت، شائستگی، تنوع اور دلکشی سے زندگی بھر رقم کریں گے۔

''نغموں کی گونج''

کائناتِ درد کو روشن کرنے والے اس فنکار نے زندگی کی حقیقت اور سچائی کو اپنے مسلک کے مطابق تلاش کر لیا ہے۔ درد کائنات بھی اسی سے روشن ہے فن کے ایوان میں بھی اسی کے نغموں کی گونج اور اجالا ہے اور دل دوستاں میں بھی اس کی محبت کا جلوہ ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

○○
○

''دردکی کائنات''

پروفیسر وسیم بریلوی
(بریلی، بھارت)

نہ کسی انگریزی ادیب کا قول نہ کسی جرمنی فلاسفر کا جملہ، نہ کسی عربی مفکر کا دعویٰ نہ کوئی دیومالائی حوالہ، بات اردو شاعر کی ہے تو کیوں نہ سیدھی اردو میں بات ہو، مستشرقین کے اقوال زریں کو سرخی تحریر بنا کر نہ تبحر علمی کا لوہا منوانا ہے نہ اردو فکر کو کم مائیگی الجھن سے دوچار کرنا مقصود ہے، ذکر ہے پیرزادہ قاسم کا۔ اردو کے ایک ایسے شاعر کا جو ایک غیر محسوس جادو کی طرح گذشتہ کئی دہوں سے اردو کے تاثراتی افق کے سر چڑھ کر بول رہا ہے مگر اس بے ضرر سلامت روی اور ایسی معصوم بے جگری کے ساتھ کہ اندر ہی اندر تیرا کی کا ہنر کیا فاصلہ طے کر گیا سمندر بھی نہیں جانتا۔ پینتیس سالہ سفر شب بیداری، میں شاید ہی دنیا کا کوئی اردو علاقہ بچا ہو جہاں کی نیندوں کا قرض مجھ پر نہ ہو اور شاید ہی اردو شاعری کی ایسی کوئی معتبر ہستی ہو جس کی صحبت و قربت سے فیض حاصل کرنے کا اس خاکسار کو موقع نہ ملا ہو، مگر اس لمبے صبر آزما سفر میں ایک پیرزادہ ہی ایسے ملے جن کے بارے میں کوئی منفی سوچ اندازِ فکر کو مبتلائے آزمائش کر دے بلکہ اس مجسمۂ شرافت کے بارے میں کچھ ایسا ویسا سوچئے تو خود کو گناہگار لگنے لگے۔ شاید اس خوبی کو اردو کی شعری روایت بہت زیادہ سنجیدگی سے نہ لے۔ اس لیے کہ غالبؔ سے مجازؔ و فراقؔ تک شاعر کی شاعری کو اس کی شخصیت و کردار سے الگ کر کے دیکھنے کی روایت عام رہی ہے۔ بہت عرصہ تک تو یہ ایک طے شدہ حقیقت سی بنی رہی کہ بے راہروی، شاہد پرستی، شاہد بازی، شراب نوشی و بدمستی کے بغیر اچھی شاعری ممکن ہی نہیں، امیرؔ اور داغؔ کا مشہور مکالمہ اس کا ثبوت ہے۔ بہت سے تو آج بھی اس طرز فکر کو تخلیقیت کا جزو لاینفک سمجھتے ہیں۔ چلئے سردست اس بحث کو یہیں چھوڑتے ہوئے یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ پیرزادہ کی شرافت نفس ان کی تخلیقی توانائی کا زیور بنی یا پاؤں کی زنجیر۔ سچ تو یہ ہے کہ تخلیق کا معتدل مزاج ہونا وقتی شعبدہ بازیوں کو بھلے ہی راس نہ آئے مگر تہذیبی و تمدنی قدروں کے فروغ میں جس توانائی کے ساتھ سرگرم عمل رہتا ہے اس تک پہونچ بھی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں بھڑکیلی آگ میں چاول پکے تو کنی ضرور رہ جاتی ہے، دھیمی دھیمی آنچ چاول کے جگر تک کو مسخر کر لیتی ہے۔ اعتدال پسند تخلیقیت بھی اس طرح دائمی قدروں کے تسلسل کا کچھ اس طرح حسن بنتی ہے کہ سیاق و سباق میں جائے بغیر اس کے سائے کو بھی چھو پانا مشکل ہے۔ پیرزادہ قاسم کے فن کو سمجھنے کے لیے ان کی شخصیت کے بنیادی عناصر ''اعتدال'' اور ''خلوص'' کو بہر حال نظر میں رکھنا ہوگا۔

اعتدال کی آنچ کھایا ہوا فنکارانہ رویہ نہ موسمی ہو سکتا ہے نہ کاروباری۔ جو راہ چلتے لوگوں کو دھوکا نہ دے سکے وہ بھلا خود کو کہاں دھوکا کھا سکتا ہے اس خود کی اہمیت پر توجہ دینا ضروری ہے۔ پیرزادہ اس ''دور قدکش'' اور اس ''عہد قدگر'' میں رہتے ہوئے بھی اس کے نہیں۔ یہی اُن کی پہچان ہے۔ وہ الاؤ کے پاس بیٹھے ہیں آگ کی تمازت سے چہرہ تمتما رہا ہے۔ پورا وجود ہی راکھ ہو جانے کے مرحلے میں ہے مگر عرفان ذات کو حیرت انگیز حد تک ڈھال بنا لینے والے پیرزادہ الاؤ کی شعلہ نفسی کو بھی شرمندہ نہیں ہونے دیتے، نہ بھاگتے ہیں اور کسی طرح متزلزل بھی نہیں ہوتے یہ ان کا مزاج ہے۔ بڑے بڑے مشکل لمحوں میں ان کی معنی خیز مسکراہٹ انہیں دلدل میں کنول کی طرح کھلائے رکھتی ہے اور یہ بات کسی میں یوں ہی نہیں آ جاتی اس کے پیچھے وہ تمام تہذیبی عوامل کارفرما ہیں جو انہیں خاندانی عظمتوں سے ورثہ میں ملے ہیں۔ بقول ان کے ''روشنی جاں کو حرف سخن بنانے کا عمل میرے یہاں غیر فطری طور پر نہیں آیا۔ بلکہ اس کے محرکات میں میرے گھر کی ادبی و علمی فضا اور میرے گھرانے کی سماجی، سیاسی اور دینی روایات شامل ہیں'' جس میں کے گھر دادا سے ماں باپ تک شاعری اور صحافت کا چلن رہا ہو، اور جس کے گھرانے میں عبد الرحمٰن بجنوری، مولانا حفظ الرحمٰن، حافظ ابراہیم، نہال سیوہاری اور خورشید الاسلام جیسے ناموں کی گونج رہی ہو اور جس کی خاندانی روایات متصوفانہ بے غرضیوں کی آنچ میں تپ کر کندن ہوئی ہوں وہ کوئی بھی میدان چنتا ''پرواز میں کوتاہی'' کے جرم کا مرتکب بہر حال نہیں ہو سکتا تھا۔ نظریاتی ثابت قدمی بازار سے خرید لانے کی چیز نہیں یہ تو تربیت فکر و نظر کا وہ ثمرہ ہے جو دعا اور دوا دونوں کے صدقہ میں مقدر ہوتا ہے اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ بتائے نہ بنے۔ پیرزادہ سے بات کیجیے یا ان کا کلام سنئے ان کا تہذیبی ورثہ بولے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے ساتھ پاکستان کے علاوہ دیگر ملکوں کے مشاعروں میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ امریکہ میں تو تقریباً تین ماہ رہنا ہوا اور شمالی امریکہ کے کئی اہم مشاعروں میں ان کا ساتھ رہا۔ منظر یہ ہے کہ ہم لوگ کسی شہر میں ساتھ ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں اہل خانہ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اپنی ذاتی مصروفیات کے پیش نظر گھر اور گھر کا جملہ سامان تمول ہم شعراء کی ذمہ داری پر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ ہم ہی میں سے ایک شاعر دوست کی چشم التفات ٹیلی فون کی طرف ہوتی ہے، فون اٹھاتے ہیں اور شروع ہوتا ہے مقامی و غیر مقامی کالوں کا ایسا سلسلہ کہ لامتناہی کہ ٹیلی فون بھی کہہ اٹھے ''ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا''۔ موصوف فون کیے جاتے مگر افراد خانہ کی عدم موجودگی میں فون کے اس تصرف بیجا کا تمام تر کرب پیرزادہ کے چہرہ پر ایک رنگ آنے اور ایک جانے کی شکل میں کچھ اس طرح ابھرتا جیسے اس سب کے لیے وہ خود ہی ذمہ دار ہوں۔ اپنے ہم نفسوں کی مجرمانہ زیادتی کے لیے بھی خود کو گناہگار ٹھہرانے کا سلیقہ ہی میرے خیال میں ان کے فکری رویہ کی پہچان ہے:

روح کا کیسا ہی زیاں ہو مگر
نفس کو اک لقمۂ تر چاہیے

جااور بیجا، صدق وریا اور جائز ناجائز کے بیچ تناؤ زدہ فاصلوں کی زد پہ رہنا ہی ان کی کمزوری ہے اور یہی ان کی طاقت بھی۔ اعتبار درد کا یوں طرح طرح سے لفظوں میں ڈھلنا اور اپنی راہ خود بنالینا کوئی کھیل نہیں۔ وہ نہ بے ضمیر دعووں کے شاعر ہیں نہ بڑا بننے کی بے زمین حکمت عملی کے، وہ تو پوری ایمانداری سے بے ایمانیوں کے خلاف صف آراء ہیں۔ تخلیقیت کے آتشیں کس بل کو کاغذی لفظوں کے سپرد کر کے اپنا تماشا خود دیکھتے ہیں اور ہر گزرنے والے کو ادھر ہو کر گزرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ انہیں اس کی پرواہ نہیں کہ کوئی کیا کہہ رہا ہے وہ تو اس میں لگے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، دیکھئے تو ان کی شاعری بھی تین واضح رنگوں سے عبارت ہے۔ مشرقی محبت کی بے لوث خود اذیتی اور خود کش شائستگی، ہجرت نصیبی کے درد کی توسیع کا رنج اور انسانی و آفاقی قدروں کی بے وقعتی و بے حیثیتی کا احساس، محبت ان کے روم روم میں سمائی ہے مگر لگتا ہے محبت انہوں نے اتنی کی نہیں جتنی ان سے کی گئی ہے۔ اتنا سنبھلا ہوا وہ ہی رہ سکتا ہے جسے آخری فتح کا یقین ہو۔ محبت کا بے محابہ اظہار بھی ان کی غزلوں میں کم ہی ہوا ہے ہاں اکثر اشعار میں ایک بے نام تعلق کی دھیمی دھیمی آنچ محسوس کی جاسکتی ہے:

ہمیں جلدی بہت تھی عشق میں برباد ہونے کی
کہ پیش و پس میں پڑ کے وقت کو برباد کیا کرتے

یہاں ان کا مسئلہ ہر جذباتی انسان کی طرح یہ ہے کہ انہیں معلوم ہی نہیں کہ وہ چاہتے کیا ہیں:

ایک خواب نادیدہ روز ٹوٹ جاتا ہے
زخم خوردہ آنکھوں میں کرچیاں بہت سی ہیں

محبت اور واردت دل کا اظہار ان کی نظموں میں ہوا ہے جہاں انہوں نے بڑی فراخدلی سے ہار جیت کے کھیل کھیلے ہیں، بے بسی، ملاقات، بے سخنی اس کی مثال ہیں۔ مگر ان کی غزلیہ شاعری میں اس تسلسل کرب کا عکس زیادہ ہے جو ہجرت نصیبی سے شروع ہوا ہے تو قدری معاشرہ بکھراؤ کے کئی موسم سہہ لینے کے بعد بھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا:

ایک ہی داستان شب ایک ہی سلسلہ تو ہے
ایک دیا جلا ہوا ایک دیا بجھا ہوا

مجھ کو نشاط سے فزوں رسم وفا عزیز ہے
میرا رفیق شب رہا ایک دیا بجھا ہوا

درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی
ویسے مری بساط کیا ایک دیا بجھا ہوا

شکست و ریخت کی انتہاؤں میں سانس لیتی، ان دیکھی سراسیمگی سے جوجھتی، زندگی کا یہ اطمینان کہ درد کی کائنات میں مجھ سے بھی روشنی رہی، فکر انگیز بھی ہے حوصلہ افزا بھی۔ حالات کی چیرہ دستی انہیں بے دست و پا نہیں ہونے دیتی یہ ان کا متصوفانہ خمیر ہی تو ہے جو ایک در بند ہو تو سو در کھلنے کی امید رکھتا ہے:

میرے لہو میں جل اٹھے اتنے ہی تازہ دم چراغ
وقت کی سازشی ہوا جتنے دیے بجھا گئی

کھوکھلی نمائشوں بے ضمیر رونقوں اور مادیت کے نظر فریب سرابوں کے پیچھے بھاگنے والوں کا حشر اس سے بہتر کیا بیان ہوسکتا ہے:

تیز ہوا کے جشن میں لوگ گئے تو تھے مگر
تن سے کوئی قبا چھنی سر سے کوئی ردا گئی

صبر و جبر کی ازلی کشمکش کا یہ رخ بھی دیکھئے:

میں کتنی بار دنیا تج کے جا بیٹھا ہوں کونے میں
مگر ہر بار دنیا کی ضرورت جاگ اٹھتی ہے

بکھراؤ شخصی و اجتماعی سطح پر ہی نہیں فکری سطح پر بھی ہے۔ معیار نقد و نظر بھی موسمی تقاضوں کے اثر سے محفوظ نہیں، چنانچہ ہوتا کچھ ہے دکھائی کچھ دیتا ہے۔ دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا۔ پیرزادہ کا یہ شعر ایسے شعبدہ بازوں کے لیے تازیانہ سے کم نہیں۔

عجب دیکھا کرشمہ لفظ کی بازی گری کا بھی
سخن معدوم ہو جاتا ہے شہرت جاگ اٹھتی ہے

سچی سوچوں اور بے نفسی کی رعایتوں کے اس محاذ سود و زیاں پر ڈٹے رہنا زندگی کے سامنے سوال نہ کھڑے کر دے ناممکن ہے۔ چنانچہ پیرزادہ کا یہ ردعمل بہت فطری ہے:

یہ سوچتے ہیں کب تلک ضمیر کو بچائینگے
اگر یوں ہی جیا کئے ضرورتوں کے درمیاں

ہزار بردباریوں کے ساتھ جی رہے ہیں ہم
محال تھا یہ کارزیست وحشتوں کے درمیاں

حالات کی بے راہروی جب ثقافتی مسلمات و کلیات پر طعنہ زن ہو تو ان کا درد دیکھنے کا ہوتا ہے:

ہاں یہ دستارِ فضیلت بھی قبائے زر بھی
خود کو دیکھو تو یہ پوشاک بدل کر دیکھو

فراز دار پر کوئی نہ ہم کو پہچانا
زمانے والوں کی خوش قامتی نظر آئی

پیرزادہ کا غم یہ ہے کہ وہ لیل و نہار تازہ کا خواب آنکھوں میں لے کر نکلے تھے مگر آنکھوں کے تجربوں نے خوابوں کی حقیقت کھول دی:

''چہارسُو''

اداس اداس یہ دیوار و در بتاتے ہیں
کہ جیسے راس نہ ہو ان کو میرا گھر ہونا

گھر کی جب یاد صدا دے تو پلٹ کر آ جائیں کاش ہم
اپنی ہی خواہش کو میسر آ جائیں

بجنور کی مردم خیز زمین سے اٹھی یہ ہجرت نصیب مٹھی بھر خاک تقسیم کی آندھی کے ہاتھوں کراچی تو جا پہنچی مگر ہنوز دردِ دربدری کے رحم و کرم پہ رہنے کا المیہ اس کا مقدر ہے اسی المیہ کا عکس پیرزادہ قاسم کی شاعری میں جا بجا دکھائی دیتا ہے مگر وہ اس سلگتے ہوئے آج کے سامنے امید فردا کو تج دینے کے حق میں نہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری الجھن میں اطمینان اور انتشار میں سکون بخشتی ہے۔ ان کا تہذیبی خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے اس نے سینکڑوں طوفانوں کے رخ موڑے ہیں اور کچھ کو رسر سے گزر جانے کی بھی اجازت دی ہے مگر بشارت نور کی علامت یہ خمیر خوب جانتا ہے کہ ہار جیت میں کیسے بدلا جاتا ہے۔ اسی لیے پیرزادہ کا فن نئے امکانات کی نشاندہی سے عبارت ہے۔

''علم الابدان کے ماہر''

مجھے محترم ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کی ہمہ پہلو شخصیت کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ جس بات نے مجھے بے انتہا متاثر کیا وہ یہ ہے کہ موصوف علم الابدان کے ماہر استاد و محقق کی حیثیت سے سائنسی طریقہ، تجزیہ، مشاہدہ و تجربہ پر عبور رکھتے ہیں لیکن باوجود اس کے وہ ایک پرگو غزل گو شاعر بھی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ناقدین فن ان کی شاعرانہ عظمت کو اجاگر کریں گے اور تاریخ غزل گوئی میں ان کے مقام کا تعین کریں گے اور ان کے سائنسی کارناموں کو بھی ان کے رفقاء نمایاں کریں گے۔

ڈاکٹر پیرزادہ کو اللہ تعالیٰ نے انتظامی صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے۔ شعبہ کے سربراہ امور طلبہ و طالبات کے شعبہ سے جامعہ کراچی میں عرصہ تک وابستہ رہے ہیں۔ میرے دور سربراہی میں ڈاکٹر صاحب طلباء کے تمام طبقوں میں مقبول رہے اور جامعہ میں امن و امان قائم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ میں ذاتی طور پر ان کا ممنون و مشکور ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر منظور الدین احمد

○

''روایت اور تہذیب کا امتزاج''

پروفیسر پیرزادہ قاسم کی شاعری میں روایت، تہذیب اور اپنے عصر کا ایسا امتزاج ملتا ہے جو دوسروں کے ہاں کم کم نظر آتا ہے۔ وہ شعر کو ایسے خوبصورت انداز میں سجا کر پیش کرتے ہیں کہ ان کے بہت سے اشعار سننے والوں کی زبان پر چڑھ کر دلوں کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ ان کے ہاں عشق و محبت کی روایتی علامتوں میں ہمارے عصر کی آواز واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ ان کے لہجے میں ایسی نرمی، ایسی شائستگی اور لفظوں کے انتخاب میں ایسا سلیقہ ہے کہ ہر لفظ اپنی جگہ پر ستارے کی طرح چمکنے لگتا ہے۔ ان کے پڑھنے کا انداز بھی ایسا رسیلا اور پراثر ہے کہ شعر دو آتشہ ہو کر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ ''شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو'' دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں عمرِ نوح عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر جمیل جالبی

○○
○

''جبرِ وقت کی سختی''

(پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی کے نظمیہ کلام کی شیرینی)

عطیہ سکندر علی (سکھر)

ہم خود بھی اپنے ساتھ نہیں

اک کبھی نہ بیتنے والی شب
اک ہاتھ نہ آنے والا دن
اِس شب سے جان چھڑانے میں
اُس دن کو ڈھونڈ کے لانے میں
ہم ریزہ ریزہ ہو کے رہے
جو پایا تھا وہ کھو کے رہے
اس پانے میں اس کھونے میں
ہونے میں اور نہ ہونے میں
کچھ سود و زیاں کا ہاتھ ہے کیا
یا اور ہی کوئی بات ہے کیا
اس ساری اضافی باتوں میں
بس ایک ہی بات ضروری ہے
یاں شب کی سحر سے دوری ہے
اس شب کے تسلسل میں پنہاں
اک گھور اندھیرا جہل کا ہے
جس جہل کی کالی آندھی نے
جیون کے سچ کو چاٹ لیا
اور ہم نے اسی ویرانی میں
اک اندھا جیون کاٹ لیا
اس کالے اندھے جیون میں
غربت کی تیرہ بختی نے
کچھ قسمت کے احسان نے بھی
کچھ جبرِ وقت کی سختی نے
انسان سے کیا کچھ چھینا ہے
یہ جینا کیسا جینا ہے
پس ماندگئی جاں روح تلک
در آئی سیاہی اوڑھے ہوئے
ہم مقتلِ شب میں آ بیٹھے
انکار کا دامن چھوڑے ہوئے
انکار کہ جسکی جنبشِ لب
ہر شب کی سحر بن سکتی ہے
یہ جرأت و نافرمانیٔ شب
بے بس کی سپر بن سکتی ہے
پھر کیوں اس قتل گہہِ شب میں
آ بیٹھے ہیں جی ہار کے ہم
اقرار سے لب آسودہ سہی
منکر تو نہیں انکار کے ہم

اس شب در شب تاریکی میں
جو رات بھی ہے وہ رات نہیں
اس ہارنے والی بازی میں
جو مات بھی ہے وہ مات نہیں
کچھ قسمت کی سفا کی نہیں
کچھ سود و زیاں کا ہاتھ نہیں
بس ایک ہی دکھ بے پایاں ہے
ہم خود بھی اپنے ساتھ نہیں

○

موسم مرے دل کے

میرے گھر کے آنگن میں تو
جانے پہچانے سب موسم
اپنے وقت پہ آ جاتے ہیں
موسمِ گُل میں
سُرخ گلاب اور پیلا گیندا
اُجلا بیلا، گوری چنبیلی
چمپا اور گلِ داؤدی
کتنے رنگ بکھر جاتے ہیں
پھر موسم کروٹ لیتا ہے
یخ بستہ بے مہر ہَوا
جب رقصِ زمستاں کا آغاز کیا کرتی ہے
سارا آنگن زرد شکستہ جاں پتّوں سے بھر جاتا ہے

میرے دل کے آنگن میں بھی
یہ جانے پہچانے موسم آتے جاتے رہتے ہیں
لیکن یہ اک بات عجیب ہے
کشتِ دل میں جتنی قسموں کے بھی پھول کِھلا کرتے ہیں
سارے سرخ ہُوا کرتے ہیں
اور پَت جھڑ میں یخ بستہ بے مہر ہَوا
جب رقصِ زَمستاں کا آغاز کیا کرتی ہے
شاخوں سے گرنے والے پتّے بھی
سبز ہُوا کرتے ہیں

○

ہمیشہ قتل ہو جاتا ہوں میں

بساطِ زندگی تو ہر گھڑی بچھتی ہے اٹھتی ہے
یہاں پر جتنے خانے جتنے گھر ہیں
سارے
خوشیاں اور غم انعام کرتے ہیں
یہاں پر سارے مُہرے
اپنی اپنی چال چلتے ہیں
کبھی محصور ہوتے ہیں، کبھی آگے نکلتے ہیں
یہاں پر شہ بھی پڑتی ہے
یہاں پر مات ہوتی ہے
کبھی اک چال ٹلتی ہے
کبھی بازی پلٹتی ہے
یہاں پر سارے مُہرے اپنی اپنی چال چلتے ہیں
مگر میں وہ پیادہ ہوں
جو ہر گھر میں
کبھی اس شہ سے پہلے اور کبھی اُس مات سے پہلے
کبھی اک بُرد سے پہلے کبھی آفات سے پہلے
ہمیشہ قتل ہو جاتا ہے

○

مقتل میں مکالمہ

قتل گاہ کی رونق
حسبِ حال رکھنی ہے
غم بحال رکھنا ہے
جاں سنبھال رکھنی ہے
زورِ بازوئے قاتل
انتہا کا رکھنا ہے
دشنہ تیز رکھنا ہے
اور بلا کا رکھنا ہے
اور کیا مرے قاتل
انتظام باقی ہے
کوئی بات ہونی ہے
کوئی کام باقی ہے
وقت پر نظر رکھنا
وقت ایک جادہ ہے
ہاں بتا مرے قاتل
تیرا کیا ارادہ ہے
وقت کم رہا باقی
یا ابھی زیادہ ہے
میں تو قتل ہونے تک
مسکرائے جاؤں گا

○

اندیشۂ فردا

زیست کے جھمیلے میں
زندگی کے میلے میں
صبح رونقِ امروز
شام رونقِ امروز
صبح دل میں اِک سُورج
شام دِل میں اِک تارا
وہ بھی جگمگاتا ہے
یہ بھی جھلملاتا ہے
پھر خیال آتا ہے
کل کی فکر کیسے ہو
سوچ پُر بُریدہ ہے
ذہن سَم چشیدہ ہے
آنکھ آبِ دیدہ ہے
خواب خواب مستقبل
خواب خواب فردا ہے
پھر بھی صبح اِک سورج
پھر بھی شام اِک تارا
دِل میں جگمگاتا ہے
روز جی جلاتا ہے

○

یہ بندۂ کمینہ

اک عمر سے جو صف آرا تھے
دشمن تھے کہ تھے دلدار گئے
جُز ایک ہزیمت کچھ نہ ملا
گو جنگ میں ہم سو بار گئے
کچھ تیغ و تفنگ نہ کام آئے
سب طبل و علم بیکار گئے
ہم اپنے آپ ہی دشمن تھے
سو دونوں بازی ہار گئے

اب دور تلک جو بکھرا ہے
بستی بستی صحرا صحرا
وہ میں بھی ہوں وہ تو بھی ہے
بے نام و نمود ذرّا ذرّا
بے قیمت ذرّے یکساں ہیں
الماس نشان نیلم آسا
اک گونج اٹھی سنّاٹے میں
پھر وقت نے کچھ ارشاد کیا
ہے وقت کا بس ارشاد یہی
جو عمر ہے باقی خاک اڑا
یا خود کو بہم کرنے کے لیے
خوابوں سے نکل موجود میں آ
سو خواب سے میں بیدار ہوا

اب کرچی کرچی چن چن کر
میں اپنا آپ بناتا ہوں
اک پیکر کی تیاری میں
سو ٹکڑے جوڑے جاتا ہوں
اس ناکارہ انبار میں بھی
کچھ ڈھونڈتا ہوں کچھ پاتا ہوں
میں ڈھونڈتا ہوں
سچ کھوجنے والی آنکھیں ہوں
سچ بولنے والے لب لوگو
بے لاگ سماعت کی صورت
کچھ روشن سوچ کے ڈھب لوگو
وہ دل کہ جسکی دھڑکن میں
جُز اسمِ محبت کچھ بھی نہ ہو
لیکن ان بکھرے ٹکڑوں میں
وہ آنکھیں، لب، وہ ذہن رسا
وہ دل اک نور محبت سا
میں اب تک ڈھونڈ نہیں پایا
کچھ سوچ کے پھر رہ جاتا ہوں
اب خود سے بھی شرماتا ہوں
یعنی میں جیسا تھا پہلے
پھر ویسا بنتا جاتا ہوں

○

بروری روڈ

آغا گل

(کوئٹہ)

بہت دنوں سے یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ شال کوٹ کے مغرب میں مٹی کے ویران بے آب وگیاہ ٹیلوں پر انگریزوں نے شراب کی فیکٹری لگالی ہے۔خان قلات سے نوشکی کوئٹہ اور درہ بولان دراصل اجارہ داری پہ حاصل کیا تھا۔مگر انہوں نے کوٹہ (قلعہ) جسے وہ اپنے تلفظ میں کوئٹہ کہا کرتے ایک فوجی چھاؤنی میں بدل ڈالا۔۱۸۸۳ء میں اچانک ہی ابھرنے والی چھاؤنی زلف یار کی طرح دامِ صیاد بنتی چلی گئی۔حتیٰ کوئٹہ بروری (BREWERY) بھی قائم کر لی۔خان قلات تک خبر پہنچی تو اس نے برہم ہو کر کیپٹن ڈیو (ازاں بعد کرنل اور پولیٹکل ایجنٹ ریاست قلات) کی سرزنش کی ''براہوی شراب، جواء یا دیگر خرافات کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ آپ نے شراب کی فیکٹری کیوں لگالی ہے۔ آپ تو کہتے ہیں کہ زارِ روس سے آپ کو خطرہ ہے اور یہاں شراب پینے بیٹھ گئے۔اب کیا جوّا خانہ بنانے کا بھی ارادہ ہے۔ بند کریں یہ شراب خانہ۔سمیٹ لے جائیں یہ کوئٹہ بروری۔''

کپتن ڈیو بھی گرگ باراں دیدہ تھا وہ جھٹ بولا ''یور ہانس! کمانڈر اپنے سپاہیوں کے ہاتھوں بے بس ہوتا ہے۔لڑتے تو سپاہی ہی ہیں۔دنیا کے کئی ایک ملکوں میں بھی شراب بطور راشن سپاہیوں کو دی جاتی ہے۔ یہ نیٹو سپاہی تو یقین کریں دشمن کی گولیوں کی بجائے شراب نہ ملی تو سردی سے ہی فوت ہوں گے۔اتنی Heavy Causallty ہم برداشت نہیں کر سکتے شراب ہی انہیں گرم رکھتی ہے۔''

خان نے ناگواری سے کہا ''ہماری زمین پر شراب خانہ نہیں بن سکتا۔آپ سرکار برطانیہ کو آگاہ کریں براہوی اگر بگڑ بیٹھے تو انہیں سنبھالنا مشکل ہوگا'' براہوی لوک شاعری میں ڈیہو کے نام سے یاد رکھا جانے والا کیپٹن ڈیو بھی ایک ہی کائیاں تھا۔زیرک انسان تھا زیر مونچھ مسکرا کر سوال کر ڈالا ''یور ہانس کچھّی میں بھی تو Crude طریقے سے شراب بنتی ہے، صدیوں سے بن رہی ہے'' خان کی آنکھوں میں غصّہ کوند گیا۔مگر کسی مدّبر حکمران کی مانند اس نے خود کو سنبھالے رکھا۔ ''ہاں صدیوں سے بن رہی ہے۔میر محراب خان کے خون بہا میں کچھی کا علاقہ ریاست قلات کو ملا ہے، عادتیں سنوارنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔وہاں چھپ چھپا کر بھٹی لگاتے ہیں۔آپ کی طرح تو نہیں کہ اونٹ نما بروری خنجر کی طرح لوگوں کے سینوں میں گاڑ دی ہے۔''

انگریز بڑے منجھے ہوئے افسروں کو ہی پولیٹکل ذمہ داریاں سونپا کرتے تھے۔کیپٹن ڈیو بھی چکنا گھڑا ثابت ہوا۔ ''ہم نے علاقہ اجارہ داری پر لیا ہے۔ہم آپ کے کرایہ دار ہیں۔جیسے چاہیں رہیں۔آپ کے یہ بڑے بڑے صحرا ہیں۔ کہتے ہیں کہ براہوی سے دوستی کرو تو دروازہ بھی بڑا رکھو تا کہ اس کے اونٹ بھی اندر آسکیں۔ بڑے دل کے لوگ ہیں آپ! میرے نیٹو سپاہیوں کی خاطر آپ ان سے درگزر کریں۔''

سیاسی طور پر یہ ایک کھلم کھلا انکار تھا۔اب محض ایک شراب خانے کیلئے انگریزی فوج سے ٹکرانا بھی مناسب نہ تھا۔انگریز آدھی دنیا کے مالک تھے۔ان کے پاس دور مار توپیں بھی تھیں باغی سپاہی اور جنرل بخت خان رانی جھانسی بھی تو لڑی تھی!! شراب خانے کی خبر لنج پاس سے ہوتی ہوئی منگ پہنچی۔ ادھر کردگاپ درینگڑ سے نوشکی گئی۔یہ خبر رکنے کی نہیں تھی۔علماء سخت ناراض ہوئے ادھر میانوں میں تلواریں مچلنے لگیں۔اگرچہ سردار تو انگریزوں کو قبول کر چکے تھے۔ اور ان سے مراعات حاصل کر رہے تھے۔جیسا کہ اشرافیہ کا وطیرہ ہے کہ وہ ہمیشہ نئے حکمران کی وفا کا دم بھرنے لگتے ہیں۔تا کہ ان کی طاقت اور دولت میں اضافہ ہوتا رہے۔ جبکہ عوام ہی سر کٹانے کیلئے جدوجہد کرتے ہیں۔ اور ہر دور میں معتوب بھی رہتے ہیں۔انگریزوں کا جاسوسی نظام بھی سرداروں کے بل پہ چل رہا تھا۔سرداروں کو گھر بیٹھے رقوم ملا کرتیں۔ لیویز کے سپاہی بھرتی کرنے کا بھی اختیار تھا۔اکثر و بیشتر ساری رقم خود ہی ہڑپ کر لیا کرتے۔بصورت خیرات کبھی کبھار کچھ رقم ایسے لیویز والوں کو بھی دیا کرتے۔جس کے باعث لیویز کو بے دلی سے کام کرنے کی عادت پڑ گئی۔انہیں یہ بھی علم نہ تھا کہ آیا تنخواہ چند ماہ بعد ہی سہی کیا مل ہی جائے گی؟ اور سردار سے تنخواہ کا مطالبہ کرنا تو خزانے پہ بیٹھے ناگ کو چھیڑنے کے مترادف تھا۔جو سرداران کے بھرّے میں نہ آتا اسے چلتا کرتے اسی کی قوم میں سے کوئی میر جعفر چن لیا کرتے انہوں نے شاہی جرگہ بھی بنا رکھا تھا جو ان کے کہنے پر آزادی پسند مجاہدین اور سرمچاروں کو طویل سزائیں سنا دیا کرتا۔ جس کی توثیق خان قلات کو کرنا ہوتی۔ بلوچستان میں سزائے موت کا قانون نہ تھا۔ برٹش بلوچستان میں تو مجاہدوں کو پھانسی سے کم سزا نہ دیتے لیکن ریاستی بلوچستان میں معر قید اور طویل سزائیں سنا کر بھی مطمئن نہ ہوتے۔ایسے حاکموں کی بروری پہ حملہ کرنا کارِ دشوار تھا۔زیر زمین میٹنگوں میں فیصلے کیے گئے کہ مجاہد مختلف ٹکڑیوں میں غیر محسوس طور پر وسیع علاقے میں پیش قدمی کریں۔اور پھر قریب پہنچ کر بروری پر دھاوا بول دیا جائے۔حساس اداروں نے کوئٹہ بروری پر حملے کے امکانات کی رپورٹ پہنچا دی تھی۔ بروری کا منیجر ناتھو رام کلکتہ سے تھا۔ شراب بنانے اور فروخت کرنے کے فن کا تو ماہر تھا مگر جنگ وجدل سے اس کی جان جاتی۔ وہ بہت ہراساں ہوا اور کمانڈر کے پاس آ کر باریابی کی اجازت چاہی۔انگریز افسران کی بدحواسی سے خاصے محظوظ ہوئے۔ ''لڑنا مرنا تو مردوں کا کام ہے۔''

ناتھو نے ادب سے انکار میں سر ہلایا ''میری زندگی کا مقصد پینا پلانا اور خوش رہنا ہے۔ مجھے باز رکھیں۔'' اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ یوں تو نفری بڑھا دی گئی تھی مگر وہ خوفزدہ سا التجا کیے گیا کہ چار سپاہی کچھ نہیں کر سکتے۔ پوری بٹالین دی جائے وہ بھی سکھ۔ گورکھا یا پھر راجپوت جوڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ اتفاقاً اس وقت ٹی بریک تھا۔ کمانڈر بھی ذہنی طور پر فارغ تھا اور خوشگوار موڈ میں بھی تھا۔ اس نے خوفزدہ سولین افسر چائے نوشی میں شامل کر لیے۔ ان کا خوف دور کرنے کے لیے کمانڈر عسکری زبان میں تکنیکی رموز بیان کرنے لگا۔ وہ ان کا مورال بلند کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

''فرض کیا برا ہوی حملہ بھی کریں تو یہ ایک انفرادی فعل ہوگا۔ کچھ جذباتی لوگ ہوں گے۔ ان کے پاس محمود خان۔ سیاہ مار۔ رخدار توڑے دار بندوقیں ہیں۔ باپور کو بارود ڈال کر بار بار پھیرتے ہیں۔ اگر بارش ہو تو یہ بندوقیں بھیگ کر ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ ان کی موثر مار پچاس گز سے زیادہ نہیں۔ ہاں لشکر سامنے ہو تو بہتر گز تک زخمی کر سکتی ہے۔ ان کے پاس جو رخدار ہیں یعنی Grooves والی بندوقیں ان کی مار سو (۱۰۰) گز سے ایک سو بیس (۱۲۰) گز تک ہے۔''

شراب خانے کا منیجر غمناک آواز میں منمنایا۔

''مگر بندوق تو بندوق ہوتی ہے، مار ہی ڈالتی ہے چاہے دیسی ہو یا ولایتی ان کے پاس تلواریں بھی تو ہوں گی۔''

کمیدان مسکرایا ''ہمارے سپاہیوں کے پاس آئین فیلڈ 303 رائفلیں ہیں۔ ان کی موثر مار ہزار گز تک ہے ویسے لشکر یا اجتماع کیلئے دو ہزار گز تک بھی زخمی کرنے کی صلاحیت ہے ہماری فائر پاور ان سے ہزاروں گنا زیادہ ہے''

کیپٹن جیمز نے ان کا حوصلہ بڑھایا ''ان کی رائفل کے Grooves اچھے نہیں ہوتے۔ گولی بجائے گول گھومتے ہوئے نکلنے کے کسی شرابی کی طرح لہراتی ہوئی نکلتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ جسے آپ مارنا چاہیں اس سے دو قدم ہٹ کر کھڑے ہونے والے کو وہ گولی لگ جائے۔''

نیٹو (Native) سپاہی مے خانے بنا جی نہیں سکتے تھے۔ سکھ یوں تو گرونانک کی تعلیمات کے باعث تمبا کو نوشی سے اجتناب کرتے۔ مگر گلاس میں تلچھٹ بھی نہ چھوڑتے جن وہسکی یا برانڈی انہیں دوآبہ کے کھیتوں میں لے جاتی۔ جہاں کسی کھوئی سے پانی بھرتی ٹیاران کی یاد میں آنسو پیئے جاتی۔ کھلے جھمکے پہنے جانے کون کون سامنے چلی آتی اور اپنے لونگ کے لشکارے مارتی پہلو میں آ بیٹھتی۔ کمانڈر بھی کوئٹہ بروری وقتی طور پہ ہی سہی بند کروا کے اپنے سپاہیوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے میرٹھ کی بغاوت یاد تھی جسے بپا تو منگل پانڈے نے کیا تھا اور سنبھالنا پڑا تھا اس کے باپ جو وہیں تعینات تھا۔ اس نے ایک پلٹن بغرض حفاظت مدہوش کرنے والی بروری پہ لگا دی۔ ایک برجی بھی بنوا دی تا کہ سپاہی دور بین سے دشت وصحرا کا جائزہ لیتا رہے۔ خصوصاً میان غنڈی (دو پہاڑیوں کے مابین) اور گگوئی پہ نظر رکھے اور کلی کرانی کے باغوں پہ بھی نگاہ رکھے۔ کسی غیر معمولی نقل وحرکت پر فوری ردِعمل کا حکم بھی دیا گیا تھا۔

ان قابل قدر انتظامات کے باعث سپاہی مطمئن سے ہو گئے۔ اور ان کی بے کلی اور بے چینی ختم ہو گئی۔ لنگر کے جاسوسوں نے خبر دی کہ فضا خوشگوار ہو گئی ہے۔ کام ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ گیرژن کا ماحول حسب سابق ہے۔

ادھر براہوی جنگجو مال مویشی لیے اونٹ چراتے، جلانے کے لیے جھاڑ جھنکار جمع کرتے دھیرے دھیرے بچتے بچاتے بروری کی جانب غیر محسوس طور پر بڑھتے ہی چلے گئے۔ چونکہ وہ ایک وسیع علاقے میں حرکت رہے تھے۔ اور مقامی آبادی ان سے تعاون کر رہی تھی حساس اداروں، بے حس اداروں اور لیویز کو بھی علم نہ ہو سکا کہ پیش قدمی کرنے والے خطرناک فاصلے تک آ پہنچے ہیں۔

سوموار ۶ مارچ ۱۸۹۹ء کی ایک یخ بستہ شام کو انہوں نے اپنی پوزیشنوں میں نماز مغرب ادا کی۔ بعض نے فرط جذبات میں نیام سے تلواریں کھینچ کر نیام توڑ ڈالے۔ جسکا مطلب تھا کہ اب فتح حاصل ہو گی یا شہادت۔ آگے آگے بندوقچی (MUSKETEERS) کی ضرورت تھی۔ کیونکہ زمین ناہموار تھی۔ جھاڑیاں بھی تھیں اور TERRAIN یک دم حملے کے لیے موافق نہ تھی۔

اچانک بروری پر تین اطراف سے حملہ ہوا۔ بندوقچیوں نے سب سے پہلے برجی کو کلیئر کیا۔ سرمچار دو سیڑھیاں ساتھ لیے آئے تھے جن کی مدد سے بروری کے اندر کود پڑے۔ فائرنگ کے تبادلے سے کچھ ہی دیر میں بروری کا گیٹ بندوقچیوں نے چھلنی کر کے توڑ گرایا۔ وہ اس قدر قریب آ چکے تھے کہ بندوقچی بھی تلوار سونت کر سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے گھمسان کا رن پڑا۔ رات کی تاریکی میں گولیوں کی تڑاتڑ بندوقوں کی دھنا دھن اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی گونج تھی۔ یا علی مدد کے نعرے تھے۔ نیٹو سپاہی اسلحہ اور تعداد کی برتری کے باوجود لشکر کو پیچھے نہ دھکیل سکے۔ بلکہ ان کے اپنے پاؤں اکھڑ گئے۔ گھوڑوں اور خچروں پہ بلا زین سوار ہو کے سپاہی بھاگنے لگے۔ ایک ایک خچر پہ تین سپاہی سوار ہوئے اب انہیں فرار کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ چونکہ زمین ناہموار تھی۔ رات کی تاریکی بھی تھی سپاہیوں کو رفو چکر ہونے میں دیر نہ لگی۔

جعفر خان سرپرّہ نے ساتھیوں کو تعاقب سے روکا کہ بھگوڑے دشمن کا پیچھا نہ کیا جائے۔ کیونکہ مقصد پورا ہو چکا ہے۔ بروری کے آلات کو فائرنگ سے سخت نقصان پہنچا تھا۔ شراب کشید کرنے والے خمیر کرنے والے بوتلیں بھرنے والے آلات سبھی چھلنی ہو چکے تھے۔ برٹش آرمی کے گیارہ سپاہی ہلاک ہوئے تھے جبکہ نو زخمی تھے۔ ہلاک ہونے والوں کو انہوں نے باہر نکالا اور مصفا زمین پر احترام سے رکھ دیا۔ پھر زخمیوں کو بھی باہر نکالا جو کانپ رہے تھے کہ تلواروں سے ان کی گردنیں قلم کر دی جائیں گی۔ جعفر خان سرپرہ نے انہیں تسلی

باقی صفحہ ۱۱۳ پر ملاحظہ کیجیے

''وہ چار جیل جانے والے''

(حقیقی واقعات پر مبنی ایک کہانی)

شہناز خانم عابدی

(کینیڈا)

اصل تعداد میں وہ چار تھے لیکن ان میں سے ایک ٹورانٹو کا لاری ڈینس Larry Dennis عمر ۳۴ برس جس نے اس عورت کے بیٹے پر گولی چلائی اور زخمی کیا تھا، پچھلے برس ہی عدالت میں پیش کئے جانے پر اپنا جرم قبول کر لیا تھا۔ اور جیل میں سات سال کی سزا کاٹ رہا تھا۔

مسی ساگا سیشن کورٹ کے عین داخلہ گیٹ کے پڑوس میں کھڑا ہوا درخت اپنے آدھے سے زیادہ پتے جھاڑ کر نیم برہنہ ہو چکا تھا۔ اندر عدالتی کارروائی معمول کے مطابق جاری تھی۔

عورت رہائشی مسی ساگا عمر ساٹھ سال باقی کے تین مجرموں سے مخاطب تھی جو اس سے کوئی سات فیٹ کے فاصلے پر قیدیوں کے کٹہرے (Prison Box) میں بیٹھے تھے۔ عورت اپنا تحریر کیا ہوا بیان پڑھ رہی تھی۔ عدالت کی زبان میں ایسے بیان کو (Victim Impact Statement)'' متاثرہ فرد کے تاثرات'' کہا جاتا ہے۔

عورت جس کا نام عدالتی حکم سے خفیہ رکھا گیا تھا۔ ان تین مجرموں سے براہِ راست مخاطب ہونے سے اپنے آپ کو نہ روک سکی جب کہ وکیل سرکار نے اسے اپنے بیان میں ان سے مخاطب کرنے سے منع کیا گیا تھا۔

۲۴ اگست ۲۰۱۱ء کی اس منحوس سہ پہر کو میں کبھی نہ بھول سکوں گی میری بیٹی لیٹ لنچ (Late Lunch) کے لئے آنے والی تھی۔ میں اس کے انتظار میں جذباتی ہو رہی تھی۔ تم سب میرے گھر میں گھس آئے اور سب کچھ ملیا میٹ کر دیا۔ تم نے مجھ کو اور میری زندگی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بگاڑ کر رکھ دیا۔ تنہا رے غیر متوقع داخل ہونے سے قبل مجھے دنیا کے سارے لوگ پیارے لگتے تھے۔ انسانیت کا چہرہ مجھے خوبصورت اور روشن نظر آتا تھا۔ میں خود بھی خوش تھی۔ خود اعتمادی سے معمور، خوف سے قطعی نا آشنا۔۔۔ تم نے میرے سامنے رکھی ہوئی میز پر جو کیش رکھا تھا انتہائی بھدّے اور وحشیانہ طریقے سے سمیٹا۔ میز کو لاتوں سے مارا اور مجھ پر آنکھیں نکالیں، اور میرے بدن کو دہشت سے مفلوج کر دیا۔ خوف میری ریڑھ کی ہڈی میں برف کی مانند نیچے سے اوپر کی جانب سرایت کر گیا اور میں جہاں بیٹھی تھی وہیں بے جان بُت بنی بیٹھی رہی۔ تم سب یہی چاہتے تھے میں اپنی جگہ سے نہ ہلوں اور تم میرے گھر کو الٹ کر رکھ دو اور تم نے جہاں جہاں کوئی مطلب کی چیز ملی ہتھیالی۔ نقدی اپنی جیبوں میں اتار لی۔ میں نے اپنے بے جان بدن کے ساتھ بیٹھے ہوئے تم لوگوں کو اوپر کی منزل پر جاتے ہوئے محسوس کیا۔ مجھے اپنے بیٹے کی فکر لاحق تھی۔ میں نے چلاّ کر اسے خبردار کرنا چاہا لیکن تم مجھے دہشت زدہ کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے، میں حلق پھاڑ کر چلاّئی مگر آواز میرے حلق میں ہی رہ گئی۔ خوف اور دہشت کو میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے آپ پر قابو پاتے دیکھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں خوف کے تجربے سے گزری۔

اوپر کی منزل پر کیا ہوا میں دیکھ نہ سکی لیکن جو کچھ میں نے سنا میرے لئے ایسا ہی ہے جیسے میرے سامنے گزرا ہو۔ میرا حوصلہ مند اور شیر دل بیٹا تم سب سے گتھم گتھا ہو گیا۔ تم بھیڑیئے اس پر قابو نہ پا سکے۔ تم نے میرے شیر بیٹے کے آگے اپنے آپ کو عاجز پایا۔ تم نے پستول نکال لئے، تم نے میرے بیٹے کو مار ڈالا ہوتا۔ لیکن میری دعائیں قبول ہوئیں جیسے ہی تم درندے اوپر چڑھنے لگے میں جو بے جان بُت بنی بیٹھی تھی، اندر ہی اندر بیٹے کے لئے دعا کرنے لگی۔ سام ۱۰ (Psalm 10) جو برسوں سے میری روح کے کسی گوشے میں جاگزیں ہے۔ ''خدا سنتا ہے اور مدد کرتا ہے۔۔۔ مالک، آقا آپ مجھ سے دور کیوں ہو، مصیبت کے وقت آپ کہاں چھپے ہو۔ مالک۔''

تم لوگوں نے میرے شیر کو مار ڈالا ہوتا اگر مالک نے اسے عین وقت پر چھلانگ لگانے کے لئے نہ سجھایا ہوتا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی۔ میرے نہ دکھائی دینے والے اور فریادی کی التجا سننے والے مالک نے میری خاموش التجا سن لی اور میرے بیٹے کو نئی زندگی بخش دی۔ بے شک وہ سننے والا اور مدد کرنے والا ہے۔ وہ دور ہو کر بھی نزدیک ہے۔۔۔ چھپا ہوا ہو کر بھی ظاہر ہے۔۔۔ تم لوگ بھگوڑے گیدڑوں کی مانند میرے گھر سے فرار ہو گئے۔ اب جو تم میرے سامنے ہو، مجھ سے چند فیٹ دور، قیدیوں کے بکس میں بیٹھے ہو۔ کیا تم اپنے خوفناک کھیلوں سے باز آ جانے کا فیصلہ کرنے والے ہو۔ تم نے یہ بتایا تھا کہ تم میرے گھر میں منشّیات کی تلاش میں گھس آئے تھے۔ مسی ساگا کا کوئی بچہ یا بڑا میرے گھر کو منشّیات سے نہیں جوڑتا۔ ہم مسی ساگا کے قدیم رہائشی ہیں۔ یہ مکان میرے خاوند نے خریدا تھا۔ میرے دونوں بیٹوں میں سے کوئی بھی منشّیات کے دھندے میں ملوث نہیں ہے۔ خاندان کا کوئی فرد منشّیات کا عادی نہیں۔ یہ کہہ کر کہ تم لوگ منشّیات کی ٹوہ میں میرے گھر میں داخل ہوئے جیوری کے اراکین کے ذہنوں میں تم نے ہمارے خلاف تعصب ڈالنا اور اپنے لئے ترحم پیدا کرنا چاہا ہوگا۔ سب ہی جانتے ہیں منشّیات کے عادی کو وقت پر خوراک نہ ملے تو وہ بھوکے بھیڑیئے کی طرح انسانیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ تمہاری یہ افترا پردازی اور بہتان طرازی بے کار گئی۔ جیوری نے ایک آواز ہو کر تمہیں مجرم قرار دیے دیا۔ تم لٹیرے، ڈاکو اور پستول چلانے والے لوگ ہو۔۔۔ ''تم سلف جسٹی فائیڈ'' (Self Justified) لوگ اپنے آپ کو بدل سکو گے۔؟ یا اپنے کرتوت کو درست سمجھتے رہو گے۔؟ میں

نہیں جانتی ۔۔۔میں عورت ہوں۔۔۔ مامتا سے بھری ہوئی عورت ۔۔۔میں جب تمہیں دیکھتی ہوں تو تم تینوں شیطانوں کے لئے بھی میری مامتا جاگ جاتی ہے لیکن تم شاید کچھ محسوس نہیں کرتے ۔'میں ۔مجھ کو۔اور میرا' (I, Me, Mine) کے ماسوا تم نے مثبت زندگی کے اس نظریئے کو منفی انداز میں اپنایا۔بہت برا کیا۔ تمہارے چہرے لوٹ مار،شور پکار،خون خرابے،لاتوں،مکّوں،لاٹھیوں،چھریوں، پستولوں،بندوقوں کی زبان بولتے ہیں۔تم نے ٹھوکر مار رکھی ہے محبت کے رشتوں کو ۔۔۔محبت کو۔۔۔زندگی کو۔۔۔انسانیت کو۔۔۔شاید جیسس کو۔۔۔اور خدا کو بھی ۔۔۔تم جوان لڑکوں نے مجھ بڑی عمر کی عورت کو خوف زدہ کیا۔۔۔۔بہت برا کیا۔ میرے مرحوم خاوند نے،خدا اور جیسس اس کو جنت میں داخل کریں،مجھ کو خوف آشنا نہیں کیا۔بڑھاپا میرے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔وقت تیزی سے گزرتا ہے بہت جلد تم سب بھی بڑھاپے کی دستک سنو گے۔کیا تم گولیاں چلا کر اس کا استقبال کرو گے۔۔؟

کورٹ کے گیٹ سے لگا ہوا درخت مسلسل پتے جھاڑ رہا تھا۔

عورت کے بیٹے نے اپنے بیان میں لکھا تھا'' ان مجرموں نے ہماری ملکیت میں دخل اندازی کے ساتھ ہماری زندگی میں دخل اندازی کی ہے۔ میری زندگی یکسر تبدیل کر دی ہے۔اب میں اپنا بیڈ روم اندر سے بولٹ اور لاک کر کے سوتا ہوں۔اپنی بیوی کو منع کر دیا ہے کہ وہ ہمارے دونوں بچوں کو اس گھر میں نہ بھجوائے ان کی حفاظت کی ذمّہ داری نہیں دی جا سکتی۔ہم میاں بیوی میں علیحدگی ہو چکی ہے میں نے بچوں کی سپردگی (Custody) کے لئے کیس کیا اور ہارا۔تاہم فیملی کورٹ کے جج نے ہفتے میں ایک دن اور رات بچوں کو میرے گھر میں میرے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی تھی لیکن اب اپنے بچوں کے ساتھ وقت گزارنے کی سہولت سے محروم ہو گیا ہوں ۔ جہاں تک مجرموں کی جانب سے 'اپالوجی' معذرت کا تعلق ہے میں یہ نہیں قبول کر سکتا۔ان کے چہروں پر مجھے پچھتاوے کا شائبہ بھی نہیں ملا۔

کراؤن پروسیکیوٹر (وکیل سرکار) ڈیوڈ ڈ' لوریو (David D Lorio) نے جج سے تینوں میں سے دو، ہائیلن اور ڈینس کے لئے ۱۲ سال جیل اور تیسرے مجرم ملس (Mills) کے لئے آٹھ سال کی سزا مانگی ۔اوّل الذکر مجرموں کے خلاف ڈاکے کا اصل دماغ (Master mind) ہونے کا الزام ثابت ہوا تھا۔جج نے ہائیلن اور ڈینس کے لئے دس سال اور ملس کے لئے آٹھ برس قید کی سزائیں دیتے ہوئے فیصلہ سنا دیا۔

کورٹ کے باہر کے پیڑ نے یکلخت پتے جھاڑ دیئے۔فال کا موسم زوروں پر تھا۔

ایک مجرم جس نے عورت کے بیٹے پر گولی چلائی تھی پہلے ہی جیل میں اپنی سزا بھگت رہا تھا اور باقی تینوں کو بھی سزا سنا کر جیل بھیج دیا گیا تھا۔لیکن اس گھر کے حالات بہتر ہونے کے امکانات نظر نہیں آتے تھے۔عورت کی ذہنی حالت بگڑتی ہی جا رہی تھی ابھی وہ ریٹائر نہیں ہوئی تھی لیکن جوب پر بھی روزمرہ کے فرائض کی انجام دہی اس کے بس کا روگ نہیں رہی تھی۔ڈاکٹروں کے خیال کے مطابق وہ دیوانگی کے راستے پر رواں تھی۔اس کے ذہن میں مزید ایک خوف کا اضافہ ہو گیا تھا کہ وہ چاروں مجرم سزا کی معیاد پوری کر کے اس سے اور اس کے بیٹے سے انتقام لیں گے۔مجرموں کا اپنے جرائم کی سزا بھگتنے کے بعد جیل سے باہر آ کر متاثرہ لوگوں سے انتقام لینا ان ملکوں کی روایت میں داخل تھا۔

آخر کار اس عورت نے بیٹے کو راضی کر لیا کہ وہ سب اپنے نام بدل کر کسی اور ملک میں ہجرت کر جائیں گے تا کہ ان چاروں کے انتقام سے محفوظ ہو سکیں۔

موسم بدل چکا تھا۔برف نے ماحول پر تسلط جما لیا تھا۔پرندے اپنی اپنی پناہ گاہوں میں روپوش ہو چکے تھے۔آدمی برف سے دست و گریبان تھا اور زندگی کے معلومات نمٹائے جا رہا تھا۔

بیٹے نے ماں کی بگڑتی ہوئی حالتِ خوف کے پیشِ نظر اپنی بیوی سے بات کی اور دو چار ملاقاتوں کے بعد اس کی بیوی بچوں کو ساتھ لے کر ان سب کے ساتھ ہجرت کرنے پر تیار ہو گئی ۔۔وہ اپنے شوہر سے ناراض تھی اور ایک دن بھی اس کے ساتھ گزارنے کے حق میں نہیں تھی ۔ بلکہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔لیکن ان چاروں نے حالات کا رخ ہی پلٹ دیا تھا۔بیوی کو ایک مرتبہ پھر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا ہی تھا۔اس نے اپنے شوہر کو ایک اور موقع دینے کا فیصلہ کیا اور اس خاندان کیلئے ایک بار پھر متحد ہو گئی۔عورت نے اپنے عورت ہونے۔۔۔۔۔ماں ہونے ۔۔۔۔کا ثبوت دیا اور شوہر اور بچوں کے ساتھ اس جبری ہجرت کے لئے راضی ہو گئی ۔بیٹا اسٹیون (Steven) جس کی عمر پانچ برس اور بیٹی شینن (Shannon) جس کی عمر تین برس جو اپنے ماں باپ کے درمیان علیحدگی کے عذاب کو اندر ہی اندر جانے انجانے سہہ رہے تھے۔اس ہجرت سے بے حد جذ باتی ہو رہے تھے۔ڈیڈی،ممی اور گرینڈ ما کے ساتھ ایک نئی زندگی کی جانب روانگی کسی سہانے سپنے سے کم نہیں تھی۔خوشیوں سے بھرپور اور غیر متوقع ۔۔۔

برف رخصت ہونے لگی تھی ۔برف کے نیچے دبا ہوا سبزہ ہرا بھرا ہو کر ابھر رہا تھا، پرندے اپنی پناہ گاہوں سے برآمد ہو رہے تھے۔درختوں نے کپڑے پہننے شروع کر دیئے تھے۔

کبھی کبھی میرے ذہن میں یہ سوال کلبلانے لگتا ہے۔کہ وہ چاروں اس عورت کے گھر میں ڈاکے کی غرض سے گھس آئے تھے یا اس ٹوٹے ہوئے خاندان کو جوڑنے اور دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو ان کے ماں باپ کی رفاقت واپس دلانے کے لئے دخل انداز ہوئے تھے۔

آج جب میں یہ الفاظ لکھ رہی ہوں یہ خاندان اپنا پتہ نشان پیچھے چھوڑے بغیر کسی اور ملک،کسی اور شہر میں روانہ ہو چکا ہے۔

شعور کا سفر

سید سعید نقوی
(نیویارک)

مونٹانا ، امریکہ کی ایک مغربی ریاست ہے۔ میرا خاندان ریاست کے سب سے بڑے شہر 'بلنگ' میں کوئی دوسو برس سے آباد ہے۔ آئرلینڈ سے میرے دادا کے پردادا کسی پانی کے جہاز میں بیٹھ کر یہاں آئے تھے۔ اترے تو وہ نیویارک میں مگر زیادہ زمین اور کاشت کاری کی کشش انہیں مونٹانا کھینچ لائی۔ میرے پردادا کے دادا کی بیوی ، خاندانی داستانوں کے اوطاق کے مطابق، انہیں جہاز کے سفر میں ہی ملی تھیں۔ خود ان کا تعلق تو اسکاٹ لینڈ سے تھا۔ یوں پچھلے دوسو برس سے ہمارا خاندان بلنگ میں کھیتی باڑی کر رہا ہے۔

میں خود اپنے ماں باپ اور ایک بھائی کے ساتھ بلنگ سے کوئی پچاس میل دور ایک قصبے میں پلی بڑھی۔ میرے والد ایک وسیع رقبے پر مویشی پالتے تھے۔ نو برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے، مجھے بے فکری کے سوا اس زندگی کی کوئی دوسری تفصیل یاد نہیں۔ میرا کام محض اسکول جانا، کھلی فضاؤں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیلنا، اور کبھی مویشیوں کی دیکھ بھال میں والدین کا ہاتھ بٹانے تک محدود تھا۔ نو سال کی بچی کر بھی کیا سکتی ہے۔ جب کبھی ہم چھٹیوں میں بلنگ جاتے تو اس کی کئی ہفتوں پہلے سے تیاری شروع ہو جاتی۔ خالہ ہم لوگوں سے بہت محبت کرتی تھیں۔ پھر وہاں نانی، نانا، میرے دوسرے کزن، میرا بس چلتا تو روز ہی بلنگ جاتے ،مگر ایسا سال میں تین چار بار ہی ہوتا۔ باقی سب کے ساتھ تو بہت مزا آتا، مگر ایمانداری کی بات یہ ہے کہ نانا سے مجھے ذرا وحشت ہی ہوتی۔ انہیں سانس کی اتنی سخت بیماری تھی کہ مکمل جملہ بھی بول نہیں پاتے تھے۔ آدھے میں ہی سانس پھول جاتا، یا کھانسی کا دورہ اٹھتا، مگر سگریٹ انگلیوں کے درمیان ہمیشہ دبی رہتی۔

''اب کیا ضرورت ہے چھوڑنے کی، کچھ عرصے میں ضرورت ہی نہ رہے گی'' نانی جل کر کہا کرتیں۔

اس موقع پر میری امی اور نانا دونوں ہی نانا کی طرف داری پر آمادہ رہتے ۔ گھر کے جنوبی کونے کے ایک نسبتاً تاریک کمرے میں، جو اب ان کی مستقل رہائش گاہ بن گیا تھا۔ سارا دن مقید کھانستے رہتے۔ کھانے کا وقت ہوتا تو کبھی لاٹھی ٹیکتے آجاتے ، ورنہ وہیں منگوا لیتے۔ اپنی آکسیجن کی نالی کے ساتھ ادھر ادھر گھومتے ، سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بھوت ہی معلوم ہوتے۔ مگر ایک بار میں نے اس مشابہت کا امی سے تذکرہ کیا، تو مجھے بہت مہنگا پڑا۔

ہم آج صبح ہی بلنگ پہنچے تھے۔ گو فاصلہ زیادہ نہیں تھا، لیکن پھر بھی ایک رویہ سڑک کے باعث کوئی ڈھائی گھنٹے لگ گئے تھے۔ رسمی کلمات اور تحائف کے تبادلے کے بعد اب دریا پر جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔

''ابا کی طبیعت کا کچھ بھروسہ نہیں ہے، سارا دن انہیں تنہا چھوڑ کے جاتے ہوئے مجھے تو ڈر لگ رہا ہے'' خالہ ذرا متفکر لہجے میں بولیں

''تو میں رک جاتی ہوں ان کے پاس'' امی نے پیشکش کی

''ارے نہیں تم کون سا دریا کے کنارے رہتی ہو، سال میں دو ایک بار ہی تو موقع ملتا ہے، تم بالکل نہیں رکو گی۔'' میرے والد، یا خالو کے رکنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ دادا ویسے بظاہر ٹھیک تھے، لیکن پھر بھی سب کو یہی فکر تھی کہ انہیں تنہا نہ چھوڑا جائے۔

''بیٹا، تمھارے تو کزن بھی آج نہیں جا رہے، ان کا خود اپنے دوستوں کے ساتھ پروگرام ہے!'' میری والدہ نے ترپ کا پہلا پتہ پھینکا.

''لیکن امی، میں نانا کے پاس کیسے ٹھہر سکتی ہوں؟''

''کیوں؟ کیا کھا جائیں گے تمھیں'' ابو نے ذرا ڈپٹ کر پوچھا، انہیں ڈر تھا کہ کہیں آخر قرعہ فال ان ہی کے نام نہ نکل آئے۔ ''ٹی وی دیکھتی رہنا، شام تک تو ہم لوگ آ ہی جائیں گے، فون بھی ہے گھر میں۔''

''لیکن امی۔۔'' ابو کی ڈانٹ کا جواب ہمیشہ سے مخاطب ہو کر ہی دیا جاتا۔

''بس ایلز بتھ فیصلہ ہو گیا۔ آج تم نانا کے پاس ٹھہر جاؤ۔ کل اپنی کزنز کے ساتھ باہر چلی جانا۔ تمھیں تو ان کے کمرے میں جانے کی بھی شاید ہی ضرورت پڑے۔'' میری والدہ کے لہجے میں قطعیت تھی۔ اگر یہی آمرانہ رویہ رکھنا تھا تو پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی، میں اپنی قسمت پر صادر ہو کر بیٹھ گئی۔

خالہ کا گھر خاصہ کشادہ ہے، بڑے، بڑے کمرے، کشادہ دالان اور سب سے بڑا وہ فیملی روم۔ اس کی شمالی دیوار کے ساتھ ایک بڑا سا ٹی وی رکھا تھا۔ اس زمانے میں وڈیو کھیل نیا ہی آیا تھا، اور آج بلا شراکت مجھے اس کا استحقاق مل گیا تھا، سودا زیادہ برا بھی نہیں تھا۔

سب کے جانے کے بعد میں نے سب سے پہلے تو مائیکرو ویو میں پاپ کارن بنائے۔ آپ جانتے ہی ہیں اگر پاپ کارن میں ایک چمچہ گھی ڈال کر کچھ نمک چھڑک لیں تو سواد دوگنا ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک بڑے برتن میں پاپ کارن بھرے، ایک گلاس میں برف انڈیلی، اس میں پانی بھرا اور قالین پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔ وڈیو گیم کا کنٹرول میرے ہاتھ میں تھا، نانا کی دیکھ بھال کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ ایک گھنٹہ تو اس تیزی سے گزر گیا کہ معلوم ہی نہیں ہوا۔ میں تو بس اپنے کھیل میں مگن تھی، وقت گزرنے کے ساتھ میری مہارت بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے ہجو لی ساتھ ہوتے تو دس منٹ میں ہی چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی۔ گو میں اپنی چیزوں میں شراکت پر زیادہ یقین نہیں رکھتی لیکن اس کا یہ مقصد تو نہیں کہ ان کی چیزیں لڑ جھگڑ کر نہ ہتھیا لوں۔ میری محویت نانا کی کھانسی سے ٹوٹ گئی۔ شاید بیدار ہو گئے تھے۔ ان کی کھانسی شروع ہوئی تو پھر بڑھتی ہی گئی ایسا لگتا تھا جیسے رکنا بھول گئی ہو۔ میں نے کچھ دیر تو تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا، لیکن جب

ان کی وقفے، وقفے سے اٹھنے والی کھانسی ایک مسلسل دورے میں تبدیل ہوگئی تو میں نے کنٹرول ایک جانب رکھا، اور تیزی سے ان کے کمرے کی جانب بڑھی۔

نانا اپنی مسہری پر بیٹھے، سامنے کی جانب جھکے ہوئے تھے، کمرے میں بتی بند تھی، تیز سانس کے ساتھ ان کا پھولتا پچکتا سینہ صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ میرے روشنی جلانے پر انہوں نے سر اٹھا کے میری جانب دیکھا، ان کی آنکھوں میں ممنونیت تھی۔ نانا موت سے پہلے ہی نہ جانے کب سے مر رہے تھے۔ کھانسی کا دورہ اتنا شدید تھا کہ وہ بول نہیں پا رہے تھے۔ آکسیجن کی نلکی ناک سے نکل کر گلے میں جھول رہی تھی۔ خشک، پتھریلی کھانسی، بلغم کا کوئی نام ونشان تک نہیں تھا۔ میں نے بڑھ کر آکسیجن کی نلکی ان کی ناک سے لگا دی، اور ان کا تکیہ سیدھا کر کے ان کی پیٹھ پر مکیاں برسانے لگی۔ میں نے امی اور خالہ کو ہمیشہ یہی تو کرتے دیکھا تھا۔ کھانسی کی شدت میں کمی آگئی، ان کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک پڑا۔ سانس آرام سے آنے جانے لگے تب بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ میں نے ان کے ماتھے کا بوسہ لیا تو آنکھ سے چند آنسو اور ٹپک گئے۔ بڑھاپے میں آنسو ٹپکنے کی وجوہات کتنی مختلف ہوجاتی ہیں! انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے پانی مانگا۔ پانی پی کر ان کی طبیعت بحال ہوگئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور پلنگ کر پائنتی میرے لیے بھی جگہ بنا دی۔ منہ سے بولنا ان کے لیے اب بھی دشوار تھا آواز جیسے پھیپھڑوں میں پھنس کے مشکل سے باہر آرہی تھی۔

''تم کیوں نہیں گئیں؟'' شاید انہوں نے یہی پوچھا تھا۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔'' نہ جانے کیوں میں یہ نہ کہہ سکی کہ آپ کی وجہ سے نہیں گئی۔

''کیا کر رہی تھیں؟''

''کچھ نہیں، ایسے ہی ذرا وڈیو گیم کھیل رہی تھی۔''

''اب میں ٹھیک ہوں، تم چاہو تو چلی جاؤ!''

''میں کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھتی ہوں'' مجھے خود اپنے جملے پر حیرت سی ہوئی۔ میں نظر دوڑائے ان کے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ دیوار پر نانا کی ایک پرانی تصویر آویزاں تھی، جس میں وہ ایک کشتی میں بیٹھے تھے اور ایک بہت بڑی مچھلی ان کے قدموں میں پڑی تھی۔ ایک دیوار پر تین بندوقیں اوپر تلے سجی ہوئی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں چھوٹی تپائی پر ایک کتاب بند رکھی تھی، جس پر ان کی عینک ہمیں دیکھ رہی تھی۔

''بور ہو رہی ہو، کہانی سناؤں؟''

میں ہنس پڑی۔ نانا مجھے بالکل بچہ سمجھ رہے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے مجھے بہلائے رکھیں، نہ جانے اس وقت کون کس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ میری بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان سے کیا باتیں کروں۔ اسکول، میوزک، فلم، کھیل مجھے یقین نہیں تھا کہ ان میں سے کسی چیز کے بارے میں بھی نئی معلومات رکھتے ہیں۔ کچھ دیر ہمارے درمیان خاموشی رہی۔

''اسکول کیسا ہے تمھارا؟'' انہوں نے بات چھیڑی

''اچھا ہے نانا لیکن اب کچھ سیاہ فام بچے بھی آگئے ہیں'' میں نے منہ بنا کر شکایت کی

''ہوں، تمھاری کلاس میں بھی ہیں؟''

''ہیں تو، لیکن میں تو ان کے قریب بھی نہیں بیٹھتی، مجھے تو بہت برے لگتے ہیں۔''

''تمھیں تاش کھیلنا آتے ہیں؟''

''نہیں نانا، ایک دو بار کھیلے تھے، بالکل اناڑی ہوں۔''

''اچھا، اس میز کی دراز میں ایک گڈی رکھی ہے، نکال لاؤ'' نانا پھر کھانسنے لگے۔ اتنی دیر تک باتیں کرنے سے ان کا دم پھولنے لگا تھا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ایک گھونٹ پھر پانی کا پی لیا۔

اس دن ہم دو تین گھنٹے تک تاش کھیلتے رہے۔ نانا پنے زمانے کے بہت اچھے کھلاڑی تھے، اور میں بالکل اناڑی۔ لیکن میں بہت تیزی سے بہتر ہونے لگی۔ درمیان میں وہ اسکول کے متعلق، کبھی دوستوں کے متعلق کوئی سوال بھی کر لیتے۔ میں ہی زیادہ تر بول رہی تھی۔ کوئی تین گھنٹے بعد کھیل میں، میں نے انہیں ہرا دیا۔ میں خوشی سے اچھل پڑی، وہ بھی اپنی شکست پر کچھ زیادہ دل گرفتہ نہ تھے۔

''شاباش چلو اب گڈی واپس رکھو۔ تم بہت ذہین ہو۔ اور وہاں گڈی کے پاس ایک دعوت نامہ رکھا ہے اسے نہ چھیڑنا!''

میں بہت خوش تھی۔ سب سے پہلے تو کل اپنے کزنز اور پھر ہم جماعتوں کو مرعوب کرنے کے لیے تاش کے کھیل میں یہ مہارت بہت کام آتی۔ میں نے دراز کھول کر گڈی واپس رکھی تو اس دعوت نامے پر نظر پڑی جسے نانا نے میرے لیے شجرِ ممنوعہ قرار دے کر اسے یقینی بنا دیا تھا کہ میں اسے دیکھوں۔

''نانا، یہ کیا ہے؟'' میں نے کارڈ دراز سے باہر نکالتے ہوئے پوچھا۔ وہ غور سے میری جانب ہی دیکھ رہے تھے۔

''میں نے کہا تھا اسے مت چھونا؟''

''لیکن یہ ہے کیا، کسی تقریب کا دعوت نامہ معلوم ہوتا ہے؟'' میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا

''یہاں لاؤ اسے'' انہوں نے خفگی سے کہا۔

میں کارڈ نانا کے پاس لے گئی۔ ''بیٹھ جاؤ'' انہوں نے اپنے پہلو میں میرے لیے جگہ بنا دی، اور لفافے میں سے ایک کارڈ نکال کر مجھے تھما دیا۔ میں نے کارڈ پڑھا تو میری حیرت اور بڑھ گئی:

''محترم جارج اسمتھ آپ کو مدعو کیا جاتا ہے کہ ۱۶ فروری ۱۹۱۷ء بروز ہفتہ، تین سیاہ فام نوجوانوں کو پھانسی دیئے جانے کا نظارہ دیکھیں۔ شراب مفت تقسیم ہوگی۔ ان تینوں کی تصاویر ملاحظہ کے لیے منسلک ہیں۔''

میں نے کارڈ کو الٹ کے دیکھا تو اس طرف تین سیاہ فام نوجوانوں کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ دو سوٹ ٹائی میں ملبوس تھے، تیسرا صرف قمیض پتلون اور

''چہارسُو''

گیلس میں تھا۔ تینوں کی عمریں بیس برس کے قریب رہی ہوں گی۔ مجھے تو وہ تینوں بہت دہشتناک لگے۔ ان کی شکلیں دیکھ کر مجھے خوف سے جھرجھری آ گئی۔ موٹے بھدے ہونٹ، پھیلی ہوئی ناک، آنکھوں کے ڈھیلے حلقوں سے باہر گرے پڑ رہے تھے۔ میں نے کارڈ فوراً بند کر دیا، مجھے احساس ہوا کہ نانا مجھے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔

''کہا تھا ناں کہ کارڈ مت چھونا!''

''نانا آپ گئے تھے انہیں پھانسی ہوتے دیکھنے؟''

وہ خاموش رہے۔ انہوں نے پانی کا گلاس اپنے لبوں سے لگا لیا۔ اس وقت وہ کھانس تو نہیں رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ مجھے جواب دینے سے بچنے کے لیے پانی پی رہے ہیں۔

''بتایئے ناں، آپ گئے تھا، کیسا لگا؟''

انہیں اچانک کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ میرے سوال کا جواب دینے سے قاصر رہے۔ بس ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا جیسے کہہ رہے ہوں کہ خاموش رہو۔ ان کے پھیپھڑوں سے پھر وہی پتھریلی خرخراہٹ نکلنے لگی۔

''بہت ہیبت ناک اور افسوس ناک منظر تھا''

لیکن پھانسی ہوئی کیوں تھی؟''

''ان میں سے دو تو اپنے مالکوں کی مرضی کے بغیر غلامی سے بھاگ نکلے تھے، لیکن پکڑے گئے۔ تیسرے نے ایک سفید فام لڑکی کو دیکھ کر سیٹی ماری تھی۔'' وہ جیسے خواب میں بڑبڑا رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے، باہر سے خالہ کی آواز آئی:

''ایلز بتھ، ایلز بتھ، کہاں ہو۔ ہم لوگ آ گئے ہیں۔ دیکھو تمھارے لیے کتنے بڑے جھینگے خرید کر لائے ہیں'' خالہ کو میری پسندیدہ خوراک یاد تھی۔

نانا کے سکھائے تاش کے کھیل نے مجھے اپنے ساتھیوں میں بہت ممتاز کیا۔ اسکول سے کالج اور پھر یونی ورسٹی، تاش کا یہ کھیل بہتر ہی ہوتا رہا۔ ویسے اب زندگی کے دوسرے جھمیلوں میں اتنا وقت بھی کہاں ملتا تھا۔ میں شاید کالج کے دوسرے سال میں تھی، جب نانا کا انتقال ہو گیا خالہ تو بلنگ میں رہتی ہی نانا کی وجہ سے تھیں، ان کے سب سسرالی عزیز تو واشنگٹن میں مقیم تھے۔ شوہر کے اصرار پر وہ بلنگ سے واشنگٹن ہجرت کر گئیں۔ بلنگ والا مکان اور کاشتکاری کی زمین میرے اور میرے شوہر کے حصے میں آ گئی۔

بدلتے زمانے کے ساتھ اقدار بھی بدل رہی تھیں۔ پہلے سیاہ فام لوگ ہی ہماری زمینوں پر مزارعے تھے، اب عموماً لاطینی امریکہ کے غیر قانونی تارکین وطن معمولی تنخواہوں پر کام کرتے۔ ایک سیاہ فام خاندان تو ہمارے پڑوس میں ہی آ کر بس گیا تھا۔ اور ان کا بیٹا مائک بھی میری بیٹی جین کے ساتھ نویں جماعت میں اسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ مائک کبھی کبھار ہمارے گھر بھی آ جاتا۔ مجھے نہیں معلوم اس وقت اپنے محسوسات کو میں کیا نام دوں؟ اب وہ مجھے برا تو نہیں لگتا تھا لیکن ایک بے کلی سی رہتی۔ جو جین کے دوسرے سفید فام دوستوں کے گھر آنے پر کبھی نہیں ہوتی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میں غیر ارادی طور پر جین کو مائک کے ساتھ کبھی تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔

''امی سارا سامان باندھ لیا ہے،، ٹرین ایک گھنٹے میں جائے گی۔ ابو کو آواز دیں، اگر آپ لوگ مجھے اسٹیشن چھوڑ دیں'' جین نے آ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''تو تمھارا ارادہ کیا پیدل جانے کا تھا'' میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''جین، بیٹا کالج ایک بالکل الگ دنیا ہے، اپنا بہت خیال رکھنا''۔

''امی ایک گھنٹے کی دوری پر ہی تو ہاسٹل ہے۔ کوئی مسئلہ ہوا اور میں فوراً گھر آ گئی۔ پھر مائک بھی اسی کالج میں جا رہا ہے۔ اس سے بھی سہارا رہے گا۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اس کے بیگ کو مضبوطی سے بند کرنے لگی۔

''امی، میں آپ کی تاش کی یہ گڈی لے کر جا رہی ہوں۔ اس سے وقت اچھا کٹے گا۔ اور میں نے دیکھا ہے کیسے آپ محض اس کی وجہ سے اتنے دوست بنا لیتی ہیں'' جین نے دراز کھولتے ہوئے کہا

''ضرور بیٹی''

''امی، یہ کارڈ کیسا ہے، کسی کی شادی کا دعوت نامہ لگتا ہے'' جین نے تاش کی گڈی کے نیچے سے کارڈ نکالتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں بیٹی، تمھارے نانا کے زمانے کا کوئی کارڈ ہے، وہیں رہنے دو۔ یہ تو ان کے کمرے میں ہوتا تھا، یہ میز یہاں آئی تو اس کے ساتھ ہی یہ کاٹھ کباڑ بھی چلا آیا۔''

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی جین وہ کارڈ کر پڑھ چکی تھی۔ گو وہ کمرے کے دوسرے حصے میں تھی پھر بھی میں اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات سے سمجھ گئی کہ اس نے کارڈ پڑھ لیا ہے۔

''جین، تمھیں دیر ہو رہی ہے، اسے وہیں رکھ دو۔''

جین کارڈ وہیں چھوڑنے کے بجائے، اسے لے کر میری جانب بڑھی:

''یہ کس قدر ہولناک ہے، امی، آپ نے اسے پہلے دیکھا تھا؟''

اس نے کارڈ میری نظروں سے چھ انچ کے فاصلے پر پکڑ لیا۔ ''کیسے معصوم شکل کے خوبصورت جوان ہیں؟''

''ہاں جین، روشن آنکھیں، بھرے، بھرے ہونٹ، کیسے کڑیل جوان رہے ہوں گے'' مجھے اپنی آواز خود اجنبی لگی۔ میرے شعور نے اتنا لمبا سفر طے کر لیا اور مجھے معلوم ہی نہیں ہوا۔

''امی'' جین کسی سوچ میں تھی، بات مکمل کرنے سے جھجک رہی تھی۔

''ہاں بیٹی، جلدی کرو تمھیں دیر ہو رہی ہے''

''امی، میں یہ کارڈ مائک کو دکھا سکتی ہوں؟'' اس کا لہجہ غیر یقینی تھا۔

''بالکل نہیں، اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے'' میں نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر پھاڑ دیا۔

کلموہی کہیں کی

سیمیں کرن

(اسلام آباد)

جب تقریر میں اس کا نام پکارا گیا جہاں نہ صرف اس کو تمغہ کارکردگی سے نوازا جانا تھا بلکہ اس کی ترقی اور بونس کا بھی اعلان کیا جانا تھا۔ اس اتنی بڑی برانچ کا آپریشنل منیجر بن جانا۔ پانچ لاکھ کا بونس' خوبصورت گاڑی' سجا سجایا فلیٹ' زندگی کی یہ آرائش اور سہولتیں یہ ترقی اس جیسے انسان کے لیے جو غربت کی لکیر سے زرا کچھ اوپر متوسط طبقے کسی چادر کو یوں اوڑھے ہوا تھا کہ زرا سا کھینچو تو غربت برہنہ ہونے لگے۔ جسے عرفِ عام میں لوئر مڈل کلاس کہا جاتا ہے۔

وہ لوگ جو غربت کی لکیر کو عبور کر کے متوسط طبقے میں داخل ہو جانے کو ہی خوشحالی گردانتے ہیں' ایسے کسی خاندان کے فرد کا اپنی محنت و کاوش کے بل بوتے پر اِس مقام تک پہنچ جانا یقیناً قابلِ فخر و قابلِ تقلید کاوش تھی۔

جب وہ سٹیج کی جانب بڑھا تو اُس کے دو جگری یار خوشی سے تمتماتے چہروں کے ساتھ تالیاں پیٹنے لگے کیونکہ وہ یاروں کا یار تھا اور اُس کے یہ دونوں دوست پرانے وقتوں کے اس کے بچپن کے یار بیلی تھے۔ اور دونوں ہی اپنے اپنے شعبہ ہائے جات میں خود کو سیٹ کر چکے تھے اور اپنے دوست کی ترقی پر دل سے خوش تھے۔

ریاض اور مجید نے تالیاں پیٹتے پیٹتے اِک دوسرے کی جانب دیکھا اور ریاض نے مجید سے کہا

''یہ دِن اُس کی ہمت مستقل مزاجی اور محنت کا پھل ہے وہ ڈٹا رہا ہمت اور پامردی سے اور آخری منزل کو پا ہی لیا''

مجید نے تائید کی

''صحیح کہتے ہو۔ اِس مقام کو پانا کچھ آسان نہ تھا راستے میں کتنی مشکلیں آئیں مگر وہ ہمت نہیں ہارا' وہ اکیلا ہی چلتا رہا۔ ریاض تمہیں تمہارے بڑے بھائی نے باہر بُلا لیا۔ اور تم سیٹ ہو گئے اور میں میرے حصے میں باپ کے ترکے اور میرے چچا کی دامادی کے صدقے اتنا آ گیا کہ میں اپنا بزنس شروع کر سکوں اور اُس میں اللہ نے برکت ڈال دی۔ آج ہم تینوں اپنی اپنی جگہ خوشحال ہیں مگر فخر الزماں تو اُن لوگوں میں سے ہے جو اپنی قسمت خود بناتے ہیں۔''

ریاض بولا

''ہاں صحیح کہتے ہو فخر الزماں جو کل کا ہم یاروں کا گھر والوں کا محلے داروں کا فخری تھا' جس کو میٹرک کے بعد پڑھنے سے ہٹا لیا گیا تھا اور کیسے اُس نے راتوں کو جاگ جاگ کر بعض اوقات کھمبوں کے نیچے پڑھا کہ اُس کے ابا کو اُس کے پڑھنے سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ وہ اُسے اک فالتو بلب ہی جلانے نہ دیتے بعض اوقات اُس کی کتابیں اُٹھا کر ردی میں بیچ دیتے اور جب وہ گلی میں کھمبے کے نیچے آ بیٹھتا تو ہم یاروں کی منڈلی کبھی اُسے تنگ کرنے کو پہنچ جاتی۔''

مجید بھی پرانے دِنوں کی یاد میں کھو سا گیا۔

''ہاں اور میں' میں تو اکثر اُس کا ٹھٹھا ہی لگایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا اوہ یار خواب دیکھنے چھوڑ دے تو نے پڑھ کے کونسا ڈی سی لگ جانا ہے لوگ اتنی بڑی بڑی ڈگریاں لے کے نان چھولے کی ریڑھیاں لگا کر پھر رہے ہیں۔ اوہ چھڈ پرے کھا پی کھیل کود موج کر' ابے کا کہنا مان لے اُس کی دوکان پر اُس کے ساتھ بیٹھ جا لیکن فخری سب کو ہنس کر یا چُپ رہ کر ٹال دیتا تھا۔

اُن کی ان باتوں کے دوران سٹیج پر فخر الزماں جا کر براجمان ہو گیا تھا اور میزبان نے اُس کی شان میں تعریفی کلمات کی ابتداء کر دی تھی۔ یہ تحسین بھرے کلمات ملنے والی آسائشات کے ساتھ اثباتِ ذات کا اِک اور انعام و بونس تھا جو اُس کی جھولی میں ڈالا جا رہا تھا۔ فخر الزماں کا چہرہ خوشی اور شرم و فخر کے احساس سے سرخ ہو رہا تھا۔ کی گئی محنتوں کے بعد ملنے والا ثمر ذات کے درخت پر ثمر تولاتا ہے اور یہ ثمر ہی اثباتِ ذات ہوتا ہے ورنہ ہر اِس درخت پر صرف نفی کے خار اُگتے ہیں جو خود کو بھی لہولہان کرتے ہیں اور اِرد گرد بسنے والے وابستہ افراد کو بھی!

میزبان کہہ رہا تھا

''فخر الزماں ہمارے وہ ساتھی ہیں جن پر ہماری فرم کو بجا طور پر فخر ہے ناز ہے ایسے لوگ نہ صرف ادارے کا بلکہ قوم و ملک کا بھی قیمتی سرمایہ ہیں۔ وہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ آج وہ جس مقام پر ہیں اپنی محنت کے بل بوتے پہ ہیں۔''

''فخر الزماں نے ادارے میں اِک معمولی پوسٹ سے کام کا آغاز کیا تھا اور ابھی ہماری فرم نے بھی اتنے پر نہیں پھیلائے تھے۔ اُس وقت وہ انڈر گریجوایٹ تھے۔ نہ صرف یہ کہ اُنہوں نے اپنا کام ایمانداری سے کیا بلکہ اپنی ذہنی صلاحیتوں سے فرم کے مفاد میں اور بزنس میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ اُن کے بنائے گئے پلانز کسی بھی طرح کسی ایم بی اے ڈگری ہولڈر سے کم ثابت نہیں ہوئے نہ صرف یہ کہ اُنہوں نے انتہائی جانفشانی سے کام کیا بلکہ اپنی تعلیمی استعداد میں بھی اضافہ کیا پرائیویٹ طور پر تعلیم کا سلسلہ اپنی خانگی زمہ داریاں اور جاب کے ساتھ ساتھ ہر محاذ پہ چومکھی لڑائی لڑی اور اِس دوران بی اے کے بعد ایم اے اور ایم بی اے فنانس کیا۔ دِن رات کی انتھک محنت کے بعد وہ اِس مقام پر پہنچے ہیں ادارے کو بجا طور پر اپنے اِس محنتی اور مخلص کارکن پر فخر ہے۔ وہ دوسرے ورکرز کے لیے قابلِ تقلید ہیں۔''

میزبان کی باتوں نے پہلے اِک خوشی و انبساط کی لہر فخر الزماں میں

دوڑائی اور پھر یکدم اِک تھکن بھی اُس پر غالب آ گئی۔آج جبکہ وہ پینتالیس سالہ اُدھیڑعمر مرد تھا۔آب کہیں جا کر اُس کی محنتوں کو ثمر ملا تھا بلکہ پیڑ پہ بُور آیا تھا۔

نوید بہار بن کر جبکہ اپنی جوانی اپنے سنہرے دِن ارمانوں اور خوابوں بھرے اُس نے بالکل کسی بے حس روبوٹ کی طرح کام کرتے گزارے تھے۔کیا کچھ نہ سہا تھا اُس نے۔تنگی غربت کی چکی کے پاٹوں میں کسی گھن کی طرح پسا تھا وہ بالکل تنہا اپنے سایوں سے لپٹ کر خود ہی رو لیتا اور خود کو تسلی دے لیتا۔باپ کی شفقت کیا ہوتی ہے وہ نہیں جانتا تھا اُس نے ہمیشہ باپ کو بکتے جھکتے خود پر لعنت ملامت کرتے دیکھا تھا اور اُس پر عتاب کچھ زیادہ اس لیے تھا کہ اُس نے بغاوت کر کے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔اُس کو امتحانات کے دِنوں میں اِک بلب جلانے کی اجازت نہ تھی۔ہوتی بھی تو وہ اِک کمرہ جہاں ماں باپ بہن بھائی اور شادی شدہ بھائی بھاوج سب سوتے تھے اور اُس کے جاگنے پر قیامت برپا ہو جاتی اور قیامت تو خود اُس پر بھی گزر جاتی جب کچھ جناتی آوازیں اُس کو ماں باپ اور بھائی بھاوج کے کونوں سے سنائی دیتیں اور وہ بھی تو اُس کے جاگنے پر اِسی لیے سیخ پا ہوتے تھے کہ وہ اُن کے اندھیروں میں مخل ہوتا تھا۔وہ کھمبوں کے نیچے جا بیٹھتا سکون کی خاطر!

اِسی طرح ابھی بی اے بھی نہیں مکمل ہوا تھا کہ اُس نے نوکری شروع کر دی دِن رات انتھک محنت اور پھر اُس نے کرخت چہروں پہ نرمی آتی دیکھی وہی ماں باپ اب اُس پر ناز کرنے لگے۔اُس کے مزدور دکاندار بھائیوں کے مقابلے میں اُسے ''افسر پُتر'' کہہ کر پکارتے۔

اور انہی مشقت بھرے دنوں میں اُسے ثنا پسند آ گئی۔کن جتنوں سے اُس کی لگن اُس کو چین سے بیٹھنے نہ دیتی۔وہ قناعت کر کے بیٹھ جاتا تو شاید یہ نہ ہوتا جو قیامت بیت گئی۔ثنا کو اُس کی پسند کی وجہ سے گھر میں کوئی مقام نہ ملا اور اُس کے پاس وقت کب تھا کہ وہ اُس کے لیے لڑتا وہ تو اُس کو زیادہ سے زیادہ سکھ دینے کے لیے دِن رات کسی مشین کی طرح کام کر رہا تھا۔نوکری نوکری کے بعد کچھ ٹیوشنز پھر اپنی تعلیم' ثنا ٹکر ٹکر اُس کی شکل دیکھتی رہتی اُسے لگتا کہ اُس کی شادی کسی روبوٹ سے ہو گئی ہے جو اُس کو رات کو بھی کبھی کبھار ہی پُرحرارت لگتا سچ تو یہ ہے کہ یہ جان توڑ مشقت بھرے دِنوں میں ثنا نے اِک بچی کو جنم دیا مگر مردہ! اور یہ حادثہ جیسے تابوت میں کیل ثابت ہوا۔ثنا جیسے اِس حادثے کے بعد پوری قوت سے جاگ اُٹھی اور اُس کی محبت جیسے سو گئی ہمیشہ کے لیے۔وہ فخر الزماں کو چھوڑ کر پلٹ گئی۔اور رہا فخر الزماں تو اُس کے پاس بہت سوچنے کا ٹائم ہی کب تھا اُس نے اِک دو بار کوشش کی اُس کو منانے کی مگر نا کام کوشش اور پھر وہ جس دور سے گزر رہا تھا تھکاوٹ از حد محنت زمہ داریوں نے اُسے چڑچڑا اور کچھ بے حسن بنا دیا تھا۔اور پھر جب سے وہ نوکری پہ لگا تھا کچھ ترقی بھی ہو گئی تھی تو وہی ماں باپ اور بہن بھائی آگے پیچھے پھرتے دوست بھی فخری سے فخر صاحب بلانے لگتے تھے۔اُس کی ہمت و محنت کی مثال دی جاتی۔بچوں کے لیے وہ اِک تمثیلی کردار تھا جس کی تقلید کرنے کی نصیحتیں کی جاتیں اور اِن حالات میں سب نے ثنا کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا اور کسی نے اُسے سمجھانے کی کوشش نہ کی کہ اُسے اپنا گھر بسانا چاہیے بیوی کو وقت دینا اُس کا فرض تھا۔اُس کو توازن قائم کرنا چاہیے نتیجہ یہ کہ اُسے اپنی غلطی کا کہیں احساس ہی نہ ہوا۔

معاشرتی رویے اَب اُس کے مددگار ڈھال بن گئے تھے۔اِن تکلیف بھرے دنوں میں اُس نے ایم اے کیا اور فرم کو بڑا اچھا پروجیکٹ لیکر دیا ترقی کا اِک اور زینہ۔اُس کے لیے اثبات ذات کا اِک در کھلا اپنے فیصلوں کی درستگی کو سند ملی اور پھر اُس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا وہ جانتا تھا کہ ثنا کو تو وہ واپس لے ہی آئے گا یا پھر ثنا نہ سہی کوئی اور سہی اب تو بڑی نگاہیں اُس پر مہربان تھیں!

مگر یہ وقت واپس نہیں آئے گا اور آج وہ اِس مقام پر کھڑا تھا۔ ماضی کی تصویروں کی گیلری کی سیاحت کر کے پہلے خوشی سے سرشار اور پرجوش اور اب گنگ اور گم سم ششدر۔۔۔۔اُس کا نام پکارا جا رہا تھا اُسے بونس کا چیک نئے رینک کا تقرری نامہ اور بنگلے کی چابیاں تھمائی گئیں۔۔۔۔اُس نے دیکھنے سننے والوں پر نظر دوڑائی۔بہت سی رسمی تالیوں کے درمیان بہت سے سچے اور پرخلوص ہاتھ بھی تھے مگر ہر نظر میں خود اپنے لیے ستائش رشک و حسرت اور فخر دیکھ کر فخر الزماں کو اثبات و تصدیق ملی اپنے صحیح و درست ہونے کی وہ واپس سامنے وی آئی پی مہمانوں کے لیے بچھے صوفوں پر جا کر براجمان ہو گیا۔

اُس کی برانچ کی ترقی پانے والے حضرات کو تقسیم انعامات و سند کے بعد فرم نے دوسری برانچ کے لیے تقریروں اور انعامات کے سلسلے کا آغاز کیا۔

اِس دوسری برانچ کے لیے پہلے کی طرح سب سے پہلے آپریشنل مینیجر کا اعلان کیا گیا۔اِس خاتون کی کہانی اور معاشی و معاشرتی پس منظر فخر الزماں سے مختلف نہ تھا اور جب تابندہ حسین کا نام پکارا گیا تو بہت سی گردنوں کے ساتھ فخر الزماں ریاض اور مجید کی گردنیں بھی مڑ گئیں۔آنے والی خاتون کو دیکھ کر وہ تینوں حیرت سے گنگ ہو گئے اور زیرلب بڑبڑائے ''ارے یہ تو تابی ہے' تابی چھنال'' اور اِس کے بعد کے جملے ایسے تھے کہ وہ یہاں نہیں کہہ سکتے تھے دل ہی دل میں دہرائے گئے۔

ریاض مجید کی طرف دیکھ کر تنفر سے بولا ''شروع سے ہی چھنال تھی پوری' تین گلیاں چھوڑ کر رہتی تھی مگر شہرت دور دور تک تھی ارے چین سے بیٹھنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔سارے گھر سے بغاوت کر کے جانے کہاں کہاں کی خاک چھان کر ڈگریاں کیسے لیں۔کہاں سے کیسے کتابیں مانگ تانگ کر پڑھا کون جانے کہاں منہ کالا کیا! نوکریاں کر کے دھکے کھا کر ایسی عورتوں کو شوق ہوتا ہے خواری کا' ھلا بی بی چین سے عزت سے بیٹھو مگر نہ جی' نوکری اچھی مل گئی شادی ہو گئی مگر شوہر کو جانے کیوں لات مار دی؟ یا اُس نے اِس چھنال کو نکال دیا؟ مگر آگے بڑھنے کی لالچ کی پٹی نے اسے انسان تو رہنے ہی نہیں دیا۔ارے ایسی ہی ہوتی ہیں جو بن جاتی ہیں پھر آپریشنل مینیجر ہونہہ کلموہی کہیں کی اور مجید تائید میں سر ہلانے لگا۔

''وقت کی آندھی''

سُرور انبالوی

(راولپنڈی)

زندگی اِک راز ہے اس راز کو افشا نہ کر
اور اگر یہ جرم کرنا ہے تو بپا نہ کر

ہم ازل سے مُنتظر ہیں اب تو پردوں سے نکل
یا ہمارے دل میں کوئی آرزُو پیدا نہ کر

اس قدر ہے روشنی سب آئینے دُھندلا گئے
ان دُھندلکوں میں ضیا اے جلوۂ جانا نہ کر

برف کی چادر ہمارے دوش پر ہے دُھوپ میں
ہے یہی کافی ہمیں اب اور تو رسوا نہ کر

ہم سرِ ظلمت چراغوں کی لوؤں میں ڈھل گئے
اب انہیں آندھی میں رکھ یا زینتِ کاشانہ کر

وقت کی آندھی حیا کے سر سے چادر لے اُڑی
اے خرد انسانیت کو اس قدر رُسوا نہ کر

لوگ اپنے مرقدوں پر بھی کھڑے ہیں شادماں
کربِ جاں اب دوستوں پر بھی سُرور افشا نہ کر

○

نقشبند قمر نقوی بخاری

(امریکہ)

تمثیل، نہ تشبیہ، نہ اخبار، انالحسن
آفاق میں صرف ایک ہی شہکار، انالحسن

رنگینیٔ احساس کی تفسیر جو سوچے
عنواں ہو رقم، مطلعِ انوار، انالحسن

کہتے ہیں سبھی اپنے طریقے سے فسانہ
دیتا ہے صدا مرکزی کردار، انالحسن

اب روشنی خوشبو سے ہم آغوش ہوئی ہے
پہنچا کوئی تا منزلِ دیدار، انالحسن

کیا نکہت و رعنائی و رنگینی و نزہت
ہر دلکشی و وصف کا حقدار، انالحسن

ہیں فطرتِ انساں کے تقاضے تو کئی اور
کیفیتِ جذبات کا معیار، انالحسن

سنتے ہیں قمر نقوی نے یہ دعوی کیا ہے
ہے مملکتِ شوق میں سردار، انالحسن

○

اختر شاہجہاں پوری
(بھارت)

جہاں حرفِ اذاں روشن ہوا
زمیں کیا آسماں روشن ہوا

یقیں کی شمعیں دھندلانے لگیں
دِلوں میں جب گماں روشن ہوا

تری یادوں کا بجھتا سا دیا
پسِ دیوارِ جاں روشن ہوا

مرے داغِ جبیں کے نور ہی سے
کسی کا آستاں روشن ہوا

جو حرفِ معتبر میں نے لکھا
سرِ ہر داستاں روشن ہوا

مرے زخمِ تمنّا کے سبب
خیالوں کا جہاں روشن ہوا

مری خلوت میں اختؔر آج بھی
ستاروں کا جہاں روشن ہوا

○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

کیوں ملاقات زمانے سے نہیں
تم مرے ساتھ زمانے سے نہیں
اور سے اور ہوئے جاتے ہیں
ہاتھ میں ہاتھ زمانے سے نہیں
روز شطرنج الٹ دیتے ہیں
یعنی شہ مات زمانے سے نہیں
سامنے آ کے گزرتے تھے کبھی
اب وہ خیرات زمانے سے نہیں
یار احباب کی محفل ہے کہاں
شیشہ آلات زمانے سے نہیں
اب تو خوبی بھی نہیں ہے کوئی
جب خرابات زمانے سے نہیں
لفظ بے لطف ہوئے ہیں کتنے
بات سی بات زمانے سے نہیں
آپ اخلاص کہاں سے پائیں
وہ تو حضرات! زمانے سے نہیں
چارسو جبر کی خاموشی ہے
شورِ جذبات زمانے سے نہیں
آسمانوں پہ پڑھی جاتی ہے
یہ مناجات زمانے سے نہیں
مرتبہ اہلِ نظر نے بخشا
اپنی اوقات، زمانے سے نہیں
میری یہ بات مری اپنی ہے
میری ہر بات، زمانے سے نہیں
دل کبھی اپنا ہوا تھا ثاقبؔ
اب وہ کم ذات زمانے سے نہیں

○

غالب عرفان
(کراچی)

حصارِ فکر و نظر کے اندر علیم ہونا خبیر ہونا
عذاب ہوتا ہے آگہی میں خود آپ اپنا اسیر ہونا

شعور ویسے بھی چھپ نہ پایا کسی بھی رُخ یا کسی نظر سے
پسند آیا نہ خانقاہوں کو بھی مرا اک فقیر ہونا

جو ہو نہ ممکن مری صدا کا جواب دینا اندھیری شب میں
تو پھر دریچے کے اک جھروکے سے روشنی کی لکیر ہونا

جبینِ تابندہ پر جو زلفیں بکھر گئی ہیں تو میں نے سوچا
شدید موسم سکھا رہا ہے ہواؤں کو بھی شدید ہونا

دراصل آہنگِ لم یزل ہی محرکِ شاعری ہے ورنہ
ہوا کی لہروں کو کیسے آیا نواؤں کا نغمہ گیر ہونا

تمہارے جملوں کا ہر نشانہ ہدف پہ لگتا رہا ہمیشہ!
کہ میں نے دیکھا ہے زخم کھا کر تمہارے لفظوں کا تیر ہونا

زبانِ عرفاںؔ جو کہنا چاہے تو وہ اسے معجزہ کہے گی
شدید بے حس معاشرے میں کسی کا روشن ضمیر ہونا

○

نذیر فتح پوری
(پونے، بھارت)

سارا موسم بہار ہے اپنا
پھر بھی دل بے قرار ہے اپنا

اپنے خوں میں ہے اپنی مے خواری
اپنے دل میں خمار ہے اپنا

جلتے رہتے ہیں اپنی وادی میں
جگنوؤں میں شمار ہے اپنا

گردنیں کاٹتے نہیں ہم لوگ
صرف لفظوں کا وار ہے اپنا

اپنا ہی بوجھ ڈھوتے رہتے ہیں
اپنے اوپر سوار ہے اپنا

ہم بلندی سے گرتے رہتے ہیں
فکر کا آبشار ہے اپنا

دشمنوں سے نہ مات کھائیں گے
تجزیوں کا حصار ہے اپنا

خود سے خود ہیں نذیرؔ شرمندہ
خود پہ باقی ادھار ہے اپنا

○

پروفیسر خیال آفاقی

(کراچی)

''غزل نما''

نگاہِ دل میں وہی شخص ہے حسین و جمیل
کہ جس نے سیرت یوسف سے پائی ہو تشکیل

سناتے رہتے ہیں مژدہ یہ کُشتگانِ حیات
ہزار غم سے چھڑاتا ہے کار عزرائیل

ہو مال و زر کی طلب، یا کہ شہرتِ ارزاں
یہی ہوس ہے جو کرتی ہے آدمی کو ذلیل

ہوا کے ساتھ بدلتا رہا جو رخ اپنا
وہ مُرغِ بادِ نُما ہو سکا نہ مرغِ اصیل

عجیب طرفہ تماشا ہے دیکھ کر بھی مجھے
مرے وجود کی آئینہ مانگتا ہے دلیل

اب اور کیا غم دنیا کرے گا اس کو نہال
جو ہو چکا ہے غم عاشقی میں خود ہی کفیل

ہزار خواہشیں اس کی ، ہزار منصوبے
کہ جس کی زیست کا عرصہ قلیل سے بھی قلیل

وہ شور ہے کہ سحر ہوتے ہی یہ لگتا ہے
کہ جیسے گونج اٹھی ہو صدائے اسرافیل

میں تجھ سے اپنا تعارف کراؤں کیا ہمدم
ہے عاشقی مرا مسلک، جنوں ہے میرا قبیل

میں ایسی راہ پہ تنہا روانہ ہوں کہ جہاں
نہ کارواں کا گذر ہے، نہ کوئی بانگِ رحیل

اب ایسی ملت بیمار کا ہو کیسے علاج
کہ جس کے چارہ گروں کے دماغ بھی ہیں علیل

نہ جانے کیوں نہیں پڑھتے ہیں پاسبانِ حرم
ہے نقش وقت کے ماتھے پہ شرحِ سورۂ فیل

ہے مجھ کو یاد عصائے حکیم کا اعجاز۔۔۔
کوئی تو نکلے گی میرے لیے بھی ایسی سبیل

یہ شاعری ہے کہ جس نے بنا دیا ہے خیالؔ
نہیں تو ہم کو بھی کہتے تھے بچپنے میں ''عقیل''

○

نسیم سحر

(راولپنڈی)

جو اپنی جیب میں نقشے پُرانے رکھتا ہے
ضرور اپنی نظر میں خزانے رکھتا ہے

جہاں تلاش کروں مَیں، وہاں نہیں ملتا
وہ اپنی ذات میں کچھ اتنے خانے رکھتا ہے

ہر اِک سے بات جو کرتا ہے لہجۂ گُل میں
مِرے لئے کوئی شمشیر تانے رکھتا ہے

دراصل میری کوئی بات مانتا بھی نہیں
ہر ایک بات بظاہر جو مانے رکھتا ہے

جو آندھیوں نے گراڈالا گھونسلہ، تو کیا
پرندہ اَور بہت سے ٹھکانے رکھتا ہے

فقیر سوتے ہیں بھوکے اُسی گلی میں جہاں
کوئی پرندوں کی تھالی میں دانے رکھتا ہے

اُسے خبر ہو کہ اِک لمحہ بھی نہیں اُس کا
جسے یہ زعم ہے وہ تو زمانے رکھتا ہے

مِرے لئے ہے وہ آتش فشاں پہاڑ ایسا
مری طرف ہی کھُلے سب دہانے رکھتا ہے

تمہاری یاد ہے یا تارِ عنکبوت کوئی !
جو میرے گرد یہ جالے سے تانے رکھتا ہے

اضافہ کرتا ہے وہ میری نیکیوں میں بہت
مرے خلاف جو لب پر فسانے رکھتا ہے

نہ جانے کیوں مُجھے رکھتا ہے فاصلوں پہ نسیمؔ
مری بیاض جو اپنے سرہانے رکھتا ہے

○

مقبول منظر

(جھارکھنڈ، بھارت)

نیا موسم دکھانے کو ہے جلوہ دیکھئے کیا ہو؟
اُگلتا آگ ساون ہے، نتیجہ دیکھئے کیا ہو؟

لرزتی کانپتی، سہمی ہوئی بَستی کی بستی ہے
وہ قاتل بن کے بیٹھا ہے مسیحا دیکھئے کیا ہو؟

جسے دریا سمجھ کر ہم گئے تھے مشک بھرنے کو
کوئی تانے وہاں بیٹھا ہے نیزہ دیکھئے کیا ہو؟

مِلے گی منزلِ مقصود یا منزل کی محرومی
سفر کا کر لیا ہم نے ارادہ دیکھئے کیا ہو؟

برائے نام بھی گھٹتا نہیں غم، وائے بدبختی
نیا ہر دن بھی لگتا ہے پرانا دیکھئے کیا ہو؟

نگر میں جا کے بسنے کیا ہے قصد تو لیکن
وہاں ہر روز ہوتا ہے تماشہ دیکھئے کیا ہو؟

چھٹیں گی کب شبِ جبر وستم کی ظلمتیں یارب
گرفتِ شب میں ہے سورج کا جلوہ دیکھئے کیا ہو؟

یہاں تو ہر کوئی لگتا ہے دُشمن ہی محبت کا
کہاں لے آئی اُلفت کی تمنا دیکھئے کیا ہو؟

ہمارے اس کمالِ فن پہ حاسِد ہیں خفا منظرؔ
اُٹھالائے ہیں ہم کوزے میں دریا دیکھئے کیا ہو؟

○

ڈاکٹر پریمی رومانی

(پونے، بھارت)

زمیں سے تا فلک چھائی ہوئی ہے روشنی لا
یہ سارا شہر ہے میری نظر میں آنکھ کا دھوکا

سمندر میں ندی بن کر اُتر جاؤں کہاں تک میں
نگل جائے گا پانی ایک دن سارا بدن میرا

اُگل دے گی زمیں سب آگ اپنے اندر کی
رکھے کب تک بھلا یہ بوجھ سینے پر پہاڑوں کا

نگر کو لوگ تو کھُلتا سا آئینہ سمجھتے تھے
مگر مجھ کو نظر آیا کوئی چہرہ نہ اپنا سا

اُسے میں ڈھونڈتا تھا رات کی گہری خموشی میں
نہ جانے کس طرح پھر شہر میں میرا ہوا چرچا

یہی آواز آتی ہے مجھے اندر سے اے پریمی
مٹا کر اپنی دنیا کو زمانے سے ہے کیا پایا

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط۔۔۲۶

ڈاکٹر ناظر خواجہ

مجھے سیونتھ ڈے میں کام کرتے ہوئے تقریباً چھ ماہ ہو چکے تھے۔ جیسا میں نے لکھا ہے اس وقت میں اور رشید صرف دو پاکستانی ڈاکٹر تھے اور وہ بھی جونیئر سطح پر۔ ہمارے تمام سینئر ڈاکٹر غیر ملکی سفید فام ڈاکٹر تھے۔ ایک دن جب میں ایمرجنسی روم میں اپنی معمول کی ذمہ داری نبھا رہا تھا ڈاکٹر چیپ مین داخل ہوا اسکے ساتھ ایک پاکستانی صاحب بھی تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ ابھی ابھی امریکا سے اعلیٰ ڈگری لیکر آئے ہیں اور اب یہاں اسپیشلسٹ کے طور پر کام کرینگے۔ مجھے اور رشید کو خوشی ہوئی کہ گوروں کے ساتھ اب ایک پاکستانی ڈاکٹر بھی اسی سطح پر کام کرینگے۔ پھر ڈاکٹر ناظر نے مجھے اور رشید کو بہت محبت دی اور ہم اس بات سے بھی متاثر تھے کہ انکی تشخیص اور طریقہ علاج بہت اعلیٰ تھا۔

ایک حیرت انگیز مریض

ایک رات میں حسب دستور ایمرجنسی روم کا ذمہ دار تھا کہ تقریباً ساڑھے بارہ بجے کئی لوگ جو اپنے لباس اور طور طریقوں سے مزدور پیشہ اور محنت کش لگ رہے تھے ایک مریض کو چارپائی پر لے کر آئے۔ مریض بہت لحیم شحیم، کالے رنگ اور بڑی خوفناک شکل کا فرد تھا۔ اس نے کالے ڈھیلے ڈھالے کپڑے اور بہت سی کوڑیوں اور بڑے بڑے موتیوں کے ہار پہنے تھے۔ اسکے لمبے لمبے بال اور گہری سیاہ اور گھنی داڑھی تھی۔ میں تو اسے دیکھ کر خود بھی کچھ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس کے لواحقین نے بتایا کہ یہ ''کالا ناگ'' ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اب کتنے لوگوں کو یہ بات یاد ہے کہ ایک زمانے میں یہ شخص بدنام زمانہ غنڈہ اور جرائیم پیشہ فرد ہوا کرتا تھا اور اس نے برنس روڈ کے علاقے میں دہشت پھیلائی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بارے میں ایک دفعہ یہ خبر بھی آئی تھی کہ اس نے دن دہاڑے پاکستان چوک پر ایک قتل بھی کیا تھا۔ معلوم نہیں کیسے یہ اس مقدمے سے بری ہو گیا تھا۔

بہرحال میں نے اس پر فوراً توجہ دی۔ مجھے بتایا گیا کہ اچانک شام سے طبیعت خراب ہوئی ہے اور یہ پیٹ کے اوپری حصہ اور سینے میں آگ کی شکایت کر رہا ہے۔ میں نے اس کا معائنہ کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا کیونکہ معائنہ میں کوئی قابل ذکر خرابی نظر نہیں آئی۔ یہ واضح تھا کہ یہ سرجری کا کیس نہیں ہے۔ میں نے اسے اس قسم کی دوا اور ٹیکہ بھی لگایا جس سے اسے کچھ آرام ہو جانا چاہئے تھا مگر اس کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جو چیز میرے لئے سخت قابل تشویش تھی وہ یہ تھی کہ اسکو بہت زیادہ تکلیف تھی اور وہ بہت بےچین تھا اسے کسی کل چین نہیں آتا تھا اور وہ بار بار اپنے سینے کے نچلے حصے پر ہاتھ پھیر پھیر کر صرف ایک ہی شکایت کئے جا رہا تھا کہ '' آگ ۔۔ آگ۔۔'' ایکسرے وغیرہ کئے گئے اور کچھ خون کے ٹیسٹ لئے گئے مگر ان سے بھی کوئی پتہ نہ چلا میں نے فوراً پریشانی میں ڈاکٹر ناظر کو فون کیا۔ وہ چند ہی منٹ میں ہسپتال پہنچے۔ انہوں نے بھی اسکا بڑی توجہ سے معائینہ کیا اور وہ تمام ٹیسٹ دیکھے۔ میں نے ای سی جی کر لیا تھا مگر اس وقت میں ای سی جی پڑھنا نہیں جانتا تھا۔ ڈاکٹر ناظر نے اسی سی جی کو بھی دیکھا مگر انہیں بھی تشخیص کا سرا نہیں ملا۔ انہوں نے ناک کے ذریعہ نالی ڈال کر معدے کی ٹھنڈے پانی سے صفائی بھی کی کہ اگر السر یا تیزابیت کی وجہ سے یہ آگ کی شکایت کر رہا ہے تو فائدہ ہوگا اور اگر معدے میں خون رس رہا ہے تو اسکی بھی تشخیص ہو جائیگی مگر اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں اپنی بےصبر فطرت کی وجہ سے مستقل انکے سر پر سوار تھا کہ جلد معلوم کریں کہ کیا معاملہ ہے اس کے علاوہ مجھ سے اس کی تکلیف بھی نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے پاس تشخیص کے جو وسائل تھے وہ ناکافی تھے۔ ڈاکٹر ناظر نے اس کے ساتھ کوئی دو گھنٹے گذارے مگر کوئی حتمی رائے قائم نہ کر سکے آخر کار انہوں نے یہی کہا کہ میں اس کو درد اور سکون دینے کی بھاری دوائیں دوں اور اس پر قریبی نظر رکھوں کبھی کبھی مرض کچھ گھنٹوں کے بعد زیادہ واضح ہو جاتا ہے اس وقت تشخیص ہو جائیگی اس کے بعد وہ چلے گئے۔ اب ہم مریض کو مردانہ وارڈ میں لے آئے تھے۔ میرے ساتھ نائٹ سپروائیزر سرفراز بھی جو کچھ کر سکتی تھی کر رہی تھی۔ صبح تک میں اس مریض کے ساتھ بیٹھا رہا۔ درد اور سکون کی دواؤں کی بھاری مقدار سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا اور وہ ''آگ آگ'' کی پکار لگاتا رہا اور آخر کار ساڑھے چھ بجے اس نے دم توڑ دیا۔ یہ کیس میرے ذہن میں آج بھی تازہ ہے اور میں اب بھی سوچتا ہوں کہ اس کو کیا ہوا تھا۔ سالوں بعد جب میں امریکہ میں ایک دفعہ ڈاکٹر ناظر سے ملا اور میں نے اس کے بارے میں انکی رائے پوچھی تو انہوں نے کہا کہ انکے خیال میں اسے MYOCARDIAL INFARCTION یعنی ہارٹ اٹیک ہو رہا تھا۔ اگرچہ یہ بالکل ممکن ہے مگر میں اس سے متفق نہیں اسے اس مرض کی دوسری علامات نہیں تھیں اور کئی دفعہ دہرانے کے بعد بھی اسکا ای سی جی اور خون کے ٹیسٹ نارمل تھے۔ پھر اسکا درد اور بےچینی بھی ایسی تھی کہ وہ کچھ مختلف تھی۔ میں آج بھی اس پر PUZZLE ہوتا ہوں اور مجھے خیال آتا ہے کہ اگر میرے پاکستان کی ملازمت کے دور میں کسی ایک فرد کی آٹوپسی ہونی چاہئے تھی تو وہ اس کی ہونی چاہئے تھی اس کے علاوہ میں موت کی ناقابل تسخیر قوت اور زندگی کی کمزوری و ناپائیداری کے اس منظر سے بھی بہت متاثر ہوا اور کئی دن افسردہ اور تھوڑا سا دہشت زدہ رہا۔

میرے لئے یہ ناقابل برداشت تھا کہ اس قدر قوی ہیکل شخص کس طرح چند گھنٹوں میں، کراچی کے سب سے اچھے ہسپتال میں، امریکہ سے آئے ہوئے قابل ڈاکٹر کے ہاتھوں تڑپ تڑپ کر راکھ کا ڈھیر بن گیا اور ہم اسکو بچا نا تو

بڑی بات ہے وقتی طور پر آرام بھی نہ پہنچا سکے۔

ایک ایسا ہی واقعہ امریکا میں

انسان کا علم ابھی بہت محدود اور ناپختہ ہے۔ یہ مناسب موقعہ ہے کہ میں موجودہ دور کا بھی ایک واقعہ بیان کرتا چلوں کہ جب جدید ترین آلات سے لیس ہونے کے باوجود امریکہ کے بہترین ڈاکٹر مریض کو نہ صرف بچا نہ سکے بلکہ اس کی تشخیص بھی نہ کر سکے۔ کچھ سال پہلے امریکی ٹیلیوژن پر ایک پروگرام آتا تھا اسکا مرد اداکار JOHN RITTER ملک میں بہت مقبول تھا اور ہالی وڈ میں اسکا بڑا نام تھا۔ دوسال پہلے اسکے سینے میں درد اٹھا اسے لاس انجلیز کے سب سے اچھے ہسپتال میں داخل کیا گیا آٹھ گھنٹے اس کا علاج ہارٹ اٹیک (یعنی وہی بیماری جو ڈاکٹر ناظر کے خیال میں کالے ناگ کو تھی) تشخیص کر کے ان تمام جدید ترین طریقوں سے کیا گیا جو ممکن تھے مگر اسے فائدہ نہیں ہوا اور چند گھنٹوں میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اسکی ''اعورطا'' یعنی شریان اعظم پھٹ گئی تھی جس کی تشخیص نہیں ہوسکی۔ اگر یہ تشخیص صحیح وقت پر ہوجاتی تو شاید اس کی جان بچائی جاسکتی تھی۔

اسکی فیملی نے ہسپتال پر کئی ملین ڈالر کا دعویٰ کیا اور ہسپتال کو ان سے معاملہ طے کرنا پڑا۔ اگرچہ انسان نے پچھلی صدی میں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ گذشتہ چالیس سالوں میں طب کے میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہے مگر ابھی تو بہت دور جانا ہے اور انسانی جسم کے بہت سے رازوں سے واقفیت حاصل کرنا باقی ہے۔

ایک المیہ جو میں کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا

ڈاکٹر محسن احمد بھی ہسپتال کے ڈاکٹروں میں نیا اضافہ تھے۔ وہ انگلینڈ سے بچوں کے امراض کی ڈگری لیکر آئے تھے۔ وہ ایک ہینڈسم، طویل القامت شخص تھے جن کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی۔ مریضوں سے انکا برتاؤ اتنا اچھا تھا کہ چاہے مائیں کتنی پریشانی لیکر آتی تھیں وہ انہیں اتنی تسلی دیتے تھے کہ جاتے ہوئے انکے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی۔

ایک شام کوئی آٹھ بجے ایک بچہ ایمرجنسی روم میں لایا گیا۔ اسے موسمی کھانسی اور برانکائیٹس کی شکایت تھی۔ محلے کے ڈاکٹر اسکا علاج کر چکے تھے مگر اس کو آرام نہیں آیا تھا۔ شام سے اس کے سانس میں ہلکی ہلکی سی سیٹیاں بجنے لگیں تھیں پریشانی میں اس کے ماں باپ اس کو لیکر ہمارے ہسپتال بھاگے تھے۔ یہ لوگ ناظم آباد میں رہتے تھے اور یہ اچھے طبقے کی پڑھی لکھی فیملی لگ رہی تھی۔ دونوں ماں باپ بہت کم عمر تھے اور یہ انکا پہلا بچہ تھا۔ بچے کی عمر کوئی چھ ماہ تھی اور یہ بے انتہا خوبصورت اور بہت بھرے بھرے جسم کا بچہ تھا جو اس قدر خوش مزاج تھا کہ اپنی بیماری اور تکلیف کے باوجود جب ہماری نرس نے اسکو خوش کرنے کے لئے اس کے سامنے چٹکیاں اور سیٹی بجائی تو یہ بہت دلفریب انداز سے مسکرایا اور اسکے گورے گورے گالوں میں گڑھے پڑنے لگے۔ اس کے بالوں میں چھلّے پڑے ہوئے تھے۔ اس کی ماں جو خود بھی کم عمر تھی اس قدر پریشان تھی کہ اس سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی اس سے پہلے یہ بچہ کبھی معمولی بیمار بھی نہیں ہوا تھا۔ باپ بھی پریشان تھا مگر مرد ہونے کے ناطے خود پر قابو پائے ہوئے تھا۔ میں نے بچے کا معائینہ کیا۔ صاف ظاہر تھا کہ انفیکشن اس کی سانس کی نالیوں میں اتر گئی ہے مگر یہ چیز بچوں میں عام ہے۔ فوراً ایکسرے کیا گیا شکر ہے اس میں کوئی نمونیا نہیں تھا۔ میں نے ماں باپ کو تسلی دی مگر یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ دونوں بہت زیادہ پریشان ہیں اور میرے نظریہ میں مریض یا اسکے لواحقین کو اطمنان دلانا بھی ضروری ہے میں نے ڈاکٹر محسن احمد کو فون کیا اور اسکی ماں سے کہا کہ اگرچہ ضرورت تو نہیں مگر میں ہسپتال کے بچوں کے اسپیشلسٹ کو ابھی ابھی بلاتا ہوں تاکہ وہ بھی اسکو دیکھ لیں اور آپ لوگوں کو بھی اطمینان ہوجائے۔

ڈاکٹر احمد نے مجھ سے فون پر پوچھا کہ اس کے خون کے ٹیسٹ کیسے ہیں۔ میں نے بتایا کہ ٹھیک ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ ایکسرے ہوا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ وہ بھی ٹھیک ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا سانس پر بہت زیادہ تکلیف ہے میں نے کہا کہ ایسا بھی نہیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ عام سا مسئلہ ہے اور ایسے کیس تو تم خود ہی نبٹا دیتے ہو تو پھر تم کیوں پریشان ہو؟۔ میں نے کہا کہ یہ تو صحیح ہے مگر اسکے ماں باپ بہت زیادہ پریشان ہیں اگر آپ آجائیں تو انکو ذرا تسلی ہو جائیگی۔ میں یہاں بے اختیار یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی میں بہت اچھے اور فرشتہ خصلت سینئر ڈاکٹر ملے۔ یہ سن کر انہوں نے مزید ایک لفظ نہیں کہا اور مجھے بتایا کہ وہ چند منٹ میں ہسپتال پہنچتے ہیں۔

کوئی بیس منٹ کے اندر اندر ڈاکٹر احمد اپنے طویل قامت اور بے حد متاثر کن شخصیت کے ساتھ ایمرجنسی روم میں داخل ہوئے وہ اپنے اسٹیتھسکوپ کی سینے پر رکھنے والی ٹونٹی کو اپنی ہتھیلی پر بار بار مار رہے تھے یہ انکی عادت تھی۔ حسب دستور انکے چہرے پر دلفریب مسکراہٹ تھی انہوں نے پہلے اپنے خاص انداز میں ماں باپ کو تسلی دی پھر بچے کا بہت غور سے معائینہ کیا اس کے بعد خود ایکسرے دیکھا اور مطمئین ہو کر مجھے کچھ ہدایات دیں۔ میں نے داخلے کے کاغذات تیار کئے۔ اب وہی مشکل مرحلہ کہ ہمارے ہسپتال میں ماں باپ کو رہنے کی اجازت نہیں۔ ماں کا تو برا حال ہوگیا۔ ہم ہمیشہ یہ پوچھتے تھے کہ اگر ایمرجنسی میں ضرورت پڑی تو والدین کو کیسے اطلاع دیں۔ یہ وہ وقت تھا جب کراچی میں فون لگنے میں سات سال لگتے تھے اور بہت ہی کم لوگوں کے یہاں فون تھے۔ ان بیچاروں نے بھی اپنے کسی کنبے والے کا فون دیا۔ ماں تو اس قدر پریشان تھی کہ وہ بچے کو کسی اور ہسپتال میں لیجانا چاہ رہی تھی مگر باپ نے سمجھایا کہ اتنا اچھا ہسپتال ہے کہ بچے کے اسپیشلسٹ نے بھی فوراً رات ہی کو آکر دیکھا ہے اور سب نے یہی کہا ہے کہ عام معاملہ ہے اس پر وہ راضی ہوئی۔ اس نے بچے کو گود میں لے کر پیار کیا اور بچہ نرس کی گود میں دیا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ بچہ اپنی ماں کو جاتا دیکھ کر منہہ بسورنے لگا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر اسکی طرف بڑھنے کی کوشش کرنے لگا جس سے میرے دل پر بہت اثر ہوا اور بعد میں یہ منظر کئی دنوں تک میری نظروں میں پھرتا رہا میں اس وقت تک بچے کے ساتھ رہا جب تک اسے بچوں کے وارڈ میں اچھی طرح سیٹل نہیں کر دیا۔ بھاپ، آکسیجن اور وہ تمام دوائیں جو سانس کی نالیوں

کو پھیلانے اور انفیکشن کو دور کرنے کے لئے ضروری تھیں شروع کر دی گئیں میں نے رات کی نرس کو بھی تاکید کر دی کہ اس بچے پر خاص نظر رکھنا۔اس کے بعد میں دوسرے وارڈ میں مصروف ہو گیا مگر رات کو ساڑھے بارہ بجے اپنے سونے کے کمرے میں جانے سے پہلے میں نے ایک بار پھر بچے کو جا کر دیکھا اسکی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی مگر مزید خراب بھی نہیں ہوئی تھی۔میں سونے چلا گیا۔

رات تین بجے بچوں کے وارڈ کی نرس نے مجھے فون کر کے بتایا کہ بچے کی حالت مزید خراب ہو گئی ہے۔میں تقریباً بھاگتا ہوا دوسری منزل پر وارڈ میں پہنچا۔ اسے سانس کی بہت زیادہ تکلیف تھی،اسکا چہرا متمتایا ہوا تھا اور اسکی چھاتی کے پٹھے سخت تناؤ میں تھے۔میں نے فوراً اسے ایک انجکشن رگ کے ذریعہ لگایا اور تقریباً چیختے ہوئے ڈاکٹر احمد کو فون کیا۔وہ گہری نیند میں تھے۔میں نے انہیں بس اتنا کہا کہ فوراً آئیں۔ وہ پریشانی کی حالت میں رات کے تین بجے ہسپتال پہنچے ادھر میں نے اسکے ماں باپ سے رابطہ کرنے کے لئے انہیں اس نمبر پر فون کیا جو انہوں نے دیا تھا مگر گھنٹیاں بجتی رہیں کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ڈاکٹر احمد نے اپنے دھیمے اور ٹھنڈے مزاج سے بچے کو دیکھا،ایک ایکسرے دوبارہ فوراً لیا گیا۔اس میں بھی نمونیا یا سینے میں ہوا کے ٹریپ ہو نے PNEUMOTHORAX کی کوئی علامت نہیں تھی۔یہ تو ہمیں معلوم ہی تھا کہ اسکی سانس کی نالیاں مزید سکڑ گئیں ہیں اس کو آکسیجن ماسک کے ذریعہ دی جا رہی تھی رگ کے ذریعہ بھی تمام ممکنہ دوائیں دی جا رہی تھیں مگر فائدہ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔یہ مسئلہ اگر آج بھی امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں درپیش آجائے تو عارضی طور پر مصنوعی سانس کی مشین پر ڈالنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جا سکتا۔۱۹۶۹ میں یہ مشینیں یا انکا استعمال عام نہیں ہوا تھا۔میں نے اپنے امریکہ کے قیام میں پہلی دفعہ ایسی مشینوں کا آئی سی یو میں استعمال ۱۹۷۲ میں دیکھا۔ادھر پوری کوشش کے باوجود اسکے ماں باپ سے کوئی رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ڈاکٹر احمد میرے ساتھ ساتھ تھے ہم سے جو بھی ہو سکتا تھا ہم کر رہے تھے مگر مجھے احساس ہو چکا تھا کہ اب ہم مزید کچھ نہیں کر سکتے بس انتظار کر سکتے ہیں کہ دوائیں اپنا اثر دکھائیں اور اس کی حالت میں بہتری ہونا شروع ہو۔افسوس ایسا نہیں ہوا اور کوئی صبح پانچ بجے وہ معصوم روح اپنے خالق سے جا ملی۔میں تو ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا ڈاکٹر احمد نے مجھے سہارا دیا اور کہا کہ یہ تو اس پیشہ میں دن رات ہوگا۔مجھے اس بات کی اور زیادہ پشیمانی تھی اور انتہائی دکھ تھا کہ صبح جب اس کے ماں باپ اسے دیکھنے آئیں گے تو ہم انکا مردہ بچہ انکے حوالے کرینگے۔آج اس واقعہ کو پینتالیس سال ہو چکے ہیں مگر اب بھی یہ لکھتے ہوئے میرا دل کانپ رہا ہے اور میرے ہاتھوں میں لرزش ہے۔لوگ کیسی کیسی آزمائش سے گذرتے ہیں!!ایسے موقعوں پر میں اللہ تعالی سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہر ایک کو اپنی پناہ میں رکھے اور کسی کو ایسی آزمائش میں نہ ڈالے۔آمین

ٹال والا گھر

یہ اپریل ۱۹۶۹ کا زمانہ تھا۔میں ہسپتال میں اب اچھی طرح سیٹل ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی ذوالفقار بھائی جان کے یہاں رہائش کی وجہ سے اپنی زندگی سے بھی بہت مطمئین تھا یہاں رہنے کی وجہ سے میری اپنی ذات پر تو بہت ہی کم خرچ ہوتا تھا۔باقی روپے میں میر پور خاص امّاں ابّا اور دردانہ کے اخراجات کے لئے روانہ کر دیتا تھا۔میر پور خاص جیسے چھوٹے شہر کے لحاظ سے یہ رقم ان لوگوں کے گذارے کے لئے کافی تھی۔

تھوڑی سی مالی فارغ البالی

اسی مالی فارغ البالی کی وجہ سے میں اپنے دوستوں کے ساتھ کبھی کبھی اچھی ہوٹلوں میں کھانا کھانے اور اچھی فلمیں دیکھنے کی عیاشی بھی کر لیا کرتا تھا۔لیکن اس مالی فارغ البالی کے باوجود ابھی تک میرے پاس کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی حتیٰ کہ میں نے ابھی تک کسی بہتر کپڑے کی پتلون تک نہیں پہنی تھی کیونکہ ''لارنس پور کی سمر'' کا کپڑا اس وقت اٹھارہ روپے گز تھا اور پتلون کی سلائی بھی چالیس روپے تھی۔میں ابھی تک میر پور خاص کے درزیوں کی سلی زین یا ایسے ہی دوسرے سوتی کپڑے کی پتلونیں پہنا کرتا تھا۔ایک دن انصار بھائی جان میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں اسی شام انکے ساتھ کراچی کی مشہور دکان ''موسیٰ جی'' چلوں اور سمر کی پتلون کا آرڈر دوں۔انکے بقول بعد میں جو ہوگا دیکھا جائیگا۔اسی شام ہم صدر گئے اور ایک گہرے سلیٹی رنگ کے سمر کے کپڑے کی پتلون کا آرڈر دیا گیا۔اسی کے ساتھ پولی ایسٹر کی بنی ''کریم کیری لین'' کی ایک شرٹ بھی خریدی گئی جو اس وقت بہت فیشن میں تھی اور اسکی قیمت اڑتیس روپے تھی۔ایک ہفتے بعد میں یہ پتلون اور قمیض پہن کر ہسپتال گیا۔ایسی مسرت پھر اٹلی اور فرانس کے ڈیزائینر سوٹ پہن کر بھی نہیں ملی۔

ڈارمائی تبدیلی!!!

میرے امّاں ابّا اور دردانہ جن کی کفالت مکمل طور پر میری ذمہ داری تھی میر پور خاص میں سلطان بھائی جان کے یہاں رہتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنی موجودہ آمدنی میں یہ ممکن نہیں تھا کہ میں انکو کراچی میں بسا سکتا۔کراچی میں تو میری تنخواہ کا دو تہائی حصہ صرف گھر کے کرائے ہی میں خرچ ہو جاتا۔

ایک دن جب میں حسب دستور ایک لمبی ڈیوٹی جس میں رات کی جگار بھی شامل تھی کر کے واپس ذوالفقار بھائی جان کے یہاں پہنچا تو میں نے وہاں لوگوں کو کچھ پریشان دیکھا انہوں نے مجھے بتایا کہ ہمارے گھر والے یعنی امّاں ابّا امّاں اور دردانہ اپنا تمام سامان لیکر ہمیشہ کے لئے کراچی آ گئے ہیں اور اس وقت یہ لوگ فرخی خالہ جان کے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔مجھے وہاں فوراً طلب کیا گیا ہے۔

میں انہی کپڑوں میں جو میں ہسپتال سے پہن کر آیا تھا فوراً ناظم آباد بڑے میدان کی طرف پیدل چل پڑا۔دوپہر کے دو بجے کا وقت تھا تیز دھوپ تھی۔ہانپتا کانپتا انکے یہاں پہنچا یہ لمحہ آج اتنے سال بعد بھی میری یادداشت اور تصور میں ایسا ہی زندہ ہے جیسے اس سہ پہر تھا۔میں جب ان کے چھوٹے سے آنگن میں داخل ہوا تو انکے آنگن میں لگے ایک آم کے درخت کے نیچے ایک چھوٹی سی چارپائی پڑی تھی اور میرے ابّا امّاں اور دردانہ،تینوں اس چارپائی پر چڑھے بیٹھے تھے۔انکا مختصر سامان جو دو لوہے کے بکسوں اور ایک لپٹے ہوئے بستر پر مشتمل تھا زمین پر رکھا تھا۔میری والدہ تو

چونکہ ہمیشہ سے فطرتاً ایک پرامید خاتون تھیں اس لئے انکے ہونٹ تو حسب عادت پان کی سرخی سے رنگے تھے اور چہرے پر بھی وہی پرانی تابندگی تھی مگر میرے ابّا سر جھکائے انتہائی افسردگی اور اس کے ساتھ ہی بے حد شرمندگی سے بیٹھے تھے جیسے وہ سب کچھ ہار گئے ہوں ان کے چہرے پر ایک احساس جرم سا تھا جیسے کہہ رہے ہوں بیٹے ہم نے تمہیں سنبھلنے بھی نہیں دیا اور اتنی جلدی ہم تمہارے کندھوں پر سوار ہو گئے۔ میرے والد ایک بہت خوددار انسان تھے اور انکی پوری زندگی شدید محنت کرتے گذری تھی۔ انکی جو بھی بساط تھی وہ تو اپنی جگہ تھی مگر انہوں نے کبھی محنت یا اپنی ذمہ داری سے جی نہیں چرایا تھا۔ اس سہ پہر انکے چہرے کے تاثرات مجھے اپنی آخری سانس تک یاد رہینگے۔

خالہ جان کا گھر چھوٹا مگر دل بڑا تھا انہوں نے اصرار کیا کہ فی الحال یہ لوگ جیسے تیسے انکے یہاں رہینگے۔

وقتی طور پر تو یہ ٹھیک تھا مگر اسکا کوئی مستقل انتظام تو کرنا ہی تھا اور بہر حال تھی تو یہ میری ہی ذمہ داری۔ میں کسی طرح بھی ضرب یا تقسیم کرتا مگر حساب برابر نہیں بیٹھتا۔ مجھے کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی کہ میں ایک علیحدہ گھر لیکر اپنے کنبے کو سیٹل کر سکوں۔ ناظم آباد میں سب سے چھوٹے گھر کا کرایہ بھی ایک سو پچاس روپے ماہانہ تھا۔ کرائے کے بعد میری مختصر تنخواہ میں چار بالغ لوگوں کے مہینے بھر کے کھانے کے اور دوسرے اخراجات کیسے پورے ہونگے۔ جہاں میری والدہ بہت بے فکر اور پرامید فطرت کی خاتون تھیں، میں اسی قدر ہر چیز کی فکر کرنے والا اور بہت جلد پریشانیوں کے بوجھ تلے دب کر مرجھا جانے والے لوگوں میں شامل ہوں۔ اس فکر نے مجھے آدھا کر دیا تھا۔ پھر اپنے ابّا اور امّاں کی طرح میں بھی بے حد خوددار ہوں اور میں کسی کی مدد لینا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اپنے کنبے کا خالہ جان کے یہاں رہنا اچھا نہیں لگ رہا تھا

ایک اور فرشتہ

یہاں مجھ پر یہ اخلاقی فرض عائد ہوتا ہے کہ میں یہ لکھوں کہ مجھے زندگی میں درجنوں ایسے فرشتہ خصلت لوگ ملے جنہوں نے انسانیت پر میرا اعتقاد پختہ کر دیا۔ میرے لئے یہ کہنا بھی واجب ہے کہ میری کامیابیوں میں ایسے کئی لوگوں کا بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے زندگی کے مختلف ادوار میں مجھے سہارا دیا اور مشکل وقت میں میری مدد کی۔ میں جب خالہ جان کے یہاں رہتا تھا تو بڑے میدان کے پاس ایک لانڈری تھی میں یہاں اپنے کپڑے دھلواتا تھا۔ اس کے مالک کا نام شریف تھا مگر زیادہ تر اس پر اس کے والد جو ضعیف انسان تھے بیٹھا کرتے تھے۔ یہ ایک نہایت مہذب اور نرم گفتار بزرگ تھے۔ انہیں کسی وجہ سے میری گفتگو بڑی پسند تھی اور وہ ہمیشہ میرے بارے میں بڑے اچھے جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ایک دن جب میں صبح ان کو اپنے کپڑے دینے رکا تو وہ میری شکل دیکھ کر کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ کچھ پریشان ہیں۔ میں نے بات ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ بہت شفقت سے کہنے لگے ''میری کونسی حیثیت ہے کہ میں آپکی مدد کر سکوں مگر آپ کہہ کر تو دیکھئے۔ ہوسکتا ہے کوئی صورت نکل آئے، انسان ہی انسان کی مدد کرتا ہے'' میں تو روہانسا سا ہو گیا۔ میں نے کہا ''میرے والدین سندھ سے میرے پاس آگئے ہیں اور انکے ٹھہرنے کا کوئی بندوبست نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں کیونکہ میری یہ حیثیت نہیں کہ میں ڈیڑھ سو روپے مہینے کا مکان کرائے پر لے سکوں'' سچ کہا گیا ہے کہ اللہ مسبب الاسباب ہے وہ مجھ سے کہنے لگے کہ انکی ایک بیٹی ہے جس کے ساتھ کوئی خانگی مسئلہ ہے اور اس کے لئے انہوں نے اپنے مکان کی چھت پر ایک کمرہ بنا دیا ہے اس میں ایک دو چھتی یا کوٹھری بھی ہے اور بیحد چھوٹا سا آنگن ہے۔ کوئی باورچی خانہ بھی نہیں ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو دوبارہ نیچے اپنے گھر میں بلالیں گے اور اگر مجھے یہ قبول ہو تو میں جب چاہوں اس میں منتقل ہو سکتا ہوں۔

ایک نیا چھوٹا سا آشیانہ

وہ میری کم عمری اور احساس ذمہ داری سے اتنے متاثر تھے کہ وہ اس پر بھی مصر تھے کہ وہ مجھے یہ کمرہ مفت دینے کو تیار ہیں۔ میں تو اس قدر جذباتی ہوا کہ ان کے قدموں پر گر کر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ مفت تو میں نہیں لونگا۔ آخر کار میں نے پینسٹھ روپے مہینے کے کرائے پر اس فلیٹ یا کمرے کا معاملہ طے کر لیا۔

میں نے خوشی خوشی گھر آکر اپنے والدین کو یہ خوش خبری سنائی۔

ہمارے خاندان میں اور میری یادداشت میں اس گھر کی پہچان ''ٹال والا گھر'' بنی کیونکہ اس کے بالکل برابر میں لکڑیوں کی ایک بڑی ٹال تھی۔ گھر میں گھسنے کے لئے ایک بدرنگ اور چھوٹا سا دروازہ تھا اس کے بعد ایک بہت تنگ زینہ تھا جو اوپر چڑھتا تھا اور پھر ایک خاصہ بڑا کمرہ تھا۔ اس میں ایک ہی کھڑکی تھی جو نیچے ٹال کی طرف کھلتی تھی۔ چونکہ گھر میں کوئی باورچی خانہ نہیں تھا اس لئے امّاں نے اسی کمرے کے کونے میں ایک جگہ انگیٹھی رکھ کر کھانا پکانے کا انتظام کر لیا تھا۔ کمرے کی مغربی دیوار میں ایک بے دروازے کا موکلہ تھا اس میں اچھل کر جانا ہوتا تھا اور اس میں ہم نے اپنے دو صندوق ڈال لئے اور میرا ایک کھٹولہ بھی اسی میں ڈال دیا گیا۔ یہ گھر بیحد معمولی تھا اس کے باوجود مجھے یہاں آکر حقیقی خوشی ہوئی کہ یہ ہمارا ''اپنا'' تھا اور اب میں کسی اور کے یہاں نہیں پڑا تھا۔

میرے ابّا کے چہرے پر بھی سچی خوشی تھی۔ وہ بہت پرجوش تھے اور بار بار کہتے تھے کہ گوشت کی مارکیٹ سبزی والے اور دودھ کی دکانیں بھی دو قدم پر ہیں۔ ہمارا چھوٹا سا کنبہ کراچی میں اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر ایک نئی زندگی شروع کرنے والا تھا۔ میری امّاں مجھے مبارک باد دے رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ میری ہمت بڑھاتے ہوئے یہ بھی کہہ رہی تھیں ''بیٹے ابھی تو یہ ابتداء ہے۔ اللہ تمہیں ایسے گھر میں رہنا نصیب کرے گا جس کے فرش شیشے کی طرح چمکیں گے'' شاید یہ قبولیت کی گھڑی تھی انکی یہ دعا قبول ہوئی اور میں انتہائی تشکر کے جذبات اور نہایت خاکساری کے ساتھ یہ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ آج کیلی فورنیا میں میرے اطالوی طرز تعمیر کے گھر کا سنگ مرمر کا فرش حقیقتاً شیشے کی طرح چمکتا ہے۔ میری زندگی کی کامیابیوں میں اللہ تعالیٰ کے بصد میری امّاں کی دعاؤں کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ اس رات مجھے بہت عرصے بعد انتہائی پرسکون اور گہری نیند آئی۔ اس میں اللہ کی رحمت کے علاوہ لانڈری کے مالک شریف کے والد صاحب کا سب سے بڑا ہاتھ تھا اور میں اس سلسلے میں انکا آج بھی ممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں سچے موتیوں کا محل عطا کرے۔ آمین

چند سپیاں سمندروں سے

(سفرنامۂ جنوبی افریقہ سے انتخاب)

پروین شیر (کینیڈا)

قسط.....ا

جسم وجاں پرواز میں

اور۔۔۔طیارہ اپنے آہنی پروں کو پھیلائے ہوئے زمین کے سپاٹ سینے پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔۔۔ اور تیز۔۔۔ پھر دور تک پھیلے ہوئے سنگلاخ رن وے سے ایک لمبی جست لگا کر فضاؤں میں پرواز کرنے لگا تھا۔ اوپر۔۔۔ اور اوپر۔۔۔ زمین دور ہوتی جا رہی تھی اور چھوٹی۔۔۔ پروین اپنی سیٹ پر سر ٹکائے ہوئے اتنی بڑی زمین کو اتنی چھوٹی ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ زمین جس پر انسانی وجود ایک ذرّہ ہے وہی اب خود ذرّہ بنتی جا رہی تھی۔ میلوں دوڑتے ہوئے ہائی وے اب باریک لکیریں بن گئے تھے۔ فلک بوس عمارتیں اب چھوٹی چھوٹی ڈبیوں میں تبدیل ہوتی نظر آ رہی تھیں اور ندیاں قطروں میں بدلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ طیارہ اپنی پوری طاقت سے اڑ کر بادلوں کا نرم سینہ چیرتا ہوا بلند ہوتا جا رہا تھا۔ ابر کے سمندر کی لہروں میں ڈوب کر زمین لاپتہ ہو گئی تھی جس سے دور یہ ایک نیا جہان تھا۔ یہ خلاؤں کا جہان تھا۔ پُراسرار۔۔۔ خاموش آوازیں گونج رہی تھیں جنہیں وہ سن رہی تھی۔ نیچے سفید نرم روئی کی چادر بچھی ہوئی تھی اور اوپر نیلا شامیانہ تنا ہوا تھا۔ وسیع وعریض۔! لامتناہی۔۔۔! ہمیشہ کی طرح زمین سے دور اس نئے جہان میں آ کر دل کی عجیب کیفیت تھی۔ جس کا کوئی نام نہ تھا۔ ایک انوکھا احساس تھا ایک طفلانہ خواہش تھی۔۔۔ کھڑکی سے بادلوں کی آغوش میں کود جانے کی۔۔۔ اُس کی نرم لہروں میں شناوری کی خواہش۔۔۔ اس میں ضم ہو کر بادل بن جانے کی خواہش۔ اُس کے دل کی زمین سے سوچ کا طیارہ بھی اپنی بھرپور اُڑان میں مصروف تھا۔

آج وہ۔۔۔ طیارے کی بانہوں میں اڑ رہی تھی اور زمین کے اس حصے پر قدم رکھنے جا رہی تھی جسے صرف تصویروں میں دیکھا تھا۔ جہاں کی سچی کہانیاں کتابوں میں پڑھی تھیں۔ جہاں کا ماضی عبرت ناک تھا۔ جہاں انسانوں نے انسانوں پر وہ ظلم ڈھائے تھے جو ایک بھیانک خواب تھا۔ وہ Apartheid کا زمانہ۔۔۔ جب رنگ ونسل کی بنیاد پر، جذباتی اور جسمانی وقار کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا۔ جہاں انسانیت منہ چھپائے سسک رہی تھی۔۔۔ اور بربریت مسکرا رہی تھی۔ ظلم راج کر رہا تھا اور بے بسی آہیں بھر رہی تھی۔ زندگانیاں ننگے سر ٹھٹھر نے پر مجبور کر دی گئی تھیں۔ کیونکہ ان کے رنگ اور روپ قدرت نے ان لوگوں سے مختلف تخلیق کیے تھے جو اپنی خواب گاہوں میں نرم وگرم ریشم کی آغوش میں محوِ خواب ہونا اپنا حق سمجھتے تھے۔ جہاں رنگ ونسل کی بنیاد پر ہی خوبصورت خواب دیکھنے کا حق تھا۔ سفاک دلوں کے بے رحمانہ سلوک کی سچی کہانیاں اُس کی زندگی کے حسین رنگوں کو دکھ کے سیلاب میں بہا دیتی تھیں۔ جھرجھری سے آ جاتی تھی یہ سن کر کہ سفید فام ہاتھوں میں پھولوں کی نرمی تھی اور سیاہ فام ہاتھوں میں پتھروں کی سختی۔ سفید پیکر سیاہ جسموں کی سیڑھیوں کے سہارے بلندی کو چھو لیتے تھے اور زخمی سیاہیاں پاتال میں گر جاتی تھیں۔ آج اُسی سرزمین کی طرف طیارے کی بانہوں میں وہ سمٹتی ہوئی جا رہی تھی۔ جہاں جانے کی تمنا برسوں سے تھی جہاں سیاہ فام زندگیوں کے لیے انسانی حقوق کے سب دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ خوابوں کے سب دروازوں پر تالے تھے۔ روشنیوں کے سب دریچے مقفل تھے۔ ان کی تقدیروں کے افق پر دکھ کے افسانے خون کے آنسوؤں کی سرخ روشنائی سے تحریر ہو گئے تھے۔ روشنیوں کی، خوابوں کی اور ان کی تعبیروں کی بانہیں صرف سفید فام لوگوں کے لیے وا تھیں۔۔۔

طیارے میں دنیا

وہ خیالات کے سمندر میں غوطے لگا رہی تھی۔۔۔ ڈوب رہی تھی۔۔۔ ابھر رہی تھی۔ طیارہ اپنی مخصوص رفتار سے پرواز کر رہا تھا۔ وہ بادلوں سے آگے کسی اور ہی جہاں میں پہنچ گیا تھا۔ زمین کا کہیں کچھ پتہ نہ تھا۔ جوہانس برگ پہنچنے میں دس گھنٹے باقی تھے۔ ایئر ہوسٹس کی مصنوعی مسکراہٹ اور مشینی لہجے نے اُسے چونکا دیا تھا۔۔۔ وہ اپنی سیٹ سے کھڑی ہو کر سفر در سفر مسافروں کو دیکھ رہی تھی۔ مختلف چہرے، مختلف جذبات، کہیں مسکراہٹ، کہیں اُداسی، کہیں جذبات سے عاری، کہیں گہری سوچ، کہیں جھریوں کے جال کہیں پھول سے تازہ رخسار۔۔۔ کوئی اونگھ رہا تھا کوئی نیند میں ڈوبا ہوا بے خبر تھا۔ کوئی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا کوئی لیپ ٹاپ (Lap Top) کے ساتھ مگن تھا۔ کوئی خالی خالی آنکھوں سے بے مقصد ادھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ کوئی نوعمر جوڑا رومانس میں مصروف تھا۔۔۔ وہ سوچ رہی تھی زندگی اسی تضاد کا نام ہے۔ طیارے کے اندر آباد اس چھوٹی سی دنیا کو وہ دیکھ رہی تھی۔ سب ایک دوسرے سے کس قدر قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن ایک دوسرے سے کتنے دور تھے۔ کتنے لاتعلق۔۔۔ وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر خیالات کے ٹوٹے ہوئے ہار کے بکھرے ہوئے موتیوں کو پھر سے سمیٹنے لگی تھی۔ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ طیارے کے قدموں تلے جو بادلوں کی نرم سفید قالین بچھی تھی وہ رفتہ رفتہ گہری سیاہی بن گئی تھی۔

پروین کے شریک حیات وارث اور بیٹے فراز کی آنکھیں نیند کی دنیا میں ڈوبی ہوئی تھیں۔۔۔ وہ فراز کی طرف دیکھ کر خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب ماں محسوس کر رہی تھی۔ مغربی ممالک میں بسے ہوئے مشرقی لوگوں کا یہ المیہ ہے کہ ان کے بچے والدین کے ساتھ سیاحت کے لیے نہیں جاتے۔ زیادہ تر یہی

صورت حال ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ Back Pack لے کر دنیا کی سیر کرتے ہیں۔ وہ فخر کے ساتھ فراز کے خوابیدہ چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی جس پر فرشتوں کی سی معصومیت چھائی ہوئی تھی۔ اُسے روحانی خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ اُس کے بچے کا ذہن عام بچوں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ بھی سیاحت کا متلاشی ہے لیکن صرف تفریح کے لیے نہیں بلکہ تعلیم کے لیے۔ مختلف ممالک کے چہروں پر غازے کا ملمع دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ غازوں کے اندر چھپی ہوئی جلد دیکھنے کے لیے۔۔۔ دنیا میں دبی کچلی ہوئی زندگیاں اس کو بھی اذیت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔۔۔ اُس کی نظریں فراز کی کشادہ پیشانی چوم رہی تھیں۔۔۔ یکا یک طیارے کے ہچکولے نے اُسے ان خیالات کے سمندر سے نکال لیا تھا۔ باہر سیاہی کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔ طیارے کا پرندہ اڑتا جا رہا تھا۔ اس کے پھیلے ہوئے پروں پر سرخ روشنی کی آنکھیں کھل رہی تھیں، بند ہو رہی تھیں سلسلے وار۔ سیاہی کی آغوش میں اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھیں اور وہ جوہانس برگ کی طرف محوِ پرواز تھا۔ اس کی بانہوں میں سمٹے ہوئے مسافر محوِ خواب تھے۔ خاموشی کی جھیل میں کبھی کبھی ایک بچے کے رونے کی آواز کی کنکری لہریں پیدا کر رہی تھیں۔ پروین کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔۔۔ جب آنکھیں کھلیں تو منزل قریب تر تھی۔ طیارہ نیچے اُتر رہا تھا۔ زمین قریب آ رہی تھی۔ لکیروں پر رینگتی چیونٹیاں بڑی بڑی گاڑیاں بن رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی ڈبیاں عالی شان عمارتوں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ قطرے ندیوں میں بدل رہے تھے۔ زمین کا سینہ پھیلتا جا رہا تھا اور پروین کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ کیونکہ وہ اُس سرزمین پر قدم رکھنے والی تھی جہاں کی مٹی کے ذرے ذرے میں ماضی کی دکھ بھری کہانیاں ہیں۔ وہ سرزمین۔۔۔ جسے کہا جاتا ہے کہ ایک ملک میں ایک دنیا آباد ہے جو مختلف رنگوں کا سنگم ہے۔

بوڑھا درد

اپنے آہنی پروں کو پھیلائے ہوئے۔۔۔ اپنے کشادہ سینے میں لوگوں کو سمیٹے ہوئے۔۔۔ طیارے نے زمین کو چھو لیا تھا۔ صبح کا سورج اپنی نرم سنہری کرنوں کی چادر جوہانس برگ پر پھیلائے ہوئے تھا۔ آج پروین کے قدم اُس سرزمین پر تھے جہاں کتنی ہی یادوں کی بازگشت تھی۔ کتابوں والا ملک تھا وہ۔ تصویروں اور ٹیلی ویژن کے اسکرین والا شہر تھا وہ۔۔۔ جواب جیتا جاگتا پروین کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ ہواؤں میں برسوں پرانی یادوں کی خوشبو تھی۔ برسوں پرانی آوازوں کی لہریں تیر رہی تھیں۔ جیسے پھول سے اُس کی خوشبو اُڑ کر بھی نہیں اُڑتی۔ بوڑھے درد کی انگلیاں ماضی کے چہرے سے نقاب ہٹا رہی تھیں۔ ذہن میں سوچ کے چراغ جگ مگا رہے تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں زندگانیاں زندہ ہوتے ہوئے بھی زندہ نہیں تھیں برسوں پہلے۔ جنہیں جبر کے نوکیلے پنجوں نے دبوچ رکھا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اس کے دل کی آنکھیں اُس وقت چھلک آئی تھیں جب ایک دل خراش سچ کہانی کی طرح سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ جب پہلی بار یہ علم ہوا تھا کہ رنگ و نسل کی بنیاد پر انسان کو انسان سمجھا گیا تھا۔ اُس کا دل اس وقت دکھا تھا جب اس نے ناولسٹ Alex Haley کے ناول روٹس (Roots) کا مطالعہ کیا تھا اور اس کی T.V. Series دیکھی تھی۔ تقریباً بیس سال قبل۔ اس ناول میں ایلکس ہیلی نے اپنے آباواجداد کے متعلق سات پشتوں کی روداد قلم بند کی تھی۔ جو کونٹا کینٹے نامی شخص سے شروع ہوتی ہے۔ جو ۱۷۵۰ء میں مغربی افریقہ میں پیدا ہوا تھا۔ Gambia شہر میں۔ ایک مسلمان خاندان میں۔ وہ پندرہ سال کا تھا جب روزی کی تلاش میں اپنے گاؤں سے باہر چلا گیا تھا۔ اور تب غلاموں کی تجارت کرنے والے سفید فام لوگوں نے اس کو اسی طرح شکار کیا تھا جس طرح جانوروں پر جال پھینک کر کیا جاتا ہے۔ جال میں پھنسا کر پکڑ لیا جاتا ہے۔ پروین کے دل میں درد کی کونپل اسی وقت پھوٹی تھی جب کونٹا کینٹے کو ان سفید فام تاجروں نے ترازو پر وزن کر کے غلام بنایا اور فروخت کر دیا تھا۔ وہ صرف ایک غلام تھا انسان نہیں۔ اس کی پہچان اس سے چھین لی گئی تھی۔ وہ اپنا مذہب، اسلام، بدلنا نہیں چاہتا تھا لیکن مجبور تھا۔ وہ اپنا نام ''کونٹا کینٹے'' بدلنا نہیں چاہتا تھا لیکن بے بس تھا کیونکہ غلاموں کے نام اور مذہب سب بدل دیے جاتے تھے۔ اس کا نام بدل کر ٹوبی (Toby) رکھا گیا تھا۔ اُس نے احتجاج کیا تھا تو اسے زنجیروں سے جکڑ کر کوڑے برسائے گئے تھے۔ اُس وقت تک جب تک وہ پندرہ سال کا بچہ لہولہان اور نڈھال ہو کر کونٹا کینٹے سے ٹوبی بننے کو راضی ہو گیا تھا۔ وہ ہر رات تنہائی میں اپنی آزاد زندگی یاد کیا کرتا تھا۔ اپنے بدن پر کوڑوں کے نشانات دیکھتا تھا اور جسم کی جگہ روح کی چوٹ سے کراہتا تھا۔ یہ دکھ بھری سچی داستان ایلکس ہیلی نے دنیا کو سنائی جو خود ۱۹۲۱ء میں نیویارک میں پیدا ہوا تھا اور ۱۹۹۲ء میں دنیا چھوڑ گیا تھا۔ ناول Roots پڑھنے کے بعد پہاڑ جیسے پروین کے ذاتی مسئلے ایک ذرے میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اور پھر۔۔۔ جب Apartheid کا خوف ناک چہرہ سامنے آیا تھا تو یہ ذرہ بھی معدوم ہو گیا تھا۔ اپنا آپ گم ہو گیا تھا۔ طاقت کا گھناؤنا استعمال اور کمزوروں کا کچل دیا جانا۔۔۔ یہ سب کچھ پڑھ کر، سن کر۔۔۔ وہ پگھل کر مظلوم کے آنسوؤں میں بہنے لگی تھی۔ وہ ہر پسی ہوئی روح میں سانس لینے لگی تھی اور تب اُس کا دل اُس سرزمین کو دیکھنے کو بے چین ہو گیا تھا جہاں یہ تشدد قانوناً رائج تھا۔ جہاں Apartheid کا زہر پھیل چکا تھا۔ وہاں جانا چاہتی تھی جہاں کے درختوں، ندیوں، پہاڑوں، آبشاروں اور ہواؤں نے اُس درد کو محسوس کیا تھا اور دیکھا تھا۔ وہ انہیں چھو کر محسوس کرنا چاہتی تھی وہی درد۔ ہواؤں پر لکھی ہوئی کہانیاں پڑھنا چاہتی تھی۔ درختوں کی سرسراہٹ میں نہاں داستان سننا چاہتی تھی۔ ندی کی لہروں میں گھلے ہوئے درد کے رنگ دیکھنا چاہتی تھی۔

کیفین

اور آج۔۔۔ وہ اسی سرزمین پر کھڑی ہوئی تھی۔۔۔ جوہانس برگ کے ہوائی اڈے پر۔ خیالوں میں گم۔۔۔ تجسس اور حیرانی میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اچانک ایک منحنی سا آدمی ایک جھنڈی جس پر شیر فیملی درج تھا لہراتا نظر آیا تھا۔

فراز اس کی طرف بڑھا تھا اور اس شخص نے خوش آمدید کہہ کر اپنا تعارف کروایا تھا۔ وہ نرم گفتار، خوش مزاج شخص (Canon) کینن تھا۔ پروین کے گروپ کے سیاحوں کا رہبر (Guide)۔ سیدھا سادہ، نیک اور نرم دل۔ اُسے دیکھ کر یہ احساس جاگ اٹھا تھا کہ وہ کتنی غلط تھی دوسروں کی طرح۔ نیویارک یا شکاگو میں کالے لوگوں کا خوف دل و دماغ پر مسلط رہتا ہے۔ لوگ اس علاقے میں بھی نہیں جاتے جہاں ان کی اکثریت ہوتی ہے۔ لیکن اب اُسے اس خوف پر ہنسی آ رہی تھی۔ کینن کی شخصیت اور ارد گرد کالوں کا جمِ غفیر۔۔۔ ان کے چہرے زور زور سے بتا رہے تھے کہ انسان بنیادی طور پر یکساں ہیں۔ کوئی پیدائشی مجرم نہیں ہوتا، قاتل نہیں ہوتا بلکہ حالات کا شکار ہوتا ہے۔ کینن کے ساتھ اُس کے گروپ کے گیارہ سیاح وین میں بیٹھ گئے تھے۔

وین جوہانس برگ کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی Protea Hotel Wanderers کی طرف۔ کینن اپنے ہاتھوں میں مائک پکڑ کر اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا جس کی آواز وین میں گونج رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔۔۔ ''جوہانس برگ میں ساؤتھ افریقہ کا سب سے پرانا اسکول ہے جو ۱۸۹۵ء میں تعمیر ہوا تھا۔ نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela) کے دونوں مکانات یہیں ہیں۔ ایک گھر میں ابھی وہ رہ رہا ہے اور ان دنوں سخت علیل ہے۔'' وین میں بیٹھے سیاح کینن سے سوالات کر رہے تھے اور وہ جوابات دیتا جا رہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا۔۔۔ ''یہاں اپارٹمنٹ کا کرایہ ایک ہزار ڈالر ماہانہ سے شروع ہوتا ہے۔ جوہانس برگ میں سونے کی کان کا پتہ جارج واکر اور جارج ہریسن نامی دو لوگوں نے لگایا تھا۔ ساؤتھ افریقہ قدرتی وسائل کی وجہ سے دولت مند ہو گیا تھا۔ کیونکہ یہاں سونے اور ہیرے کے ذخائر تھے۔ جوہانس برگ میں گوروں کی آبادی دس فیصد ہے۔ یہاں موسمِ سرما جولائی سے شروع ہو جاتا ہے۔'' کینن بولتا جا رہا تھا۔۔۔ وہ وین کی کھڑکی سے مکئی کے کھیت کے خوبصورت رنگوں سے سرور حاصل کر رہی تھی اور کینن کی آواز سے علم کے موتی چن رہی تھی۔ وین کا ڈرائیور جس کا نام یوپا (Yopa) تھا خاموشی سے وین چلا رہا تھا۔ سارے راستے کینن بولتا رہا تھا۔

تلخیاں

وین کی کھڑکی سے پروین باہر دیکھ رہی تھی۔

سوئیٹو کی سڑکوں پر صبح کی نرم دھوپ اپنے سنہرے پروں کو پھیلائے ہوئے بیٹھی تھی۔ سڑک کے کنارے رنگ ہی رنگ تھے۔ چھوٹے چھوٹے اسٹال میں فنکاروں کے فن چمک رہے تھے۔ مجسمے اور کرافٹ۔ مصوری اور رنگین پوشاک۔ فٹ پاتھ پر بھی چادریں بچھی ہوئی تھیں جن پر طرح طرح کی اشیاء برائے فروخت تھیں۔ سیاحوں کا جمِ غفیر تھا۔ ان کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ سب مول تول کر رہے تھے۔ وہ اس دوکان دار عورت کی بے بسی دیکھ رہی تھی جسے اپنی بقا کے لیے قیمت کم کرنا ہی تھا۔

وین سوئیٹو کی سڑکوں پر رواں تھی۔ یوپا کے ہاتھوں میں اسٹیرنگ وہیل تھی۔ اور کینن کے ہاتھوں میں مائک۔ کینن ایک ٹیپ ریکارڈر کی طرح وقت پر آن ہو جاتا تھا۔ سورج کی طرح وہ ہر صبح وین میں بسی ہوئی چھوٹی سی دنیا کو علم کی روشنی بانٹتا تھا۔ بغیر کسی تھکن کے بس بولتا رہتا تھا۔ وین میں بیٹھے ہوئے گیارہ سیاح اپنی اپنی دنیاؤں میں مگن تھے۔ کوئی کیمرہ سنبھالے ہوئے نظاروں کو قید کر رہا تھا کوئی گپ شپ میں مصروف تھا۔ پچھلی سیٹ پر ایک عمر رسیدہ، فربہ اور چڑچڑا امریکن خراٹے لے رہا تھا۔ اس کی ٹی شرٹ پر لکھا تھا Old Grouchy Man۔۔۔ جو بالکل صحیح تھا۔۔۔ کیونکہ کینن کے ساتھ اس شخص کی بدسلوکی پروین کو یاد تھی۔ اس سفید امریکی کے تعصب سے بھرپور لہجے میں ایک سیاہ بے قصور افریقی (کینن) پر گرجنا یاد تھا کیونکہ اُس شخص کی پسند کے مطابق کینن وین حاصل نہ کر سکا تھا۔ اُس کی نظروں میں کینن کے لیے حقارت تھی۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور غم و غصے میں ڈوب رہی تھی۔ وہ بوڑھا امریکن پروین کے گروپ سیاحوں میں سے ایک تھا لیکن اس کے اُس رویّے نے اس سے باتیں کرنے سے بھی پروین کو دور رکھا تھا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے اُس شخص کی طرف دیکھا تھا پھر کھڑکی سے باہر آسمان کے نیلے سمندر پر تیرتی بادلوں کی چھوٹی بڑی کشتیوں کو، جھومتے شجر کی ہریالی کو اور دور کہیں کہیں تنہا چھوٹے چھوٹے گول جھونپڑوں کو دیکھ کر تلخیوں سے نجات حاصل کر رہی تھی۔

وہ گلیاں (سوئیٹو Soweto)

یوپا نے وین سوئیٹو کے ایک مفلوک الحال علاقے میں روک دی تھی۔ سب سیاح باہر نکل کر کینن کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ گرد و غبار میں ڈوبی ہوئی کچی سڑکیں، تنگ گلیاں۔۔۔ بدرنگ چھوٹے چھوٹے گھر۔۔۔ کہیں کہیں گڈھوں میں ساکت پانی۔ ننگے پاؤں بوسیدہ کپڑوں میں کھیلتے ہوئے بچے۔ گھر کے دروازوں پر بیٹھے ہوئے چائے پیتے ہوئے لوگ گپوں میں مصروف جنہیں زندگی کی دوڑ سے کوئی مطلب نہ تھا۔ مکانوں کے سامنے تاروں کے زنگ آلودہ فینس اور ہر گھر پر ٹین کی چھت جس سے پانی ٹپکتا رہتا ہے۔ کہیں چھوٹی چھوٹی دوکانیں اور اسٹال ہیں جہاں کھانے پینے کی اشیا نظر آ رہی تھیں۔ یہ علاقہ جوہانس برگ سے بیس میل دور ہے۔ اپارٹ ہائیڈ کے دوران کالوں کو اسی جگہ بھیج دیا گیا تھا۔ South Western Township یعنی Soweto۔ کینن سیاحوں کو ٹاؤن شپ ٹور کے لیے لایا تھا۔ وہاں کے ماحول، کچے راستے اور گلیوں سے اُڑتی ہوئی گرد کے ذرّے کہہ رہے تھے کہ کس طرح وہ ملک درد کا گہوارہ بنا تھا۔ ہواؤں کی لہروں پر ماضی کی کراہیں تیر رہی تھیں۔ گلی کی دھول پروین کے قدموں سے لپٹ رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ زندگی کی کتنی تہیں ہیں۔ ایک کے بعد ایک کھلتی جاتی ہیں۔ حیرتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ کہانیاں حقیقت بنتی جاتی ہیں۔ نیند سے جگاتی جاتی ہیں۔ سوئیٹو کی گلیوں نے اُس کو تھام کر یہ احساس جگایا تھا کہ سیاحت صرف جمالیاتی ذوق کی تسکین نہیں۔۔۔ کہ دری بدصورتی کی آگہی کا نام بھی ہے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں برسوں پہلے دیے گئے زخم

اب تک مندمل نہیں ہوئے تھے۔خراشیں سطحی طور پر خشک تو ہوگئی تھیں لیکن اندر زخم تازہ تھے۔۔۔اُس نے اپنے گروپ کے ہم سفر سیاحوں کی طرف دیکھا تھا قیمتی لباس کے خول کے اندر چھپے ہوئے جسم کی کھوکھلی روحوں کے رنگ چہروں پر عیاں تھے اُن کے۔۔۔

وہ آنکھیں

ٹاؤن شپ ٹور میں سیاحوں کے لیے وہاں رہنے والے ایک خاندان کے گھر کا ٹور بھی شامل تھا۔وہ ایک خستہ حال دو کمروں کا گھر تھا۔در و دیوار بدحال تھے۔اجڑے ہوئے رنگ تھے۔اُدھڑے ہوئے پلاسٹر کی پپڑیاں یوں لگ رہی تھیں جیسے خشک ہونٹوں پر پپڑیاں ہوں۔کمزور ستون پر ٹین کی چھت ٹکی ہوئی تھی۔ایک باتھ روم صحن میں تھا جسے ہمسائے بھی استعمال کرتے تھے۔ اس دو کمروں کے گھر میں نو افراد رہ رہے تھے اپنے ضعیف والدین کے ساتھ دو نوزائیدہ بچوں کے ساتھ۔ایک چھوٹے سے کمرے میں بیڈ اور ٹیبل کے درمیان چلنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔چھوٹی سی کھڑکی سے روشنی بھی سہمی ہوئی ذرا ذرا سی اندر آ رہی تھی۔اس خستہ حال مقام پر آنے سے کترا رہی تھی لیکن بے دلی سے رحم کھا کر اندر آ رہی تھی۔اُسے کینیڈا میں اپنا روشن،خوش حال کمرہ یاد آ گیا تھا۔اُسے اپنے آپ سے ایک انجانی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ایک کمرہ ضعیف باپ کا تھا۔نیم روشن۔چھوٹا سا پرانا بستر اور چھوٹا سا رنگ اُڑا ہوا میز تھا۔ایک عورت اندھیرے گوشے میں اپنے نوزائیدہ بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔دوسری طرف کونے میں ایک اسٹور تھا جس پر پرانی سی پچکی ہوئی پتیلی تھی جس میں کچھ پک رہا تھا۔دوسرے نیم تاریک کمرے کے ایک کونے میں بوسیدہ سی کرسی پر ایک نوعمر لڑکی بیٹھی ہوئی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔پتہ نہیں پڑھ بھی رہی تھی یا سیاحوں کو نظر انداز کرنا چاہتی تھی۔ شاید وہ کسی سے باتیں نہیں کرنا چاہتی تھی۔اُس لڑکی کے چہرے پر پروین نے بیزاری کے آثار دیکھ لیے تھے۔اُس کی آنکھوں میں خودداری کی پرچھائیاں بھی دیکھ لی تھیں۔اس کے نوعمر خون میں غم و غصہ کی لہریں بھی نظر آ رہی تھیں۔پروین کا دل اُس بیزار لڑکی سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔اس کی زندگی کی تفصیل جاننا چاہتا تھا۔وہ اُس لڑکی کے قریب چلی گئی تھی۔۔۔سوال کیا تھا۔۔۔''کیا تم بھی یہیں رہتی ہو؟'' اس نے بہت روکھا سا جواب دیا تھا ''یقیناً'' شاید اس نوجوان لڑکی کو جو صرف سولہ سال کی تھی اپنے وجود،اپنے خاندان اور اپنے گھر کو نمائش کا سامان بنائے جانے کا شدت سے احساس تھا جنہیں سیاح آ کر ہمیشہ Exploit کرتے تھے۔ان کی خستہ حالی ان کی بے بسی ایک تفریح بن گئی تھی جن کی تصویریں لی جاتی تھیں۔اس لڑکی کی ماں بہت با اخلاق تھی اور مسکرا کر اپنا گھر سیاحوں کو دکھا رہی تھی۔وہ بہت خوش تھی کیونکہ یہ دستور تھا کہ سیاح ہمیشہ اُس کی غربت کا نظارہ کر کے اسے اس کی اجرت دیتے تھے جس سے گھر میں سبھی کو کھانا نصیب ہوتا تھا۔سب سیاح اُس کے گھر کے معائنے میں اس طرح مصروف تھے جیسے کہ عجائب خانے میں ہوں۔لیکن پروین اُس لڑکی کے چہرے میں ڈوبی ہوئی تھی جو ایک سامان کی طرح کرسی پر رکھی ہوئی تھی۔سیاحوں کو نہ تو اس کے نام سے،نہ اس کے تشخص سے اور نہ ہی اس کے احساس سے کوئی دلچسپی تھی۔سب اس پر سرسری نظر ڈال کر دوسری طرف رخ کیے ہوئے تھے کوئی ایکسرے (Xray) والی آنکھ نہ تھی جو اس لڑکی کے اندر اُتھل پتھل کو دیکھ لے۔ اُس کے اندرونی جذبے جو کچھ حد تک چھلک کر اُس کی آنکھوں میں آ گئے تھے، اس کے چہرے سے عیاں تھے۔انہیں بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا اور نہ محسوس کیا تھا اس لڑکی کی آنکھوں میں بے بسی کی خاموش چیخ وہ سن رہی تھی اور خود بھی بے بسی محسوس کر رہی تھی کیونکہ وہ بھی ان سیاحوں میں ایک تھی۔وہ بھی تو ایک تماشائی تھی۔ان سبھی کی مانند جو سسکیوں کو نغمے کی طرح سن کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جیسے وہ کسی اور سیارے کی سیر کر رہے تھے۔یوں تصویریں لے رہے تھے جیسے وہ لڑکی کوئی خلائی مخلوق ہو اور پھر فخر کے ساتھ یہ تصویریں اپنے خوش حال ملک واپس جا کر Display جو کرنی تھیں۔پروین کے ذہن اور دل میں ایک گہری بے چینی تھی جہاں سے اس نظم کی چڑیا قرطاس کی شاخ پر بیٹھنے کے لیے اڑ کر باہر آنے کو بے چین تھی۔

احتجاج

چھوٹی سی اک ٹوٹی پھوٹی
کالی دنیا سسک رہی تھی
خستہ دیوار و در کے چہروں کے
سارے رنگ اُڑے ہوئے تھے
نیم اندھیرے گوشے میں
اُس کی سانسوں کے نازک ریشم
الجھے الجھے بکھر رہے تھے
*ارمانی پوشاک میں سمٹی
* گوچی چشموں کے پیچھے سے
سیاحوں کی ٹولی اُس کو
حیراں ہو کر دیکھ رہی تھی
جیسے ایک عجوبہ تھی وہ
تفریحات کا ذریعہ تھی وہ
اُس نوخیز کلی کی رخشاں
درد میں ڈوبی کالی آنکھیں
اپنی خودداری کے شعلوں
سے اس دل کو جھلساتی تھیں
چیخ چیخ کر یہ کہتی تھیں
''میں بھی تیرے ہی سیارے کی شہری ہوں''!

(*ارمانی اور گوچی یورپ کے مشہور اور گراں ڈیزائنرز ہیں)

''روحِ وجدان''

ڈاکٹر پنہاں (امریکہ)

دل کی تو جان بس محبت ہے
دین و ایمان بس محبت ہے

اک فسانہ ہے زندگی جاناں
اور عنوان بس محبت ہے

کیوں سکھاتی ہے نفرتیں دنیا
میرا انسان بس محبت ہے

وحشتوں کے ہرے بھرے جنگل
کشتِ ویران بس محبت ہے

نفرتیں گھر بنا رہی ہیں یہاں
مثلِ مہمان بس محبت ہے

شغلِ شیطان جنگ اور دہشت
وصفِ رحمان بس محبت ہے

عقل کا چاہے کوئی مذہب ہو
دل کا ایمان بس محبت ہے

زندگی اور کچھ نہیں ہمدم
مان مت مان بس محبت ہے

دل کی آنکھوں سے دیکھ لی دنیا
حدِ امکان بس محبت ہے

جو محبت کرے وہی ہوں میں
میری پہچان بس محبت ہے

بس یہی زادِ آخرت ہے مرا
ساز و سامان بس محبت ہے

روزِ محشر ہے زندگی اے دل
اور میزان بس محبت ہے

اب جہاں ہوں وہاں تو کچھ بھی نہیں
دل بھی حیران بس محبت ہے

زندگی کائنات اور خدا
کچھ نہیں جان بس محبت ہے

کشف و الہامِ ہست و بود یہی
روحِ وجدان بس محبت ہے

حاصلِ کائنات ہے انساں
شرطِ عرفان بس محبت ہے

دل کی ہے ترجماں غزل پنہاںؔ
نفسِ دیوان بس محبت ہے

○

سیفی سرونج (بھارت)

میں اس کو کھوج لیتا ہوں دنیا کی خاک سے
ملتا ہے مجھ سے دوستو جو بھی تپاک سے

اپنے پڑوس میں نہ محبت تلاش کر
جو بھی ملے گا تجھکو وہ ہمت سے دھاک سے

اب کے برس تو پھول بھی کوئی نہ کھل سکا
منظر تھے مرے شہر میں کچھ ہولناک سے

رہتی ہے یہ نظر مری عالم پہ آج کل
مجھکو نہیں ہے واسطہ کچھ ہند و پاک سے

قسمت بدل سکے گی نہ بستر پہ لیٹ کر
لکھتا ہے کیا سلیٹ پہ ہر دم تو چاک سے

○

پروفیسر زہیر کنجاہی

(راولپنڈی)

تیرے بغیر چاند ستاروں کو دیکھ کر
کیا کیا گماں ہوئے ہیں نظاروں کو دیکھ کر

مطرَب! سنا ہمیں بھی کوئی زمزمہ مگر
سازِ غمِ حیات کے تاروں کو دیکھ کر

ہم نے بھی زندگی کے چمن سے بہ احتیاط
اِک پھول چُن لیا ہے ہزاروں کو دیکھ کر

یہ آئینہ ہے کس کے رُخِ بے مثال کا
حیراں ہوں دلفریب بہاروں کو دیکھ کر

کس کو خبر تھی، ہوتے ہیں طوفاں بھی آس پاس
اہلِ سفینہ خوش تھے کناروں کو دیکھ کر

اَب کون اُنہیں بتائے تعاقُب میں ہے خزاں
کچھ لوگ مطمئن ہیں بہاروں کو دیکھ کر

کیا ہوگیا خلوص و محبت کو اے زہیؔر
ہنستے ہیں لوگ درد کے ماروں کو دیکھ کر

○

کرامت بخاری

(لاہور)

جلتے بُجھتے سماں کے موسم میں
ہم ہیں وہم وگماں کے موسم میں

زندگی یوں بکھرتی جاتی ہے
جیسے پتے خزاں کے موسم میں

سمت کا خوف ہے سفینے کو
آج کے بادباں کے موسم میں

خواہشوں کی نمو نہیں اُگتی
جسم کے خاکداں کے موسم میں

سچ کی تاریخ لکھی جاتی ہے
صرف تیرو پنہاں کے موسم میں

موم سا جسم لے کے مت جاؤ
دھوپ کے سائباں کے موسم میں

یہ طبیعت ہمیشہ رکھے گی
ہم کو آہ و فغاں کے موسم میں

تم جہاں ہو وہاں پہ لے جاؤ
مر نہ جائیں یہاں کے موسم میں

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

(موجودہ سیاسی حالات کے تناظر میں)

قومی فلاح کی کوئی تو اب راہ پایئے
کشتی بھنور سے کھینچ کے ساحل پہ لایئے

ہر بار اپنی بات پہ اِصرار نہ کریں
جو کہہ رہے ہیں سُن کے اُسے مان جایئے

ممنون ہو کے خواہ مخواہ محجوب ہو رہیں
اِتنا بھی نہ کسی کا یوں احساں اٹھایئے

دُوجے کی بات سُننے کا ہر دم ہو حوصلہ
سُن تو لیا ہے اب انہیں اپنی سنایئے

دستور کی شہراہ کو کیوں مسدود کرتے ہیں
خلقِ خدا کو داؤ پہ یُوں نہ لگایئے

پرچم جو سربُلند ہے ہم سب ہیں باوقار
آزادی کے اس تحفے کی قیمت چُکایئے

ارضِ وطن کی خیر کو دستِ دعا دراز
سب مل کے صرف قومی ترانہ کی گایئے!

○

پرویز مظفر
(برمنگھم)

پہلے گردن مروڑ دی صاحب — پھر مقدّر پہ چھوڑ دی صاحب
جانے اب کس کے ہاتھ آئے پتنگ — آپ نے ڈور توڑ دی صاحب
خون جتنا بھی ہے سو حاضر ہے — ہم نے شہ رگ نچوڑ دی صاحب
بات ہم دونوں میں نباہ کی تھی — کیوں سیاست سے جوڑ دی صاحب
چھین کر ناخداؤں سے کشتی — باڑھ میں ہم نے چھوڑ دی صاحب

○

عارف شفیق
(کراچی)

اک پل بھی جو اداس تجھے دیکھتا ہوں میں — یہ چاند یہ چراغ بجھے دیکھتا ہوں میں
پاتال میں چھپوں یا اڑوں آسمان میں — وہ دیکھتا ہے مجھ کو اُسے دیکھتا ہوں میں
بوئے تھے جس زمیں پہ مرے آنسوؤں نے خواب — ہر سُو وہاں گلاب کِھلے دیکھتا ہوں میں
آنکھوں میں جاگ اٹھے ہیں تنہا شجر کے دکھ — گلدان میں جو پھول سجے دیکھتا ہوں میں
کھو کر وہ مجھ کو خوش ہے میں کیسے یقیں کروں — اسکی ہنسی میں درد چُھپے دیکھتا ہوں میں
اک دشت میرے پاؤں کے چھالوں میں قید ہے — اپنے جنوں کو دور کھڑے دیکھتا ہوں میں
چاہے تو دنیا وہ مرے شعروں میں دیکھ لے — جو کچھ بھی آسماں سے پرے دیکھتا ہوں میں
عارف میں ہوں پرانے زمانے کا آدمی — چھپ چھپ کے مگر خواب نئے دیکھتا ہوں میں

○

ابراہیم عدیل
(جھنگ)

بہت غلط ہے روش اجتناب کرنے دے — حقیقتوں کو کبھی بے نقاب کرنے دے
ہرے درخت کہیں دھوپ سے سُلگ نہ اُٹھیں — اب ایسی رُت میں دعائے سحاب کرنے دے
اے میری ماں تو مجھے چومنے دے اپنے قدم — مرے لبوں کو بھی حاصل ثواب کرنے دے
یہ کام ایسا تو مشکل نہیں ہے تیرے لیے — بس ایک روز ملاقاتِ خواب کرنے دے
روش روش پہ لہو کی یہ شورشیں کیوں ہیں — مجھے بھی کاشت کہیں پہ گلاب کرنے دے
یزید شمر کا انجام جانتے ہیں سبھی — رقم اُسے بھی ستم کا یہ باب کرنے دے
ہے میرے سامنے شہر تجلیات عدیلؔ — مجھے بھی روشنی سے اکتساب کرنے دے

○

مظہر بخاری
(میاں چنوں)

یوں کہانی سے مت نکال مجھے — تیرا کردار ہوں سنبھال مجھے
دشت، لیلیٰ ہے میری ناقہ سوار — عشق کا ہے قیس کی مثال مجھے
رقص کرنے لگا چہار اطراف — دیکھ کر کوئی مست حال مجھے
دور سے آئینہ دکھاتا ہے — سونپ کر اپنے خدّ وخال مجھے
ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں میں — گنتے رہتے ہیں ماہ و سال مجھے
میں ترا عکس ہوں ترا مظہرؔ — رنگ دے خود میں اور اجال مجھے

○

غلام خواجہ معین الدین گوہر
(کریم نگر، بھارت)

بہکے کو، بہکائے گئے کو، دیکھو پاگل خانے میں — تم ہی کہو گے فرق بہت ہے دیوانے میں
ٹوٹے سارے رشتے ناطے ایک تیرا کہلانے میں — تو بھی میرا ساتھ نبھانا جینے میں مر جانے میں
لفظ عداوت کبھی نہ لانا یارانے یارانے میں — ورنہ ہمیں بھی کم مت جانو بات اپنی منوانے میں
ہونٹوں سے موتی برساؤ پھول جھڑاؤ باتوں کے — ورنہ تشنگی لے ڈوبے گی شرمانے شرمانے میں
میں نے توڑے راہِ عشق میں حائل سارے بُت خانے — تا کہ تکلّف آپ نہ برتیں مجھ تک آنے جانے میں
طاقت سے کہ زباں سے روکو دل سے مانو بُرائی ہے — مانا کہ کچھ وقت لگے گا کفنانے دفنانے میں
بڑے جتن سے باندھ باندھ کر رکھتا ہوں اس کو پھر بھی — جانے کہاں دِل لٹ جاتا ہے انجانے انجانے میں
اچھّے بُرے کو دیکھ رہا ہے ہر حالت میں جب مولا — دیر کہاں لگتی ہے گوہرؔ عزت آنے جانے میں

○

نوید سروش
(میر پور خاص)

رستے میں پاؤں کے جب چھالے پکارتے ہیں — منزل سے روشنی کے بالے پکارتے ہیں
بازار تو ہے لیکن ، ہیں بند سب دُکانیں — سنسان رہ گزر ہے، تالے پکارتے ہیں
مانا کہ منتظر اب کوئی نہیں ہے ، لیکن — مجھ کو پرانے گھر کے جالے پکارتے ہیں
سنتا ہے سسکیوں کی آہوں کی ، دل صدائیں — شاید مجھے کسی کے نالے پکارتے ہیں
کشتی جلا چکا ہوں، پھر کیوں سروشؔ مجھ کو — دریا کے پار بستی والے پکارتے ہیں

○

وشال کھلر

(لدھیانہ، بھارت)

کبھی خود سے بھی دل لگاؤں میں — تو جو آئے تو مسکراؤں میں
تجھ سے ایسے بھی ہوں مراسم، کاش! — تو جو روٹھے، تجھے مناؤں میں
تیری آواز جب سنائی دے — گیت خوشبو کے گنگناؤں میں
تیرے چہرے میں چاند رہتا ہے — کیسی صورت تجھے بتاؤں میں
میں ہی ہاروں گا جیتی بازی بھی — کب یہ ممکن تجھے ہراؤں میں
''جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود'' — پھر تجھی میں نہ کیوں سماؤں میں

○

تصور اقبال

(اٹک)

اب ہماری زندگی میں اور کیا باقی بچا — اک تری یادیں بچی ہیں اک دیا باقی بچا
پوچھتے ہیں لوگ مجھ سے گھر میں کیا باقی بچا — جس میں تیرا عکس تھا وہ آئینہ باقی بچا
مٹ گیا وہ نام جو میں نے لکھا تھا ریت پر — خون سے جو دل کے کاغذ پر لکھا باقی بچا
چاند کو روتے ہوئے دیکھا گیا میں ہوں گواہ — جب سحر کو شہر میں اک دُھندلکا باقی بچا
ایک اک کر کے جو طائر اُڑ گئے سارے تو پھر — اُس شجر پہ اب فقط اک گھونسلا باقی بچا
سچ کو جو پودا لگایا تھا ہرا ہے آج بھی — سارے گاؤں میں شجر وہ اک ہرا باقی بچا

○

غلام شبیر اسد

(جھنگ)

کِسے تھی آرزو کب زندگی کی — بہت پہلے مرے تب زندگی کی
ہمیں جینے کی فرصت ہی کہاں تھی — دِلوں کی موج پر سب زندگی کی
خراباتِ جہاں کی حیرتوں میں — کوئی تھا دم بہ خود جب زندگی کی
کِرن جس کے لیے بارِ گراں تھی — اسے حائل ہوئی شب زندگی کی
نیا عنوانِ ہستی ہے اسدؔ جی — رضائے غیر پہ اب زندگی کی

○

گرداب

(زیرِقلم ناول کا ایک باب)

شموئل احمد

(بھارت)

سرِ شام افق پر اگے تنہا ستارے کی بھی اپنی ایک اداسی ہوتی ہے.....!

اس کی آنکھوں میں بھی اداسی کا کچھ ایسا ہی رنگ تھا اور اگر دھند کا کوئی چہرہ ہوتا ہے تو اس کا چہرہ بھی.....

وہ خوب صورت نہیں تھی. خد و خال بھی تیکھے نہیں تھے. پھر بھی ہونٹوں کے خم دلگیر تھے اور آنکھوں میں تنہا ستارے کی جھلملاتی اداسی تھی. بالائی ہونٹوں کا مرکزی حصّہ دبیز تھا جو کنارے کی طرف اچانک باریک ہو گیا تھا اور نچلا اندر کی طرف اک زرا دھنسا ہوا....وہ خاموش رہتی تو لگتا صدیوں سے لب وا نہیں ہوئے اور باتیں کرتی تو جیسے تتلیاں پکڑتی تھی. اس کے دانت ہم سطح اور سفید تھے. آگے کے دو دانتوں کے درمیان ہلکا سا شگاف تھا. یہ راہو کا اثر تھا. مجھ میں یہی خرابی ہے. میں آدمی میں فوراً اس کے ستارے ڈھونڈنے لگتا ہوں. ایک نقص اور ہے. جب کوئی قصّہ بیان کرتا ہوں تو واقعات کا تسلسل ہاتھ سے پھسل جاتا ہے. مجھے چاہیئے تھا کہ پہلے ساجی کی بابت بتاتا کہ کون تھی اور یہ کہ اس سے تعلّقات کی نوعیت کیا تھی؟

اصل میں میرا تبادلہ ہمیشہ چھوٹے شہر میں ہوتا ہے جہاں ڈھنگ کے اسکول نہیں ہوتے. لیکن سیفی اور کیفی کا پٹنہ کے اچھے اسکول میں داخلہ ہو گیا ہے. نصیب بچّوں کو لے کر پٹنہ میں رہتی ہے اور میں آن جان کرتا رہتا ہوں. اکثر چھٹّیوں میں سب میرے پاس چلے آتے ہیں.

میری پوسٹنگ ان دنوں لال گنج میں تھی. کچھ دن آفس کے کمرے میں گذارہ کیا. پھر معلوم ہوا کہ چوک کے قریب ایک فلیٹ خالی ہے تو میں دیکھنے چلا آیا.

فلیٹ مجھے پسند آیا. دو کمروں کا فلیٹ تھا. ایک چھوٹی سی بالکنی بھی تھی جو میدان کی طرف کھلتی تھی. میدان کے آخری سرے پر برگد کا ایک پیڑ تھا. مجھے حیرت ہوئی. گھنی آبادی والے شہر میں عموماً ایسے پیڑ نظر نہیں آتے. پیڑ گھنا تھا اور اس کی لٹیں نیچے تک جھول رہی تھیں. تنے پر سیندور کے گھنے نشانات تھے جو بالکنی سے صاف نظر آ رہے تھے. تنے سے لگ کر کچھ مہابیری جھنڈے رکھے ہوئے تھے. پیڑ کی پوجا ہوتی تھی. یہی وجہ تھی کہ تیزی سے بڑھتے ہوئے اس شہر میں پیڑ ابھی بھی سلامت تھا.

بالکنی مجھے اچھی لگی. وہسکی پینے کے لیئے یہ جگہ مناسب تھی. مکان مالک نے کرایہ پانچ ہزار بتایا تھا. کرایہ معقول تھا اور میرے بجٹ سے زیادہ نہیں تھا لیکن ایک جو فطرت ہوتی ہے مول تول کی.....تو میں نے فوراً اپنی رائے ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ وہ کرایہ کم نہیں کرتا. جس بالکنی کی وجہ سے فلیٹ مجھے پسند آیا تھا میں نے اسی پر اعتراض کیا۔

''بالکنی چھوٹی ہے.''

''آپ اسے چھوٹی کہہ رہے ہیں؟''

''بالکل.''

''دس فٹ لمبی بالکنی چھوٹی نہیں ہوتی.''

''چوڑائی میں کم ہے.'' میں نے شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا.

''اب آپ کو مکان نہیں پسند ہے تو اور بات ہے.'' مکان مالک جھنجھلا گیا. اس کی جھنجھلاہٹ پر مجھے لطف آیا.

''اس لحاظ سے کرایہ زیادہ ہے.''

''آپ سو روپے کم دیجیے گا.''

''چار ہزار.''

وہ چپ ہو گیا. مجھے لگا میں اس پر حاوی ہو رہا ہوں. مجھے امید بندھی کہ راضی ہو جائے گا.

''چار ہزار کم ہوتے ہیں''

''مناسب ہے. ٹو لیٹ کا بورڈ دیکھ کر یہاں آ گیا ورنہ دفتر کے قریب ہی کوئی مکان دیکھتا.''

''اب میں کیا کہوں؟'' اس کے لہجے میں احتجاج تھا. میں مسکرایا اور رقم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے خوش دلی سے بولا.

''پیشگی رکھ لیجیئے.....!'' ایک لمحے کے لیئے میں نے سوچا کہ چار ہزار میں راضی نہیں ہوا تو ساڑھے چار ہزار میں ہو جائے گا.

آدمی سادہ لوح تھا چار ہزار میں. راضی ہو گیا. میں جب اس کی طرف رقم بڑھا رہا تھا تو اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی دروازے کی اوٹ سے جھانک رہا ہے. میں نے ادھر نظر ڈالی. چہرہ فوراً چھپ گیا پھر بھی پیشانی کی چمکتی ہوئی بندیا صاف جھلک گئی.

وہاں سے نکل کر میں نے نصیب کو فون پر بتایا کہ مکان مل گیا ہے کرایہ چار ہزار ہے اور یہ کہ کل شفٹ کر جاوں گا. نصیب نے سب کی خیریت سے آگاہ کیا اور پوچھا کہ میں گھر کب آ رہا ہوں.؟ میں نے اگلے اتوار کی تاریخ بتائی.

دوسرے دن میں ساز و سامان کے ساتھ فلیٹ میں شفٹ کر گیا.

یہ تین منزلہ عمارت تھی جس میں تین فلیٹ تھے. ایک فلیٹ نچلی منزل پر تھا جس میں کوئی وکیل صاحب رہتے تھے. بیچ والی منزل پر میں آ گیا تھا اور مکان مالک اوپری منزل پر تھا. نیچے جو مشترکہ سیڑھی اوپر کی طرف گئی تھی وہ بیچ کی منزل پر ایک چورس سطح پر ختم ہو گئی تھی. میرے فلیٹ کے دونوں کمروں کے صدر دروازے اسی سطح پر کھلتے تھے. میرے بیڈ روم کا ایک دروازہ اندر سائبان میں کھلتا تھا جس کے

نصف حصّے میں مکان مالک کا کچن تھا. سائبان کا باقی حصّہ میرے تصرّف میں تھا. شائد مکان کی تعمیر ایک بار نہیں ہوئی تھی. میں جس حصّے میں رہتا تھا وہ غالباً پہلے بنا تھا. مکان مالک نے اسے سہولت کے مطابق وقتاً فوقتاً بنایا ہوگا. کچن سے ہوتی ہوئی ایک دوسری سیڑھی اوپر کی طرف گئی تھی جہاں بیڈروم تھے. اس کا بیڈروم میرے بیڈ روم کے عین اوپر واقع تھا. مکان مالک سیدھا سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوتا جس کا پتہ مجھے اس کے قدموں کی چاپ سے ہوتا تھا.

میرے کمرے میں سامنے کی دیوار پر ایک چھوٹا سا روشن دان تھا جس سے لگ کر سیڑھی اوپری منزل کی طرف گئی تھی. روشن دان میں سمنٹ کی جالی لگی ہوئی تھی جس میں پرانا اخبار چسپاں تھا. اخبار گرد آلود ہو گیا تھا اور اس میں جگہ جگہ سوراخ ہو گئے تھے. اور رنگ پیلا ہو گیا تھا. کمرے میں پنکھا چلتا تو اخبار کا کونہ پھڑ پھڑانے لگتا. کچن کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا کوئی اوپری منزل پر جاتا تو اس کا سر روشن دان کی جالیوں سے نظر آتا. میں جب بھی بستر پر ہوتا میری نظر ادھر اٹھ جاتی .....لگتا کوئی جھانک رہا ہے اور ایک دن سامنا بھی ہو گیا. میں سیڑھیاں پھلانگ رہا تھا اور وہ خراماں خراماں اتر رہی تھی. سیڑھی جہاں اندر کی طرف مڑی تھی میں وہاں اس سے اچانک ٹکرا گیا. میرے ہاتھ اس کے کولہے سے چھو گئے ....وہ ٹھٹھک گئی اور میں گھبرا گیا. دراصل میرا ہاتھ بہت غلط انداز سے اس کے کولہے سے مس ہوا تھا. یہ ٹکّر ایک دم غیر متوقع تھی.

''اوہ....ساری....!'' میں نادم تھا.

جواب میں اس نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا، آہستہ سے مسکرائی اور نیچے اتر گئی..میں اسی طرح سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اپنے کمرے میں آیا.

وہ کس طرح مسکرائی تھی....؟ میں نے گدگدی سی محسوس کی. میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ رینگ گئی..میں بستر پر لیٹ گیا اور اس خوشگوار ٹکّر کے بارے میں سوچنے لگا....دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ کوئی دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ رہا ہے. قدموں کی ہلکی سی چاپ مجھے صاف سنائی دی. مجھے لگا وہی ہوگی. میں نے چاہا اٹھ کر دیکھوں لیکن بستر پر ہی پڑا رہا.

وہی تھی. اس نے اچانک آخری سیڑھی پر چھلانگ لگا ئی اور ہنستی ہوئی کاری ڈور میں گھس گئی..میں مسکرائے بغیر نہیں رہا. اس کی ہنسی میں کھنک تھی. زہرہ والی عورتیں اسی طرح ہنستی ہیں. اس دن شام کو مجھے یہ دیکھنے کا موقع بھی مل گیا کہ ستارہ زہرہ اس کے زائچے میں کہاں واقع ہے.؟

وہ ستاروں کا حال جاننے آئی تھی. ساتھ میں درجات یعنی شوہر نامدار بھی تھا. اس کے ہاتھ میں جنم کنڈلی تھی. کنڈلی پولیتھین میں لپٹی ہوئی تھی. مجھے حیرت ہوئی کہ یہ بات انہیں کیسے معلوم ہوئی کہ میں نجومی بھی ہوں. درجات نے بتایا کہ یہ انکشاف میرے ہیڈ کلرک نے کیا تھا. میں نے کنڈلی پھیلائی. وہ برج سرطان میں پیدہ ہوئی تھی. زہرہ اور راہو ساتویں خانے میں تھے. زحل دوسرے خانے میں مشتری کے ساتھ بیٹھا تھا.

''آپ کھانا دیر سے ختم کرتی ہیں.؟'' میں نے پوچھا.

اس نے اثبات میں سر ہلایا.

''آپ کو آنولے کا مربّہ پسند ہے.؟''

اس کی آنکھوں میں حیرت کا رنگ گھل گیا.

''کنڈلی میں یہ بھی ہوتا ہے؟''

''پوری زندگی کی چھاپ ہوتی ہے.''

''آپ بہت پڑھتے ہیں؟''

''نہیں!''

''میں دیکھتی ہوں آپ ہر وقت پڑھتے رہتے ہیں.''

''آپ نے کیسے دیکھ لیا؟''

''دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے.''

''جھوٹ.''

''کیوں؟ جھوٹ کیوں...؟''

''آپ روشن دان سے دیکھتی ہیں.''

وہ جھینپ گئی. اس نے کنکھیوں سے درجات کی طرف دیکھا. وہ ہنسنے لگا. اس کی ہنسی بہت مدھم اور بہت عجیب تھی.....غٹ....غٹ....غٹ....غٹ....جیسے حلق میں کچھ انڈیل رہا ہو. اس کا دہانہ پھیل گیا تھا. بتیسی جھلک گئی تھی اور حلق سے غٹ غٹ کی آواز نکل رہی تھی. اس طرح ہنستے ہوئے وہ ہونّق معلوم ہوا.

''کچھ اور بتائیے.''

''کنڈلی مکمّل نہیں ہے.''

''گاؤں کے پنڈت نے بنائی ہے.''

''میں خود بناؤں گا اور آگے کا حال بتاؤں گا.'' میں نے پیچھا چھڑانے کے لیئے کہا.

اصل میں مجھے درجات سے الرجی محسوس ہو رہی تھی. مجھ میں یہ عیب ہے. میں اکثر کسی شخص سے خواہ مخواہ بھی الرجی محسوس کرنے لگتا ہوں. خاص کر ان سے جن کا آئی کیو کم ہے. درجات گرچہ آدمی سادہ لوح تھا لیکن آنکھیں عجیب مند مندسی تھیں. آنکھیں روح کی آئینہ دار ہوتی ہیں. درجات کی آنکھوں سے نہ روح کا اضطراب جھلکتا تھا نہ انبساط کی کوئی آتی جاتی سی لہران میں تھی. اس کی آنکھوں میں ایک مکروح قسم کی آسودگی تھی. تالاب میں ٹھہرے ہوئے پانی کا سکوت.....ایسا لگتا تھا کہ یہ شخص زندگی میں کبھی کسی کرب سے نہیں گذرا. اس کی ہنسی بھی جیسے کہرے میں لپٹی ہوئی تھی. جس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ کمرے میں بھی مشکل سے سنائی دیتی تھی. وہ اٹھ گئی. جاتے جاتے اس نے حسرت سے کتابوں کی شیلف کی طرف دیکھا.

جو آنکھیں خواب بنتی ہیں ان میں دھند ہوتی ہے. اس کی آنکھوں میں بھی دھند تھی. دھند سے پرے انتظار تھا. ایک تلاش تھی....آخر شیلف کی طرف اس طرح دیکھنے کا کیا مطلب تھا: اور پھر روشن دان سے مجھے گھورتے رہنا....؟

مجھے حیرت ہوئی کہ چالیس کی دہلیز سے گذرتی ہوئی عورت آخر کس مقام میں اپنے لیئے راحت ڈھونڈ رہی تھی.؟ روح میں اگر ایک بار سنّاٹا قائم ہو جائے تو کبھی نہیں بھرتا. اس کی روح میں یقیناً کوئی خلا تھا جس کی تکمیل میں وہ سرگرداں تھی. مجھے یقین تھا کہ اگر تنہائی میں ملاقات ہوئی تو راز افشا ہوگا. اور یہ موقع بھی جلد ہی مل گیا. اس بار وہ رینو کی کنڈلی دکھانے آئی تھی. درجات ساتھ نہیں تھا. لیکن سات سال کی رینو تھی. اس کی چار بیٹیاں تھیں بلکہ پانچ .... پانچویں کا پتہ مجھے بعد میں چلا. رینو سب سے چھوٹی تھی. اس کے ہاتھ میں رینو کی کنڈلی تھی. لیکن رینو کے بارے میں اس نے کچھ نہیں پوچھا. وہ صرف اپنے ہی بارے میں باتیں کر رہی تھی. میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک بہانے سے آئی ہے.

''میری کنڈلی بنی؟''

''نہیں۔''

کچھ بتائیے نا...!''

''کیا؟''

''کچھ بھی.''

''آپ کی زندگی کا باب ختم ہو گیا.''

''کیسے؟''

''شادی ہوگئی. گھر بس گیا. بچّے ہیں.''

''دوست....!''

''دوست....؟'' میں چونکے بغیر نہیں رہا.

وہ دور خلا میں تکنے لگی. اس کی آنکھوں میں اداسی کا رنگ گہرا گیا تھا.

اچانک وہ چہکی. ''وہ دیکھیئے.''

میں نے بالکنی سے باہر دیکھا. برگد کی اوپری شاخ پر ایک بگلا تنہا بیٹھا تھا. اس نے چونچ گردن میں چھپا رکھی تھی.

''کیسا لگ رہا ہے؟'' وہ اسی طرح چہک کر بولی.. اس کا چہرہ ایک معصوم خوشی سے دمک رہا تھا. یہ بات ایسی تھی جیسے کسی بچّے کو کوئی عجوبہ نظر آئے اور وہ خوشی سے تالیاں بجائے.

''جی چاہتا ہے چپکے چپکے جاؤں اور اور بگلے کے سفید پروں کو آہستہ سے چھوتی ہوئی گذر جاوں.''

میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا.

''برسات کے دنوں میں جب بادل گھر آتے ہیں تو یہاں سفید بگلوں کی قطار ہوتی ہے. میں گھنٹوں بیٹھی تکا کرتی ہوں.'' یہ بات اس نے بے ساختہ کہی تھی. اس کی بے ساختگی بہتے جھرنے کی طرح مترنّم تھی. مجھے حیرت ہوئی کہ پانچ بچّے جننے کے بعد بھی ایک عورت اس طرح معصوم ہو سکتی ہے. وہ اپنی داخلیت میں مری نہیں تھی. وہ محسوسات کی اسی سطح پر تھی جہاں پچیس سال قبل رہی ہوگی. میں نے اس منظر کو اس کے ساتھ شیئر کیا.

''واقعئی بہت پیارا لگ رہا ہے.''

''ہے نا....؟'' وہ اور خوش ہوگئی.

میں مسکرایا. منظر جیسا بھی تھا، اس کے احساسات کا پاس ضروری تھا.

وہ تنہا ان لمحوں کو جی رہی تھی. درجات نے ایسے احساسات کبھی شیئر نہیں کیئے ہونگے. اس کی امید بھی اس جیسے گاؤدی شخص سے نہیں کی جا سکتی تھی. ان لمحوں کو جینے کی آرزو اس کی سانگی میں تھی اور اس آرزو نے اس کی معصومیت کو برقرار رکھا تھا. مجھے چاہیئے تھا کہ اس کے قریب بیٹھ جاتا اور اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ سے دباتا اور دونوں ایک ٹک لگائے پرندے کو دیکھتے. مجھے یقین تھا وہ برا نہیں مانتی. لیکن میں نے خود پر قابو رکھا اور مجھے چاہیئے بھی تھا. پانچ بچّوں والی ماں سے رشتہ استوار کرنا مناسب نہیں تھا. میں خود شادی شدہ تھا دو بچّوں کا باپ....! نصیب پر کیا اثر ہوگا....؟ پرائی عورتوں کی بُو بہت جلد سونگھتی ہے. قیامت ڈھا دیگی... کہتی ہے ترین قبیلے کی ہے. میں نے ترین عورتوں کا غصّہ دیکھا ہے.

بالکنی سے اٹھ کر ہم کمرے میں آئے.

''آپ کیا پڑھتے ہیں؟'' اس نے پھر شیلف پر ایک نظر ڈالی.

''کچھ نہیں.''

''آپ کی دلچسپی کیا ہے؟''

''کچھ نہیں''

''میری دلچسپی آثار قدیمہ میں ہے.''

''میں آپ کو آثار قدیمہ نظر آتا ہوں؟'' میں شرارت سے مسکرایا.

نہیں تو....!'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی. اور دیر تک ہنستی رہی. یہاں تک کا اس کا آنچل ڈھلک گیا. مجھے محسوس ہوا کہ اس کی چھاتیاں ابھی بھی.....

''آپ تو رئیس ہیں.'' وہ آنچل سمبھالتی ہوئی بولی.''

''کیسے؟''

''آپ کو پڑھتے ہوئے دیکھتی ہوں ....بستر پر دراز.... ہاتھوں میں کتاب ....انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی....خدمت گذار پاؤں دباتے ہوئے...اچھا لگتا ہے آپ کا یہ روپ....!''

میں خاموش رہا اور وہ پھر کہیں کھو گئی. ایک ٹک فرش کو تکنے لگی. میں اسے غور سے دیکھنے لگا.

''آپ کہیں کھو گئیں.'' میں نے ٹوکا۔

اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور حسرت بھرے لہجے میں بولی کہ وہ چھٹی جماعت تک پڑھی ہوئی ہے. گاؤں کے اسکول میں پڑھتی تھی کہ شادی ہوگئی. اس نے پہلا تلخ تجربہ بیان کیا وہ یہ کہ اسے بتایا گیا تھا کہ سسرال میں لوگ بہت پڑھے لکھے ہیں. یہاں آئی تو معلوم ہوا کہ سبھی مُدل فیل ہیں. خود درجات نے کہا تھا کہ اس کے پاس کتابوں سے بھری الماری ہے لیکن ایک اخبار تک اس گھر میں نہیں آتا.

''شادی کے بعد پڑھتیں.''

''کیسے پڑھتی . یہاں ماحول نہیں تھا. اور میری عمر اس وقت محض پندرہ سال تھی،'' اس کا لہجہ اداس تھا اور مجھے لگا اس کی پلکیں بھی نمناک ہیں. میں نے غور سے دیکھا آنکھ کے گوشے میں پلکوں پر آنسو کا ننھا سا قطرہ لرز رہا تھا. مجھ میں ہلچل سی ہوئی. میرے جی میں آیا اس کی بھیگی پلکوں پر اپنے ہونٹ رکھ دوں. اصل میں میری ایک کمزوری ہے. عورت کے آنسو مجھے برانگیختہ کرتے ہیں .....خصوصاً سسکی لیتی ہوئی عورت.....اس کے سکڑتے اور پھیلتے ہونٹ.....! شائد یہ میری سادیت پسندی ہے. مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میرے لیئے اس عورت کو چھونا آسان ہے. ہر عورت اپنے لاشعور کے نہاں خانوں میں ایک مثالی مرد کی تصویر سجائے رکھتی ہے. وہ اس شخص سے قربت محسوس کرتی ہے جس میں مثالی شبیہ نظر آتی ہے. ظاہر ہے درجات میں یہ خوبیاں برائے نام بھی نہیں تھیں اور مجھ میں.....؟ میرے پاس کتابوں سے بھری شیلف تھی. میں اس کی نظر میں ہیرو تھا. .....اعلیٰ درجے کا رئیس .....ایک ہاتھ میں کتاب ...انگلیوں میں سگریٹ .....خدمت گذار پاؤں دباتے ہوئے اور جالیوں سے تکتی ہوئی وہ.....!

جس لہجے میں اس نے یہ منظر بیان کیا تھا وہ معنی رکھتا ہے. اس میں حسرت تھی.....اس منظر نامے کا حصّہ بن جانے کی حسرت جو اس کی زندگی میں سراب کی طرح ابھرا تھا اور یہی وہ مقام تھا جہاں میں اس کی مثالی شبیہ میں بہت حد تک موجود تھا.

میں نے اس کی دلجوئی کی: ''آپ ابھی بھی پڑھ سکتی ہیں.''

''کیسے؟''

''پرائیویٹ سے امتحان دیجیئے.....میں پڑھا دوں گا.''

جواب میں ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی. کچھ بولی نہیں تھوڑی دیر بیٹھی پھر جاتے جاتے تاکید کر گئی کہ میں اس کی کنڈلی ضرور بنا دوں.

نصیب کے کچھ اپنے الفاظ بھی ہیں...''اوٹکرلیس'' ''انترا'' اور ''سین کی دھوپ''.

اگلی اتوار کو جب میں گھر پہنچا تو نصیب سین کی دھوپ میں گرم کپڑے سکھا رہی تھی. پہلے یہ بات میری سمجھ سے پرے تھی کہ نصیب ستمبر کی دھوپ کو سین کی دھوپ کیوں کہتی ہے. لیکن جب علم نجوم سے شغف ہوا تو جانا کہ یہ اس کا اجتماعی شعور ہے. ۱۴ ستمبر کو شمس برج اسد میں داخل ہوتا ہے یعنی سنگھ راشی میں پرویش کرتا ہے. سنگھ راشی سورج کی اپنی راشی ہے جہاں اس کو شرف حاصل ہوتا ہے. شائد یہی وجہ ہے کہ سورج کی کرنیں اس ماہ میں زیادہ نوکیلی محسوس ہوتی ہیں اور نصیب بھی اسی ماہ گرم کپڑے سکھاتی ہے. اور اسے سین کی دھوپ کہتی ہے. سنگھ کا لفظ صدیوں کے لسانی سفر میں سین میں بدل گیا ہے.

لیکن نصیب کچھ پریشان تھی. فروزی کہیں بھاگ گئی تھی اور گھر میں کام کرنے والا کوئی نہیں تھا. گھر فروزی پر منحصر ہے. وہ ہم سب کی کمزوری ہے. لیکن کمبخت رہ رہ کر بھاگ جاتی ہے اور نصیب اسے پکڑ پکڑ کر لاتی رہتی ہے. پچھلی بار کالونی میں کسی کی یہاں رہ گئی تھی. اس گھر کی مالکن سے نصیب کی اچھی خاصی تکرار ہو گئی تھی لیکن اس بار اس کا کہیں اتہ پتہ نہیں تھا.

''اپنی خالہ کے یہاں گئی ہوگی.'' میں نے اندازہ لگایا.

''نہیں! خالہ سے تو وہ لڑ کر آئی تھی.''

''پھر...؟''

''وہ ضرور کسی کے یہاں زیادہ اُجرت پر کام کر رہی ہے.''

نصیب کے لیئے اس کو ڈھونڈ نکالنا مشکل نہیں ہے. وہ جاسوس رکھتی ہے. رحیمن بوا...منی بوا...سونی...! اصل میں کالونی کی نوکرانیوں کا پورا کنبہ اس کے تابع ہے.

لیکن نصیب بھاگل پور دسہرے کی تعطیل میں جانا چاہ رہی تھی. میں خوش ہوا. میں نہیں چاہتا تھا وہ ابھی لال گنج جائے. نصیب میں سونگھنے کا مادّہ ہے.

میں نے کسی طرح دو دن گذارے. ایک دو چھوٹا موٹا کام کیا. جیسے بجلی بل کی ادائیگی..ٹیبل فین کی مرمّت.....! میں نے نصیب سے بہانہ بنایا کہ آفس میں ضروری کام ہے اور لال گنج چلا آیا. فلیٹ میں داخل ہوا تو ساجی بالکونی میں تھی. مجھے دیکھتے ہی اندر چلی گئی. شائد مسکرائی بھی تھی. اور یہ معنی خیز تھا. اس کو توقع تھی کہ میں جلد ہی واپس آؤں گا اور جس طرح بے نیازی سے وہ اندر گئی تھی تو جتا رہی تھی کہ مجھے کیا.....؟ آؤ.....یا جاؤ.....! میں کمرے میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ رینو آئی.

''انکل! چائے لینگے...؟''

یعنی وہ میرے انتظار میں تھی. میں خوش ہوا. مجھے چائے کی طلب بھی تھی. اکبر اس وقت موجود نہیں تھا.

چائے لے کر وہ خود آئی. اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی، جیسے کہہ رہی ہو'' کیوں...؟ دل نہیں لگا نا...؟''

میں جھینپ رہا تھا لیکن فوراً خیال آیا اسے بھی شرمندہ کروں. میں نے شرارت سے پوچھا.

''ایک بات بتائیے.''

''کیا؟''

''آپ کو میرا انتظار تھا؟''

ارے نہیں...!''

''آپ جس طرح بالکونی میں...؟''

''میں کمار کا انتظار کر رہی تھی.''

''کمار...؟''

''میں انہیں کمار کہتی ہوں.''

میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا. اعتراف کروں گا کہ میں نے ایک جلن سی محسوس کی. اس گاؤدی کو وہ کمار کہہ رہی تھی.....اس مڈل فیل کو...!

''کہاں گئے آپ کے کمار؟'' میرے ہونٹوں پر تضحیک آمیز مسکراہٹ تھی.

''بابا دھام گئے ہیں.''

کب گئے؟''

''جس دن آپ گئے.''

''ابھی تو دو دن بھی نہیں ہوئے. بھلا آپ کے کمار آج کیوں آئینگے .سوموار تو پرسوں ہے.''

وہ سٹپٹا گئی لیکن جواب کے لیئے جیسے تیار تھی.

''وہ باہر جاتے ہیں اور میں انتظار کرنے لگتی ہوں. ان کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا. بھوک پیاس مر جاتی ہے. کچھ کھایا پیا نہیں جاتا.''

''جھوٹ....!'' میں نے دل میں کہا.

وہ یقیناً جھوٹ بول رہی تھی. یہ پروجیکشن کا عمل تھا. جو بات تھی نہیں وہ بات پروجیکٹ کرنا چاہ رہی تھی. اس کو درجات کا انتظار نہیں تھا. کوئی سوال نہیں اٹھتا ہے. اس کو معلوم تھا کہ درجات سوموار کو جل چڑھانے کے بعد آئے گا. وہ میری راہ دیکھ رہی تھی. اس وقت اس کے چہرے پر جو خوشی تھی میری قربت کی خوشی تھی .اس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ تھی. یہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی کہ تم بھاگ کر آ گئے .درجات گھر پر نہیں تھا. وہ تنہا تھی اور آزاد تھی اور مجھ سے گھنٹوں بات کر سکتی تھی.

چند ساعت پہلے جو جذبہ رقابت محسوس کر رہا تھا وہ ترحم میں بدل گیا.....بے چاری.....جتا رہی ہے کہ پتی ورتا ہے اور شوہر کا انتظار کر رہی ہے. اس گاؤدی شخص کو کمار کہہ کر خوش ہو رہی ہے. کمار اس کا آئیڈیل ہے جو درجات میں مجروح ہوا ہے. اس لیئے نام بدل دیا.....کیا نام بدل دینے سے شخصیت بدل گئی.؟ کس قدر بھرم میں جی رہی ہے وہ.....؟

''آپ کھانا کھائینگے؟''

کیوں تکلّف کر رہی ہیں؟''

''تکلّف کی کیا بات ہے. آپ کا ملازم تو ہے نہیں.''

''ہوٹل تو ہے.''

''اچھا نہیں لگے گا.''

اوکے...!'' میں مسکرایا. اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی.

وہ اپنے فلیٹ میں گئی تو میں نے بھی غسل کیا اور تازہ دم ہو کر بالکنی میں بیٹھا. وہ کھانا لے کر وہیں آ گئی. اس نے کھانا اپنے لیئے بھی لایا تھا. اس نے مٹر پلاؤ بنایا تھا اور دال مکھانی کے ساتھ آلو پرول کی سبزی.

''یہ گنگا جمنی کلچر ہے.''

''کیا؟''

''پلاؤ کے ساتھ دال اور سبزی.''

''گوشت چاہیئے.''

''ایران میں گوشت روٹی اور ہندوستان میں دال روٹی.''

میں نے پوچھا کہ وہسکی پی سکتا ہوں تو اس نے اثبات میں سر ہلایا.

میں نے الماری سے بوتل نکالی. اس نے میرے لیئے پیگ بنایا. میری نظر اس کی انگلیوں پر پڑی.....اس کی انگلیاں لامبی اور مخروطی تھیں.....جوڑ پر کوئی گرہ نہیں تھی ...ناٹ لیس جوائنٹس.....ایسے ہاتھ کو کیرو نے فلاسفک ہینڈ بتایا ہے. ایسے لوگ بہت حساس ہوتے ہیں. انہیں کوئی سمجھ نہیں پاتا. لیکن میں سمجھ رہا تھا. وہ اوّل درجے کی ہیپو کریٹ تھی.. کچھ دیر پہلے کہہ رہی تھی کہ کمار کے بغیر کھایا پیا نہیں جاتا اور اب مٹر پلاؤ لے کر آئی تھی. لیکن میری سوچ غلط بھی ہو سکتی ہے. میں کیوں بھول جاتا ہوں کہ کمار اس کا آدرش پرش ہے جو درجات نہیں ہے. کمار میں ہوں اور میرے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے گویا کمار کے ساتھ کھا رہی ہے.

''کمار کے نام.'' میں نے پہلے پیگ کی پہلی چسکی لی.

''تھینکس.''

وہ مسکرائی. ایک نوالہ منہ میں ڈالا اور بالکنی سے باہر دیکھنے لگی. باہر ملگجا اندھیرا تھا. برگد کا پیڑ پراسرار نظر آ رہا تھا. جھینگر کی آواز مستقل گونج رہی تھی. میں نے محسوس کیا کہ وہ واقعئی آہستہ کھاتی تھی. میں نے پہلے دن زائچہ دیکھ کر بھی کہا تھا. اصل میں دوسرے خانے میں برج اسد تھا جو غیر متحرک برج ہے. زحل اور مشتری وہاں موجود تھے .دونوں آہستہ رو ستارے ہیں. اور زائچے کا دوسرا خانہ خوردنی سے وابستہ ہے.

میں وہسکی کی چسکیاں لیتے ہوئے اسے غور سے دیکھ رہا تھا. اچانک زلفوں کی ایک لٹ اس کے رخسار پر لہرا گئی. میں نے ہاتھ بڑھا کر اس لٹ کو پیچھے کر دیا. اس نے آنکھ کے گوشے سے میری طرف دیکھا. میری یہ حرکت غیر متوقع تھی. شائد وہسکی رنگ لا رہی تھی.

''وہ لٹ اٹھکھیلیاں کر رہی تھی.'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا.

وہ زور سے ہنس پڑی. آنچل ڈھلک گیا لیکن اس نے آنچل برابر نہیں کیا. اسی طرح ہنستی رہی. پھر اس کا لہجہ یکا یک بدل گیا.

''آپ پچیس سال قبل کیوں نہیں ملے.؟''

میں نے اسے حیرت سے دیکھا.

وہ خاموش ہو گئی. ہونٹوں کے خم نے کچھ عجیب انداز اختیار کر لیا. نچلا ہونٹ اک زرا اندر دھنس گیا اور بالائی حصّہ کچھ اور محراب نما ہو گیا.

میرے ذہن میں وہی بات گونجی.....اس عورت کو چھونا آسان ہے.....!

اور وہ گھڑی آ گئی.

ساون کی جھڑی تھی. قمر منزل شٹلین سے گذر رہا تھا. شیو بھگتوں کا مہا کمبھ شروانی میلہ شروع ہو چکا تھا. ہر ہر گنگے اور بول بم کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی. سلطان گنج پر کیسریا رنگ کا خمار چھانے لگا تھا. گھنگھروؤں کی رن جھن سے فضا مترنّم تھی. بھگت جن جوق در جوق امنڈے چلے آ رہے تھے. شیو بھگتوں نے سلطان گنج میں گنگا جل بھرا. کنوریا کا ایک جتھا ہنومان اور بے تال کا روپ دھارن کیئے چل رہا تھا. کچھ گلال اور ابیر اڑاتے چل رہے تھے. کچھ جتھے ایسے بھی تھے جن

کے افراد پہلے پہنچ گئے تھے اور گھاٹ کنارے باقی ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے. مل ماس ہونے کی وجہ سے ایک ماس تک چلنے والا میلہ اس بار دو ماس چلے گا.

مہا پنڈت راون پہلے کانوریا تھے جنہوں نے بابا دھام کا گنگا جل ابھیشیک کیا تھا. لنکا ادھی پتی کی ارادھنا سے خوش ہو کر بھگوان بھولے شنکر کیلاش سے لنکا جانے کے لیئے راضی ہو گئے تھے. مگر آری ورت کے بھگتوں کا موہ تیاگ نہیں کر سکے اور داروک بن میں استھاپت ہو گئے. داروک بن میں ناگیش جیوتی لنگ کے وجود کا ذکر پران میں آیا ہے. سمندر منتھن کے بعد دیوتاؤں نے شری ناگیش ناتھ جیوتی لنگ کو باسکی ناگ کو سونپ دیا. جس سے ناگیش ناگ کا نام باسکی ناتھ پڑا اور یہ دھام باسکی ناتھ دھام کہلانے لگا. پورا علاقہ گھنے جنگلوں سے بھرا پڑا تھا. یہاں داروکا نام کی راکشسی بھی رہتی تھی.

بھگوان بھولے ناتھ کو راون داروک سے نہیں لے جا سکا اور وہیں ان کی پوجا ارچنا شروع کی. لنکا ادھی پتی با قاعدہ ہری دوار سے گنگا جل کانوریہ میں ڈھو کر بابا وید ناتھ کا مستک ابھیشھیک کرتے تھے. کانوریہ پتھ اور ارد گرد کے درجنوں استھل دیو نام سے جانے جاتے ہیں.... شیولوک.... بھوت ناتھ... بھول بھلیاں... گیرا و پربت... رنگیشور.... مہیش مارا.... شیشو بن.... پچھمن جھولا..... اندر بن....! کانوریہ پتھ کا ذرّہ ذرّہ شیو ہے اور ہر شئے بم.... بم....!

فضا میں بول بم کے مہا منتر کی گونج ہے.... بابا مندر کے ٹھیک پورب میں تری پورہ کا مندر ہے جسے پاروتی کے روپ میں جانا جاتا ہے. تری پورہ کے بائیں پہلو میں ماں جے درگا کی مورتی ہے. بابا مندر شکھر پر پنچ پھول لگے ہوئے ہیں.

بھولے ناتھ نشہ کرتے ہیں اور بھوت پریت بھی.... بھولے ناتھ وش پی گئے تھے.... بھگت جن کو بھی کچھ پینا چاہیئے.... گانجے اور بھنگ کے نشے میں چور.....

روحانیت سے سرشار.... بھگت جن کانوریہ پتھ پر بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں.... گیروا رنگ میں شرابور.... اپنے بابا وید ناتھ کے درشن کو بے قرار.....

درجات کے کندھے سے کانوریہ جھول رہی تھی. قدم مسلسل بابا دھام کی طرف بڑھ رہے تھے. لیکن عین مندر کے قریب اس کو ٹھوکر لگی. کانوریہ کے ساتھ اوندھے منہ گرا.... اور سارا جل زمین پر الٹ گیا....!!

ساجی اداس تھی. یہ خبر اس کو موبائل پر معلوم ہوئی.

''یہ اپ شگون ہے.''

''نہیں.''

''پھر.؟''

''بھولے ناتھ نے جل قبول کر لیا.''

''کیسے؟''

''بھگوان نیت دیکھتے ہیں.''

''لیکن جل تو الٹ گیا.''

یہ شیطانی حرکت تھی. درجات کا کیا قصور....؟ اور بھولے ناتھ کو اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے. وہ سب کے ہیں. جن کلّیان کے لیئے وش پی گئے....!''

''آپ ہیں تو مجھے سہارا ہے.'' اس کی پلکوں پر آنسو کا ننھا سا قطرہ لرز رہا تھا. میں نے اچانک اس کے چہرے کا کٹورہ سا بنایا اور پلکیں چوم لیں. وہ میرے سینے سے لگ گئی..... جیسے اس کو اسی پل کا انتظار تھا. میں نے اسے بازوؤں میں بھینچا اور چومنے کی کوشش کی. مجھے اپنے رخسار پر اس کی گرم سانسوں کا لمس محسوس ہوا. اور نتھنوں میں عجیب سی مہک گھل گئی.... اوس میں بھیگے ہوئے جنگلی گھاس کی سی مہک..... میں بے قرار ہو گیا. اس سے پہلے کہ میں اس کے لب و رخسار پر اپنے ہونٹ ثبت کرتا وہ تڑپ کر میرے بازوؤں سے نکل گئی اور اندر کاریڈور میں گھس گئی. میں اپنے کمرے میں چلا آیا. وہ اس دن پھر نہیں آئی.

میں نے بھی چھٹی لی اور گھر چلا آیا.

فروزی مل گئی تھی. نصیب نے اسے ڈھونڈ نکالا تھا. میں نے پوچھا کہاں تھی تو بپھر گئی.

''یار کے پاس تھی.''

''یار....؟''

''ایک ٹمپو والے سے آنکھیں لڑا رہی تھی.''

''اب تم اس کے دل کی دھڑکنوں پر تو قابض نہیں ہو سکتیں.''

''آپ کی یہی اٹکّر لیس بولی مجھے پسند نہیں ہے.''

''اٹکّر لیس'' ـــ نصیب کو وہ ہر بات اٹکّر لیس لگتی ہے جو اس کے اصول کے خلاف ہے. فروزی کا موڈ آف تھا لیکن میں ہمیشہ اس کی دلجوئی کرتا ہوں. گھر میں ایک آدمی گرم ہو تو دوسرے کو نرم ہونا چاہیئے. نصیب جب جھلّاتی ہے تو لطف آتا ہے. ایسے میں وہ خوب صورت لگتی ہے اور میں بات کو طول دیتا ہوں.

''اس کی شادی کرا دو.''

''کلموہی سے کون شادی کرے گا.''

''ٹمپو والا.''

''وہ اس کے ساتھ کھیلے گا شادی نہیں کرے گا.''

نصیب فکر مند تھی. رات بستر پر آئی تو پھر روزی کا ذکر چھیڑا.

''اس کا پرگنینسی ٹیسٹ کراوں گی.''

''ایسا کیوں سوچتی ہو؟''

''اب آپ سے کیا کہوں؟ وہ دو رات اسی کے پاس رہی.''

نصیب واقعی تناؤ میں تھی. اس کا تناؤ میری بانہوں میں ہی ختم ہوتا ہے. میں نے اسے سینے سے لگا کر بھینچا. نصیب نے آنکھیں بند کر لیں. مجھے ساجی کی یاد آئی..... جنگلی گھاس کی سی مہک.... لیکن نصیب کی سانسوں میں مہدی کی مہک ہے. یہ مشتری کا اثر ہے.

میں لال گنج لوٹا تو درجات بابا دھام سے آ چکا تھا.

مسکراہٹ بھی شخصیت کی غمّاز ہوتی ہے. نچلی منزل پر کوئی جھا جی

رہتے تھے.ان کی مسکراہٹ میں برفیلی ہواؤں کا لمس تھا.وہ اس طرح مسکراتے جیسے کوئی ترکش سے تیر نکالتا ہے.وہ سی بی آئی میں کلرک تھے.....آنکھیں ہلکی بھوری اور مونچھیں باریک.وہ خواہ مخواہ بے تکلّف ہونے کی کوشش کرتے اور میں دامن بچاتا. ان سے ہی معلوم ہوا کہ درجات کی پانچ بیٹیاں ہیں لیکن وہ پانچویں کا ذکر نہیں کرتا.

''ایسا کیوں؟''میں نے پوچھا تھا.

شرم...!''

''کس بات کی شرم؟''

''یہی کہ بیٹا ایک بھی پیدہ نہیں ہوا''

''اس میں شرم کی کیا بات ہے؟''میں چڑ گیا.

وہ مسکرایا اور ایک آنکھ دبائی.''آخر کہتی کیوں نہیں کہ پانچ بیٹیاں ہیں؟''

''پانچویں کہاں ہے؟''

''بھائی نے گود لی ہے.''

جاتے جاتے اس نے ایک بات اور بتائی.وہ یہ کہ درجات کی ماں تا ڑی پیتی ہے.اور ایک تیر مجھ پر بھی چلایا.''آپ تو یہاں مستی میں ہونگے.''

میں خاموش رہا.اس شخص سے دامن بچانا بہتر تھا.

ساجی سے روبہ رو ہونے کا موقع نہیں مل رہا تھا.اس کے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے.وہ بہ ظاہر مصروف تھی.سیڑھیاں چڑھتے اترتے ایک دو بار درجات سے علیک سلیک ہوئی.وہ کچھ بجھا بجھا سا نظر آیا لیکن ساجی چہک رہی تھی.اس کے قہقہے فلیٹ میں گونج رہے تھے.درجات بھی ہنستا ہوگا لیکن وہ تو ہنستا ہے غٹ...غٹ...غٹ.....!

خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے.آخر مہمان گئے.درجات بھی گیا.

''میری ماں تھی''ساجی نے بتایا.

وہ خوش نظر آرہی تھی.گلے میں سونے کا لاکٹ جھول رہا تھا.اس نے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا لاکٹ کے سرے میں پھنسا رکھا تھا.

''درجات کہاں گئے؟''

''ماں کو پہنچانے گئے ہیں.''

''بہت خوش ہیں آپ؟''

''ماں نے لاکٹ دیا.''

''ماں کے آنے کی خوشی نہیں ہے لاکٹ ملنے کی خوشی ہے.''میں مسکرایا.

''آپ ہر بات کا غلط مطلب کیوں نکالتے ہیں؟''

''اور کیا حال ہے؟''

''اپنی کتابیں دکھایئے نا''

میں اسے شیلف کے پاس لے گیا.

''مجھے تو انگریزی نہیں آتی.''

''ہندی پڑھیئے.''

''یہ کون سی کتاب ہے؟''اس نے جھک کر ایک کتاب کی طرف اشارہ کیا..اس طرح جھکنے میں اس کا شانہ میری پیٹھ سے چھو گیا.

اکبر کواڑ کی اوٹ سے دیکھ رہا تھا.نصیب کے مانگے کا ہے.اکثر اس طرح دیکھتا ہے اور مجھے اس کی آنکھوں میں نصیب کی آنکھیں نظر آتی ہیں.میں نے اسے سگریٹ لانے بھیج دیا.ساجی نے شیلف سے کتاب نکالی''یوگ کتھا امرت.''

''پڑھیئے.دلچسپ کتاب ہے.''

وہ کتاب الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی.وہ میرے قریب کھڑی تھی.میں نے اضطراب کی ہلکی سی لہر محسوس کی.

''آیئے بالکونی میں بیٹھتے ہیں.''

''چلیئے''وہ خوش ہوگئی اور پھر چہک کر بولی.

''مجھے بالکونی میں بیٹھنا اچھا لگتا ہے.''

''اور کیا کیا اچھا لگتا ہے.؟''

''آپ کا ساتھ...!''

شکریہ.''

''ایک بات کہوں؟''

''میں صرف دوستی چاہتی ہوں....اور بس...!''

میں مسکرایا تو وہ بھی مسکرائی.اور میری طرف ایک ادا سے دیکھا.مجھے لگا اس کی نظریں کہہ رہی تھیں میں تو دوستی چاہتی ہوں تم کیا چاہتے ہو...؟ کچھ چاہتے ہو تو آگے بڑھو....!میں نے ایک پل بھی تامّل نہیں کیا اور اچانک اس کو اپنی بانہوں میں بھر کر زور سے بھینچا.....اس کی ایڑیاں زمین سے معلّق ہوگئیں.....وہ میری با نہوں کے شکنجے میں جھولنے لگی....وہ جیسے سکتے میں تھی....اس کا بدن ڈھیلا تھا...وہ زرا بھی مزاحمت نہیں کر رہی تھی.....میں اسے اسی طرح اٹھائے بستر تک لایا.

'' دھب .....دھب.....''سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آ واز.....اکبر.....؟؟

میں فوراً اس سے الگ ہوگیا اور زور زور سے بولنے لگا.

''دیکھیئے.....یہ کتاب بہت دلچسپ ہے.....پڑھ کر بتایئے.''

اکبر سگریٹ لے کر آیا.اس وقت وہ بستر سے اٹھ رہی تھی.اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا.اکبر نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جس طرح نصیب ہوتی تو دیکھتی.میں نے اکبر سے آنکھیں نہیں ملائیں.

وہ کتاب لے کر چلی گئی.

اصل میں عورت سے تعلّق استوار ہوتا ہے تو بیچ میں پھمن ریکھا بھی ہوتی ہے جو فوراً نہیں مٹی تو وقت کے ساتھ گہری ہونے لگتی ہے اور عمر بھر قائم رہتی ہے.یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے اس لکیر کو مٹا دینا تھا ورنہ یہ تعلّق محض دوستی تک محدود رہتا.اگرچہ میں نے پہل اسی دن کی تھی جب درجات کو بابا دھام میں ٹھوکر لگی تھی.لیکن اس کی نوعیت کچھ اور تھی.اس دن اس کی کا نور الٹ گئی تھی.یہ نیک

فال نہیں تھا. وہ تناؤ میں تھی اور اسے ایک پیار بھرے لمس کی ضرورت تھی اور میں نے آہستہ سے اس کی پلکیں چومی تھیں. لیکن آج وہ خوش تھی اور مجھ سے دوستی کی خواہش مند تھی اور مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھا تھا. میں اس کی نظروں میں کمار تھا. ایسے میں تقاضا یہی تھا کہ کمار اسے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں.....

مجھے امید تھی کہ وہ آئے گی. درجات گھر سے باہر تھا اور مجھے رات کا انتظار تھا.

لیکن رات نے ابھی گیسو بھی نہیں بکھیرے تھے کہ اس کے فلیٹ میں خاموشی چھا گئی....کہیں ہلکی سی سرسراہٹ بھی نہیں تھی. مجھے حیرت تھی کہ اس کی چاروں لڑکیاں کہاں مرگئیں؟ وہ ہر وقت چہکتی رہتی تھیں. گرچہ بڑی والی منصوبہ کچھ خاموش طبیعت تھی اور پڑھائی میں لگی رہتی تھی لیکن منجھلی شوبو چنچل تھی اور دھم دھم کرتی ہوئی سیڑھیاں اترتی تھی. رینو اور مینو بھی باتونی تھیں. ان کی آواز نیچے تک سنائی دیتی تھی. لیکن اس وقت فلیٹ میں سوئی کی نوک بھی گرتی تو آواز ہوتی. مجھے لگا شائد سب کہیں باہر ہیں لیکن دروازہ اندر سے بند تھا اور کہیں مدھم سا بلب روشن تھا جس کی روشنی دروازے کی دراڑ سے چھن کر آرہی تھی.

میں صحن میں ٹہلنے لگا. یہاں سے اس کے بیڈروم کی کھڑکی نظر آتی تھی. کمرے میں نیم تاریکی تھی. کھڑکی کا پردہ ہوا میں آہستہ آہستہ ہل رہا تھا. یقیناً کمرے میں پنکھا چل رہا تھا....سب سو گئے کیا....؟ میں کمرے میں آیا. روشن دان پر نظر ڈالی. جالیوں کے پیچھے بھی خاموشی تھی. رات کے نو بج گئے. کھانے کے بعد اکبر حسب معمول میرے پاؤں دبانے لگا. میں نے اوڈ کی ''بک آف لو'' ہاتھ میں لے لی لیکن میرا دل پڑھنے کی طرف مائل نہیں تھا. میری نظر رہ رہ کر روشن دان کی طرف اٹھ رہی تھی. جالیوں کے پیچھے اندھیرا تھا.

دس بج گئے. اکبر نیچے سونے چلا گیا. میری بے قراری بڑھ گئی. مجھے امید تھی وہ آئے گی. میں کمرے سے صحن اور صحن سے کمرے تک چہل قدمی کر رہا تھا. میری نظر کبھی کھڑکی پر جاتی کبھی روشن دان پر. میں نے وہسکی کا ایک پیگ بنایا اور صحن میں بیٹھ کر چسکیاں لینے لگا. رات عجیب سہانی تھی. آسمان میں تارے چھٹکے ہوئے تھے. ہوا مند مندسی چل رہی تھی. پیڑ کے پتوں میں ہلکی ہلکی سی سرسراہٹ تھی جو خامشی کا حصّہ تھی. سیاہ رات کی خمشی ڈراونی ہوتی ہے لیکن سہانی رات کی خامشی پر اسرار ہوتی ہے. میں صحن کے فرش پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا اور اس کا انتظار کر رہا تھا. مجھے اس کے انتظار میں لطف آرہا تھا. کبھی کھڑکی کی طرف دیکھتا کبھی آسمان کی طرف. تاروں بھرا آسمان شہر میں نظر نہیں آتا لیکن یہاں کہکشاں تک نظر آرہی تھی.

بارہ بج گئے ....اب آئے گی ....یہی وقت ہے آنے کا....میں نے وہسکی کا آخری گھونٹ بھرا اور اپنے پاؤں پھیلائے....اچانک لگا کوئی دبے پاؤں چل رہا ہے. مجھے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی. کمرے میں آیا....کرسی کھینچ کر روشن دان کے نیچے رکھی اور اس پر کھڑے ہو کر پرے جھانکنے کی کوشش کی....اُدھر اندھیرا تھا...میں نے کان بھی دھرے....قدموں کی کہیں کوئی چاپ نہیں تھی.

مجھے عجیب لگا. میں آخر اس کا اس طرح انتظار کیوں کر رہا تھا....؟ اور مجھے امید کیوں تھی کہ وہ آئے گی...؟ مجھے اپنے آپ پر جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی. میں نے روشنی گل کی اور بستر پر لیٹ گیا. کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا پھر اچانک جی میں آیا ٹیرو کے پتّے دیکھوں....؟ کیا کہتے ہیں ٹیرو کارڈ....Tarot Card

میں نے پھر روشنی کی. ٹیرو کی گڈّی ہاتھ میں لی. چند ساعت کے لیئے آنکھیں بند کر کے یکسوئی قلب حاصل کرنے کی کوشش کی ....گڈّی پھینٹی....اور ایک پتّہ کھینچا.

The lover.....Arcane vi آرکین سکس دی لور....! آدم اور حوّا شجر ممنوعہ کے قریب ....اور کیوپڈ نشانہ باندھتا ہوا ....مسلہ یہی تھا....میں اسی منزل میں تھا....لیکن انجام کیا تھا....؟

میں نے دوسرا کارڈ کھینچا.

''کوئن آف سورڈ....'' میں نے تصویر کی معنویت پر غور کیا. خاتون پروقار کے ہاتھ میں شمشیر....شمشیر کی نوک اوپر اٹھی ہوئی.....!

یہ مداخلت کا اشارہ تھا. ساجی اب آنے والی نہیں تھی. میں نے اسے کوسا....روشنی گل کی اور بستر پر لیٹ گیا....نیند آہی گئی.

آپ کہیں کمرے میں ہوں اور اچانک سامنے دیوار پر پھول اگ آئے....؟ میں صبح دم حیران تھا.....!

ملکہ شمشیر....!

مہدی کی خوش بو سے میری آنکھ کھلی.....

نصیب مجھ پر جھکی میرے رخسار تھپتھپا رہی تھی. اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا. ہونٹوں پر دل آویز مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں رنگین قمقمے جگمگا رہے تھے....

تم....؟'' مجھے یقین نہیں آرہا تھا.

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی.

''اچانک....!''

''سوچا آپ کو سرپرائز دوں.'' وہ بہت خوش نظر آرہی تھی. میں نے اسے بانہوں میں کس لیا. وہ کسمسائی اور کمرے کی طرف اشارہ کیا. میں نے ادھر دیکھا. وہاں کوئی نہیں تھا لیکن روشن دان میں بندیہ چمک رہی تھی. میں نے نصیب کا بوسہ لیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا.

''بچّے....''؟

''بالکنی میں ہیں.''

''فروزی بھی آئی ہے؟''

''نہیں. خالہ کے گھر چھوڑ دیا.''

کیوں؟''

یہاں اکبر جو ہے.''

''شیر اور بکری....؟'' میں مسکرایا نصیب بھی مسکرائی.

نصیب کے مسکرانے کا انداز کلیوں کے چٹکنے جیسا ہے. اس کے ہو نٹ شگفتہ ہیں. نصیب مسکراتی ہے تو عارض بھی مسکراتے ہیں. آنکھیں بھی ہنستی ہیں. ہونٹ ایک زرا خم لیئے پھیلتے ہیں اور گالوں میں خفیف سا گڈھا پڑ جاتا ہے اور آنکھوں میں قمقمے سے روشن ہو جاتے ہیں. اس کی مسکراہٹ کے پس پردہ دھوپ کا اجالا ہوتا ہے. شائد اس کے باطن میں بہت ساری دھوپ ہے جس کی تما زت اس کی شخصیت میں جذب سی محسوس ہوتی ہے.

یہ نصیب کا شفاف باطن ہے کہ وہ اکثر ٹیلی پیتھی کے تجربے سے گذرتی ہے. اس نے بتایا کہ وہ بھاگلپور جانے کے لیئے اسٹیشن پہنچی تو اس کا دل گھبرا نے لگا. اسے لگا جیسے میں بیمار ہوں. اس نے فوراً لال گنج کی ٹرین پکڑی اور آ گئی.

سب سے پہلے اس نے روشن دان پر نیا اخبار چپکایا اور میں نے وہسکی کی بوتل چھپائی. اکبر خوش نظر آ رہا تھا. وہ روشن دان کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھتا اور مسکراتا. میں یہ سوچ کر دل ہی دل میں مسکراتا کہ چند دنوں کی بات ہے اخبار میں پھر سوراخ ہونگے.

ساجی کے کمرے میں کوئی سن گن نہیں تھی. مجھے حیرت ہوئی کہ کبھی کبھی سب کہاں مر جاتے ہیں. نصیب غسل کرنے گئی تو سیڑھیوں پر کسی کے قد موں کی چاپ سنائی دی. میری نظریں روشن دان کی طرف اٹھ گئیں. مجھے لگا کہ کاغذ کا کونہ آہستہ سے پھڑ پھڑایا ہے.....اور اچانک ساجی گلیارے میں نظر آئی. وہ کسی مورتی کی طرح بے جان کھڑی تھی. چہرہ سیاہ ہو رہا تھا. جیسے قبر سے اٹھ کر آئی ہو. وہ بے جان نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی. لب سلے تھے. اکبر اس وقت سودا سلف لانے گیا ہوا تھا. سیفی اور کیفی بالکونی میں وی ڈی او گیم میں مگن تھے اور نصیب باتھ روم میں تھی..میں نے اسے ایک لمحہ غور سے دیکھا اور پھر نیچے اترنے کا اشارہ کیا. اس میں کٹھ پتلی کی طرح حرکت ہوئی. وہ میرے پیچھے پیچھے آئی. میں نے نیچے کا دروا زہ بند کیا اور اس کی طرف مڑا. اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور سینے سے لگا کر زور سے بھینچا. اور آہستہ سے اس کی پلکیں چومیں. وہاں آنسو کا ایک قطرہ لرز رہا تھا. اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور بدن کانپ رہا تھا. میں نے اسے ایک بار پھر چوما گال تھپتھپائے اور تیز تیز سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا.

یہ عمل ضروری تھا. اب اسے اطمنان ہوگا کہ اس کی گرفت میں آئی ہوئی کوئی چیز آزاد ہونا نہیں چاہتی.

نصیب کو فلیٹ پسند نہیں آیا. باتھ روم کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا. ایک کاغذ اس نے وہاں بھی چپکایا. صحن میں ایک بوتیام میں مرچ کا اچار سوکھ رہا تھا. نصیب کو اعتراض تھا کہ صحن مالک مکان کے استعمال میں بھی ہے. صحن کے پیراپیٹ کی اونچائی کم تھی جس سے بے پردگی ہوتی تھی. سامنے مکانوں کے بیڈ روم تک نظر آتے تھے. لیکن نصیب نے زیادہ نکتہ چینی نہیں کی. وہ یہاں رہنے نہیں آئی تھی اور میرے لیئے فلیٹ برا نہیں تھا.

ساجی شام کو ملنے آئی. وہ بہ ظاہر خوش نظر آ رہی تھی. سیفی اور کیفی کو اس نے پیار کیا اور چاکلیٹ کا پیکٹ دیا. نصیب سے بے تکلّف ہونے کی کوشش کی لیکن نصیب برج قوس کی ہے. قوسین عورتیں جلدی گھاس نہیں ڈالتیں. ساجی سرطان ہے. قوس آتشی ہے اور سرطان آبی. پانی اور آگ میں ہم آہنگی نہیں ہو سکتی. پانی آگ کو بجھا دے گا یا آگ پانی کو بھاپ بنا کر اڑا دے گی.

ساجی چلی گئی تو نصیب نے تبصرہ کیا کہ عورت باتونی ہے. میں نے تبصرے پر تبصرہ کیا کہ عورت تو باتونی ہوتی ہی ہے. اتنا نصیب کو اکسانے کے لیئے کافی تھا. وہ برہمی کے انداز میں بولی: ''اب ایسا بھی کیا کہ بات بات پر اپنے پتی کا ذکر....میرے پتی ایسے ہیں تو میرے پتی ایسے ہیں...! اس کا مطلب ہے کہ اس کا پتی ناقص ہے اور یہ دکھاوا کر رہی ہے کہ بہت پتی ورتا ہے.''

''خطرہ....!''

ملکہ شمشیر کی خاصیت ہے معاملے کی تہہ تک پہنچنا.....

دونوں کا زیادہ ملنا جلنا منا سب نہیں تھا.

دوسرے دن نصیب کے تیور تیکھے ہو گئے.

وجہ یہ ہے کہ اس کی ناک میں پکھراج کی کنّی والی لونگ ہے جو میں نے بہت پہلے دی تھی. اصل میں مشتری اس کا پیدائشی ستارہ ہے. پکھراج مشتری کا منا سب نگینہ ہے. ساجی دوسرے دن آئی تو اس نے ٹھیک ویسی ہی لونگ پہن رکھی تھی ....لیکن وہ زیادہ دیر نہیں بیٹھی. اس کے جانے کے بعد نصیب فوراً مجھ سے مخاطب ہوئی.

''عجیب عورت ہے. اس نے ویسی ہی لونگ پہنی.''

''تو کیا ہوا؟''

''کل تک اس کے پاس ایسی لونگ نہیں تھی. اس نے میری نقل کی.''

''جس کو عقل نہیں ہوتی ہے وہ نقل کرتی ہے.''

''آج وہ زیادہ دیر بیٹھی بھی نہیں...وہ دکھانے ہی آئی تھی.''

''عجیب بات ہے.''

''مجھ سے اپنا مقابلہ کر رہی ہے.'' نصیب کا موڈ واقعی خراب تھا.

مجھے فکر ہوئی. ساجی خود کو نصیب سے آئی ڈینٹی فائی کر رہی تھی. کیا عجب وہ اس جیسا لباس بھی زیب تن کرے. اگر ایسا ہوا تو نصیب بات کی اصلیت تک پہنچ جائیگی اور مجھے فلیٹ بدلنا پڑے گا. میں فوراً بازار گیا اور ہیرے کی کنّی والی لونگ خریدی.

''یہ لو....!'' میں نے لونگ نصیب کے ہاتھ پر رکھ دی.

نصیب نے مجھے حیرت سے دیکھا.

''اگر اس نے پھر نقل کی تو سمجھ لو احمق ہے.'' میں نے ہنستے ہوئے کہا. نصیب خوش ہو گئی.

میں نے محسوس کیا کہ ساجی نصیب سے اپنا بہت بڑھانے کی کوشش کر رہی ہے. وہ کچھ نہ کچھ بھجواتی رہتی. کبھی مکئی کی بالیاں...کبھی امرود...کبھی گاجر. نصیب کو برا لگتا کہ وہ اتنا کچھ کیوں کر رہی ہے. ساجی کہتی تھی اس کے کھیت کا ہے. حد تو یہ ہے کہ اس نے ایک بار سنیما کا پاس بھی بھجوایا. معلوم ہوا کہ اس کا کوئی دیور بسوشری ٹاکیز کا مینیجر ہے. اسی سے کہہ کر اس نے پاس منگوایا ہے لیکن نصیب نے

یہ کہہ کر پاس واپس کر دیا کہ وہ بچوں کی عادت بگاڑنا نہیں چاہتی.

''آپ نے تو پاس نہیں مانگا تھا.؟''

''میں کیوں مانگنے لگا.''

''آخر یہ مہربانیاں کیوں...؟ نصیب کے تیور چڑھے ہوئے تھے.

یہ ضروری تھا کہ میں ساجی کو برا بھلا کہتا ورنہ نصیب اور چڑھ جاتی.

''احمق عورت ہے.''

''وہ ہماری نظروں میں اچھا بننے کی کوشش کر رہی ہے.''

''یعنی وہ اچھی ہے نہیں.'' میں مسکرایا.

''میاں کیا کرتا ہے.''؟

''میاں دوائی بیچتا ہے.''

''اور دیور گیٹ کیپری کرتا ہے.'' نصیب کے لہجے میں حقارت تھی.

''گیٹ کیپر نہیں مینیجر ہے.''

''اکبر کہہ رہا تھا گیٹ کیپر ہے.''

''جانے دو...ہمیں کیا؟''

''گھرانہ معمولی ہے.''

''لیکن مہذّب ہے. زور سے بولنے کی آواز نہیں آتی. کوئی جھگڑا سنائی نہیں دیتا. بچے بھی شور نہیں مچاتے.''

نصیب چپ رہی.

''ہوسکتا ہے مخلص ہو. اپنے طور پر تمہاری خاطر کر رہی ہے. اپنے کھیت کی سبزیاں کھلا رہی ہے.''

نصیب نے نفی میں سر ہلایا. میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا.

''دکھاوا کر رہی ہے. وہ جتنا جتا چاہ رہی ہے کہ صاحب حیثیت ہے جب کہ ہے نہیں.''

''ایسا کیوں سوچتی ہو؟''

''اکبر کہہ رہا تھا سبزیاں بازار سے خرید کر بھجواتی ہے.''

کوئن آف سورڈ....کبھی تو تلوار میان میں رکھا کرو...! مجھے ساجی پر غصّہ آ رہا تھا...احمق عورت...پکھراج والی لونگ کیوں پہنی...؟

ساجی سے بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا ورنہ سمجھاتا کنارے رہو....نصیب جیسی عورتیں سونگھ کر سب سمجھ جاتی ہیں.

مجھے یہ موقع مل گیا. وہ تیج کا دن تھا. بھادوں ماس میں بڑھتے چاند کی تیسری تاریخ جب چاند ہست نچھتّر سے گذرتا ہے اس دن شادی شدہ عورتیں شوہر کی لمبی عمر اور خیر وعافیت کی دعائیں مانگتی ہیں. کہتے ہیں پاروتی نے شنکر کو حاصل کرنے کے لیئے گنگا تٹ پر بارہ ورش گھور تپ کیا. تپ میں ہوا پیتی دھوپ کھاتی اور پتّے چباتی. پتّے چبانے سے ہی پاروتی کا نام ''ارپنا'' پڑا. نارد نے پربت راج سے دونوں کے بیاہ کی سفارش کی. پربت راج راضی ہوئے تو سکھیاں اسے لے کر جنگل چلی گئیں. وہاں پاروتی کھوہ میں رہنے لگی اور ریت کا شیولنگ بنا کر ارادھنا کی. پاروتی کے کٹھور تپ سے خوش ہو کر شیو نے بیاہ کا وچن دیا. پربت راج کو خبر ملی تو خوشی خوشی دونوں کا بیاہ رچایا.

ساجی مجھے سیڑھیوں پر مل گئی. وہ کریپ سلک کی ساڑھی میں زیور سے لدی تھی. آنکھوں میں گہرا کاجل تھا. ماتھے پر جھومر اور ناک میں نتھ چمک رہی تھی. ہاتھوں میں قمقمے والی چوڑیوں کے ساتھ جڑاؤ کنگن کھنک رہے تھے. اس روپ میں میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا.

''کس کے قتل کا ارادہ ہے؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا.

''آج تیج ہے.'' وہ بھی مسکرائی.

''روزہ ہو...؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو جھومر ہل گیا. پھر آہستہ سے بولی

''ایک دیا آپ کے نام کا بھی جلاؤں گی.''

اور مسکراتی ہوئی اوپر چلی گئی . میں نے ایک لہر سی محسوس کی....میرے نام کا دیا....؟ کمار کے نام کا...!

رات تقریباً نو بجے وہ پرشاد لے کر آئی....طرح طرح کے پکوان.. پھل...مٹھایاں....ساتھ میں ایک ڈبّہ ٹوڑی اور سیندور کی ڈبیہ بھی. وہ اسی طرح سجی سنوری ہوئی تھی. نصیب اس کو دیکھ کر مسکرائی.

''اللہ خیر کرے.''

ساجی شرما گئی. پھر ہنستی ہوئی بولی. ''آج تیج ہے نا....''

''آپ تو دلہن بنی ہوئی ہیں.''

''آج کے دن ہر عورت سجتی ہے اور اپنے سہاگ کے لیئے نرجکا ورت رکھتی ہے.''

کیفی اور سیفی اس دلہن کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے. ساجی نے دونوں کے گال چھوئے اور سر پر ہاتھ پھیرا.

''میں بچپن سے ہی ورت رکھتی آ رہی ہوں.''

''یہ ہرتالیکا ورت ہے. بتایئے کیوں؟'' میں نے پوچھا.

''نہیں جانتی.'' وہ جھینپ گئی.

ہرتالیکا...یعنی ہرت جوڑا لیکا....ہرت معنی ہرن یعنی لے کر بھاگ جانا...الیکا معنی سہیلی....سہیلیاں پاروتی کو ہرن کر جنگل میں لے گئی تھیں اور وہاں پاروتی نے شیو کے لیئے ورت رکھا...اس لیئے اس ورت کو ہرتالیکا ورت کہتے ہیں.''

وہ خاموش رہی.

پتی لوگ تو نہیں رکھتے'' میں نے پوچھا.

''یہ تو رکھتے ہیں. کہتے ہیں تم بھوکی رہو گی تو میں کیسے کھاؤں گا.''

''بہت پیار کرتے ہیں آپ سے.'' میں مسکرایا. جواب میں اس نے میری طرف خاموش نظروں سے دیکھا.

''یہ رواج اب مردوں میں ہو گیا ہے.''

''باغ بان میں امیتابھ بچّن نے رکھا تھا۔'' سیفی بول پڑا۔
''کاجول نے بھی شاہ رخ خان کے لیئے رکھا تھا۔'' کیفی بھی بول پڑا۔
''یعنی ٹی وی کلچر کا اثر ہے۔ اگر امیتابھ نہیں رکھتا تو آپ کے پتی مہا راج بھی نہیں رکھتے۔'' میں نے اسے چھیڑا۔
''ایسی بات نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ سے میرا ساتھ دیتے ہیں۔ بہت پیارے پتی ہیں۔ میں خود ایک سیکنڈ بھی ان کے بغیر نہیں رہ پاتی۔''
''خدا کرے آپ کی جوڑی سلامت رہے۔''
''یہ کیا ہے؟'' کیفی نے ایک پکوان کی طرف اشارہ کیا۔
''ٹھکوا ہے۔ خالص گھی کا بنا ہے۔ کھاؤ۔''
''گھی آپ کے کھیت سے آیا ہوگا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
نصیب نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں ''یہ انٹلر لیس بولی...''
میں ہنسنے لگا۔ ساجی بھی مسکرائی۔ پھر اس نے ڈبے سے چوڑی نکالی اور نصیب سے مخاطب ہوئی۔
''پہن لیجیئے۔''
''ابھی رہنے دیجیئے۔''
''ارے نہیں... تیج کے دن سہاگن کو نئی چوڑی پہننی چاہیئے۔''
ساجی نے اپنے ہاتھ سے چوڑی پہنائی۔ نصیب انکار نہیں کر سکی۔ وہ خوش نظر آ رہی تھی۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور ہنس کر بولی۔
''ہمارے یہاں نئی چوڑی پہنتے ہیں تو سلام کرتے ہیں۔''
''یہ ہے گنگا جمنی کلچر۔ تیج کے دن چوڑی پہن کر سلام کرنا۔'' میں نے کہا
ساجی کے جانے کے بعد نصیب نے اکبر کو کھانا کاڑھنے کے لیئے کہا۔ کھانے کے دوران ساجی سے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی۔ لیکن نصیب بستر پر آئی تو بولی۔ ''چوڑیاں خوب صورت ہیں۔ اب مجھے بھی کچھ دینا پڑے گا۔''
''ایک ایسی ہی لونگ دے دو۔'' میں نے شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ ناک کی طرف اشارہ کیا۔
نصیب نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ''شروع ہو گئے آپ...؟''
میں ہنسنے لگا۔
''آپ اس کو بھی چھیڑ رہے تھے۔''
''نہیں تو...!''
''آپ لوگ عورتوں کی بڑی خوشیاں سہہ لیتے ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی خوشیاں گراں گذرتی ہیں۔''
''کیا بات ہوئی؟''
وہ بہت خوش خوش آئی۔ بہت خلوص سے پرشاد دیا اور آپ اس کی کلاس لینے لگے۔''

وہ کیسے؟''
''ہرتالیکا ورت کے معنی پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ بے چاری شرمندہ ہو گئی کہ خود اپنے دھرم کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔''
''مجھے کیا معلوم کہ وہ اتنا بھی نہیں جانتی۔''
نصیب میری طرف مڑی۔ ہتھیلی پر رخسار ٹکایا اور کہنی کے بل ادھ لیٹی ہو گئی اور میری آنکھوں میں جھانکتی ہوئی مسکرائی۔
''اور جناب گھی کا کھیت سے کیا تعلّق؟''
میں ہنسنے لگا۔
''آپ ہیں شیطان۔'' نصیب بھی ہنسنے لگی۔
نصیب کی یہ ہنسی میں خوب پہچانتا ہوں اور اس طرح بستر پر اس کے نیم دراز ہونے کا انداز بھی.... یہ خود سپردگی کا اشارہ تھا۔
میں نے روشنی گل کی۔
''انترا نہیں مل رہا ہے۔'' نصیب آہستہ سے بولی۔
انترا... نصیب کا خاص لفظ... کسی کام میں جب آہنگ محسوس نہیں کرتی تو یہی کہتی ہے۔ وہ جب دائیں طرف ہوتی ہے تو انترا نہیں ملتا۔
اسے لپٹائے ہوئے میں نے اپنی بائیں طرف کھینچا... اور نصیب رسپانسو تھی۔
صبح صبح جھاجی ٹپک پڑے.....
مجھے الجھن ہوئی..... اس وقت آنے کا مقصد کیا تھا...؟
''سوچا آپ کو بدھائی دے دوں!''۔
''کس بات کی بدھائی؟''
''آپ فیملی لائے۔'' وہ مسکرائے..... مسکرانے کا وہی انداز.... ترکش سے تیر نکالنے جیسا.... مجھے عجیب لگا... اس میں بدھائی دینے کی کیا بات تھی؟
''ابھی تو بھابھی جی رہیں گی نا...؟'' اس کے پوچھنے کا انداز بھی مجھے طنزیہ معلوم ہوا۔
''کچھ دن..... جب تک بچوں کا اسکول بند ہے۔''
اس نے ایک لمحے کے لیئے مجھے گھور کر دیکھا.. پھر ایک آنکھ دبائی اور اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ''اوران کا کیا حال ہے...؟ خوب کنڈلی دیکھی جا رہی ہے''
. مجھے نفرت کا احساہوا نشانہ کہیں اور تھا.....!
اور آخر اس نے تیر چلایا..
''میرے ڈائریکٹر صاحب اکیلے رہتے ہیں فیملی ساتھ نہیں رکھتے۔ لیکن میم صاحب سرپرائز چیکنگ کرتی رہتی ہیں۔ جیسے بھابھی جی اچانک پہنچ گئیں تو وہ بھی اسی طرح اچانک پہنچ جاتی ہیں اور خالی کمروں میں جھانک جھانک کر دیکھتی ہیں..... یہاں تک کہ باتھ روم میں بھی...!'' اور پھر اس نے زور کا قہقہہ لگایا
''ہا... ہا... ہا... ہا..
قہقہہ لگاتے ہوئے اس کا منھ مگر مچھ کے دہانے کی طرح کھل گیا تھا

اور سارے دانت نمایاں ہو گئے تھے۔

وہ دیر تک نہیں بیٹھا. میں نے بھی چائے کے لیئے نہیں پوچھا.

مجھے کیا معلوم تھا ساری گفتگو ساجی روشن دان کے پیچھے سے سن رہی ہے. نصیب غسل کرنے گئی تو ساجی کو مجھ سے بات کرنے کا موقع مل گیا. وہ بہت غصّے میں تھی. مجھے دیکھتے ہی بولی.

''جھاجی کیا کہہ رہا تھا؟''

''ہم پر شک کرتا ہے.''

''یہ کیا شک کرے گا؟ خود اس کی بیوی اپنے جیٹھ سے پھنسی ہوئی ہے.''

میں مسکرایا. ساجی غصّے میں حسین لگ رہی تھی. لطف لینے کے لیئے میں نے آگ میں تیل چھڑکا.

''کہتا تھا درجات کی ماں تاڑی پیتی ہے.''

ساجی تلملا گئی. ''نرک میں جائے گا سالا....''

میں ہنسنے لگا.

سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی. ساجی کاریڈور میں چلی گئی. میں اندر کمرے میں آ گیا.

نصیب کا دل یہاں لگ نہیں رہا تھا گرچہ. ساجی اس کو لبھانے کی کوشش کرتی تھی. سیفی اور کیفی کی بھی وہ دلجوئی کرتی رہتی. لیکن نصیب کو یہ سب پسند نہیں تھا. وہ یوں بھی کسی سے ملتی ہے تو احتیاط کے ساتھ کہ فاصلہ مٹتا بھی ہے اور قائم بھی رہتا ہے. سیفی اور کیفی کو وہ ساجی کی لڑکیوں سے زیادہ گھلنے ملنے نہیں دیتی تھی. کیرم کھیلنے کبھی اوپر جاتے تو نصیب کچھ دیر میں ہی انہیں نیچے بلا لیتی

چھٹیاں ختم ہو گئیں. جانے سے ایک دن قبل ساجی نے شام کھانے پر بلایا. اس کے فلیٹ میں جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا. اوپر کی سیڑھی جس چوکور سطح پر ختم ہوتی تھی وہ بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتی تھی. وہاں ایک پرانا صوفہ پڑا تھا دو چار کرسیاں بے ترتیب رکھی تھیں. ان کے درمیان ایک چھوٹی سی میز بھی تھی جس کا پالش اڑ گیا تھا. ساجی کی لڑکیاں اندر کہیں چھپ کر بیٹھی ہوئی تھیں. شائد بڑی والی کچن میں تھی. کبھی کبھی اس کے بولنے کی آواز سنائی دے جاتی. درجات بات بات پر اندر جاتا اور پھر آ کر کھڑا ہو جاتا. وہ ایک بار بھی میز بان کی حیثیت سے ہمارے درمیان بیٹھا نہیں تھا. نصیب اور میں صوفے پر تھے اور سامنے والی کرسیوں پر سیفی اور کیفی بیٹھے تھے. ساجی بار بار انہیں دلار کر رہی تھی جس سے وہ اکتاہٹ محسوس کر رہے تھے. مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس بات کرنے کے لیئے کوئی موضوع نہیں تھا. آخر کھانا لگا تو میں نے سوچا کہ کم سے کم میں کھانے کی تعریف ضرور کروں گا.

کھانے میں زیادہ اہتمام نہیں تھا. مٹر پنیر کی سبزی.... مچھلی کا سالن زیرہ چاول اور دال مکھانی.....

مجھے مچھلی کھانے میں ہمیشہ کوفت ہوتی ہے. اب کانٹا کون نکالے؟ میں نے اپنی مشکل کا اظہار کیا تو درجات نے ایک پلیٹ میں مچھلی کا سالن لیا اور کانٹا نکال کر مجھے پروسا. میں نے محسوس کیا کہ نصیب کو درجات کا یہ عمل اچھا نہیں لگا.

میں نے کھانے کی تعریف کی.....

لیکن گڑ کھا کر پینڈی کڑوی ہو گئی.....

واقعہ ناگوار ہے. کھانا ختم ہوا تو ساجی نے نصیب کو نذرانہ پیش کیا. ....چوڑیاں... کپڑے اور سونے کا لاکٹ... کیفی اور سیفی کو بھی کپڑے دیئے.....! کہنے لگی کہ ہمارے یہاں کی ریت ہے... گھر سے وداع ہوتے وقت نذرانہ دیا جاتا ہے...!

لاکٹ دیکھ کر نصیب کے ماتھے پر بل پڑ گئے.....!

''آپ کیوں اتنا مجھ پر خرچ کر رہی ہیں۔۔؟''

''خرچ کی بات نہیں ہے۔ یہ تو وداعی کی رسم ہے.''

''معاف کیجیے گا... میں آپ کے گھر سے وداع نہیں ہو رہی ہوں. میں اپنے ہی گھر سے اپنے گھر جا رہی ہوں۔۔...'' نصیب کا لہجہ ترش ہو گیا

ساجی چپ ہو گئی. میں نے محسوس کیا کہ فضا میں تناؤ سا ہے۔

''میں چوڑیاں رکھ لیتی ہوں ...لیکن کپڑے اور لاکٹ نہیں لوں گی... یہ غلط ہے. آپ مجھ پر کیوں اتنا خرچ کریں گی۔....؟''

ساجی کچھ نہیں بولی. درجات بھی خاموش کھڑا دیکھتا رہا.

بہت بدمزگی لیئے ہم وہاں سے لوٹے. اپنے کمرے میں آ کر نصیب کا غصّہ پھٹ پڑا.

''یہ دو کوڑی کی عورت میری جگہ خود کو دیکھ رہی ہے.. اس دن مجھے دکھانے کے لیئے پکھراج والی لونگ پہن کر آ گئی. گھر میں کھانے کے لیئے نہیں ہے اور بیس ہزار کا لاکٹ گفٹ کر رہی ہے

احمق ہے.'' میں بھی بھلا برا کہنے لگا

''آج مجھے میرے ہی گھر سے وداعی دے رہی ہے. یہ آخر چاہتی کیا ہے؟''

''ایڈیٹ ہے کمبخت!''

''میاں کیسا بھڑوا ہے؟ کھڑا کھڑا ہونق کی طرح دیکھتا رہتا ہے. مجھے تو لگتا ہے یہ ایک دن اپنی بیوی کو آپ کے حوالے کر دے گا.''

مجھے دونوں ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں.'' میں ہنسنے لگا.

''مجھے ان کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی. آپ مکان خالی کیجیے.''

نصیب کا موڈ دیر تک خراب رہا. میں نے اسے یقین دلایا کہ مکان بدل لوں گا بلکہ یہاں سے تبادلہ ہی کرا لوں گا.

صبح ہم پٹنہ کے لیئے روانہ ہو رہے تھے. نصیب اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ گھر سے نکلتے وقت کوئی ناگوار بات ہو جائے تو سفر بھی خراب گذرتا ہے.. دونوں میاں بیوی الوداع کہنے نیچے آئے تو نصیب خوش دلی سے پیش آئی. ساجی کے چہرے پر خفّت کے آثار تھے. وہ مجھ سے آنکھیں چرا رہی تھی اور وہ گاودی تو ہمیشہ کی طرح چپ چاپ کھڑا تھا.

پٹنہ آ کر میں نے ایک ماہ کے لیئے چھٹّی بڑھادی.اکبر کو بھی بلوالیا.

مجھے حیرت ہوئی.....!یہاں مجھے کوئی کام نہیں تھا....پھر چھٹی کیوں بڑھائی...؟مقصد کیا تھا...؟کیا نصیب کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ لال گنج جانے سے میری دلچسپی نہیں ہے ...؟یا ساجی کو جتانا چاہتا تھا کہ میری اپنی مصروفیات ہیں.میں گھر کو ترجیح دیتا ہوں...؟

پھر بھی مجھے یہ سوچ کر لطف آیا کہ اس کو میرا انتظار ہوگا....وہ بے قرار ہوگی....؟اس کے پاس میرا پتہ نہیں تھا میں نے اپنا فون نمبر بھی اسے نہیں دیا تھا اور اکبر کو بھی بلوالیا تھا.وہ میری خیریت بھی کسی سے دریافت نہیں کر سکتی تھی نہ ہی مجھ تک کوئی پیغام پہنچا سکتی تھی.....

وہ کوفت میں مبتلا ہوگی کہ میں کہاں گم ہو گیا...؟

میں اعتراف کروں گا کہ یہ میری سادیت پسندی تھی کہ اسے کوفت میں مبتلا کر کے میں خوش ہو رہا تھا.چھٹی ختم ہونے سے ایک دن قبل میں نے اکبر کو بھیج دیا کہ گھر کی صفائی کرا کر رکھے.دوسرے دن میں شام تک وہاں پہنچا.بالکونی میں سنّاٹا تھا.اندر فلیٹ میں بھی کوئی سن گن نہیں تھی.میں نے اکبر سے اس بابت کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا.میں کبھی اس قسم کی بات اس سے کرتا بھی نہیں تھا .میں تھکا ہوا تھا.دو پیگ وہسکی لی اور کھانا کھا کر سو گیا.

دوسرے دن وہ صبح صبح چائے لے کر آئی.میز پر چائے رکھ کر وہ خاموشی سے بیٹھ گئی.اداسی اسکی آنکھوں سے صاف ظاہر تھی.....ہونٹ دائرہ نما ہو رہے تھے...نچلا حصہ اندر کی طرف ایک زرا بھینچا ہوا تھا.....ساری اداسی جیسے ہونٹوں کے خم میں آ کر ٹھیر گئی تھی.میں نے کوئی توجہ نہیں دی.بلکہ خشک رویہ اپنایا۔

''چائے میں نے پی لی ہے''

میں نے چائے نہیں پی تھی.اکبر سگریٹ لانے گیا ہوا تھا۔میں اس کا انتظار کر رہا تھا.

پھر پی لیجیے.''وہ آہستہ سے بولی اور ساری کا پلّو مروڑنے لگی

''نہیں!''میں نے اسی طرح خشک لہجے میں کہا.اور پھر یہ سوچے بغیر نہیں رہا کہ.کیا میں واقعئی ایسا ہوں...؟یہ سوانگ میں کیوں رچ رہا تھا۔

اس نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں زخمی پرندے کی سی تڑپ تھی....

''میں جانتی ہوں آپ میرے دوست نہیں ہو سکتے''.اس کے لہجے میں بلا کی حسرت تھی.اس کے ہونٹ ایک زرا خم لیئے کچھ اور سکڑ گئے.پلکوں پر آنسوؤں کا قطرہ لرز اٹھا...اور یہی چیز میری جبلّت کو ہوا دیتی ہے.اذیت میں سکڑے ہوئے ہونٹ...اور لرزتے آنسو...میں نے اسے بازوؤں میں بھینچا.....میرے نتھنوں میں اس کی سانسوں کی تیز بو سرائت کر گئی...وہی جنگلی گھاس کی مہک...مجھ پر جنون سا سوار ہو گیا...میں نے اسکے شانوں پر انگلیاں سختی سے گڑائیں.....وہ درد سے بلبلا اٹھی.....میں اسے بازوؤں میں دبوچے بستر تک آیا.اس کی آنکھیں بند تھیں...آنسوں کا قطرہ ڈھلک کر رخسار پر ٹھیر گیا تھا.ہونٹ وا ہو گئے تھے اور جسم پر لرزہ طاری تھا۔

.میری وحشت بڑھ گئی اس کے ہونٹوں پر میں نے اس شدّت سے اپنے ہونٹ ثبت کیئے کہ وہ کراہ اٹھی۔۔۔ہونٹوں کا نچلا کنارہ زخمی ہو گیا اور خون کی ایک پتلی سی لکیر ابھر آئی۔میری زبان پر نمک کا زائقہ رینگ گیا....اسی وقت سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ....میں اسے چھوڑ کر ہٹ گیا۔وہ اب بھی کانپ رہی تھی.

ایک بار اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کاری ڈور میں چلی گئی.

اکبر ہی تھا.میں نے اسے کینہ توز نظروں سے دیکھا.وہ خالی ہاتھ آیا تھا.جب اس نے کہا کہ سگریٹ کی دکان بند تھی تو میرا غصّہ ابل پڑا..

میں زور سے چیخا.''آگے کیوں نہیں بڑھ گیا حرام زادہ...؟''

اکبر گھبرا کر نیچے اتر گیا.

اس کے جانے کے بعد بھی میرا غصّہ کم نہیں ہوا.میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا.کمبخت کو اسی وقت آنا تھا.وہ دوسری بار مخل ہوا تھا..

میں اس دن سویرے ہی دفتر چلا گیا.مجھے اپنے روّیے پر افسوس ہو رہا تھا.میں نے ساجی کے ساتھ زیادتی کی تھی.مجھے حیرت تھی کہ کبھی کبھی مجھے کیا ہو جاتا ہے؟میں شام کو دفتر سے لوٹا تو فلیٹ میں کوئی چہل پہل نہیں تھی.

رات دس بجے اکبر نیچے سونے گیا تو میری آنکھیں روشن دان پر ٹک گئیں....لیکن وہاں سنّاٹا تھا.

صبح رینو پوچھنے آئی کہ میں چائے پیوں گا یا نہیں.میں نے خوش دلی سے کہا کہ کل نہیں پی تھی.اس لیئے آج دو پیالی چائے پیوں گا...

مجھے امید تھی کہ چائے لے کر وہ خود آئے گی.اور وہ آئی.اسے دیکھتے ہی میں نے معذرت طلب کی۔۔

''کل کے روّیے پر میں نادم ہوں''۔

''میں صرف دوستی چاہتی ہوں.''اس نے وہی راگ الاپا

''میں کب دشمنی چاہتا ہوں؟''میں بھی مسکرایا.

''آپ حد سے گذرنا چاہتے ہیں.لیکن میں شادی شدہ ہوں.'

''شادی شدہ تو میں بھی ہوں.''

''ہم دوست بن کر ہی رہ سکتے ہیں.''

''دوستی اگر دل سے ہو تو اس میں جسم بھی شامل ہو جاتا ہے.'

وہ خاموش رہی.

''جسم کے خلوص سے بڑھ کر کوئی خلوص نہیں ہے.''

وہ کرسی کے ہتّھے پر انگلی سے آڑی ترچھی سی لکیریں کھینچ رہی تھی.مجھے لگا وہ شش و پنج میں ہے.

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے دبایا.''وعدہ کرتا ہوں ساتھ نبھاؤں گا.''

اس نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا.میں نے اس کو چہرے کا کٹورہ سا بنایا اور پلکیں چوم لیں۔

تم میری ہو....''میں جذباتی ہو رہا تھا.

اس طرح نہیں.'' وہ بھی جذباتی لہجے میں بولی

''پھر کس طرح....؟''

اس طرح مجھے گناہ کا احساس ہونے لگتا ہے. میں شادی شدہ ہوں.''

''پھر کیا کروں....؟''

''مجھے سیندور لگاؤ''

سیندور....: میں نے چونک کر اس کو دیکھا

وہ سنجیدہ تھی.

''بھگوان کو حاضر ناظر جان کر مجھے سیندور لگاؤ۔ تب میں تمہاری ہو سکتی ہوں.''

میں خاموش رہا.

سیندور دان کے بعد مجھے پاپ بودھ نہیں ہوگا۔ میں خود کو دروپدی سمجھوں گی؛''

میں مسکرایا.''کہاں ہے سیندور....؟''

''رات دس بجے میرے کمرے میں آنا....''

وہ چلی گئی. میں نے گدگدی سی محسوس کی.....وقت مناسب تھا... اکبر بھی نیچے چلا جائے گا.....لڑکیاں بھی کھا پی کر سو رہی ہونگی.

یعنی آج کی رات وصل کی رات تھی.

میں نے سارا دن بے قراری میں گذارا. شام ہوئی تو میری بے چینی بڑھ گئی. ایک انجانہ سا خوف بھی محسوس ہو رہا تھا. عمر کے اس حصّے میں اس قسم کے تعلقات....؟ بات کبھی تو طشت از بام ہوگی..نصیب پر کیا اثر ہوگا.؟

کیا کہتے ہیں ٹیرو کے پتّے.....؟

میں نے ذہن کو ایک نقطے پر مرکوز کیا. ٹیرو کی گڈّی ہاتھ میں لی. سائل کی نمائندگی کے لیئے میجر آرکین سے لورز کارڈ کا انتخاب کیا. گڈّی پھینٹی اور پتّے پھیلائے .... مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہوا آخری پتّہ بھی میجر آرکین سے تھا...دی ڈیول....! میں ڈیول کی معنویت پر غور کرنے پر مجبور ہوا...کیا محبت اپنے پہلو میں شیطان بھی رکھتی ہے....؟

رات کے دس بج گئے. اکبر نیچے سونے چلا گیا. اس کے فلیٹ میں مکمّل خاموشی تھی اور میری نگاہیں روشن دان پر ٹکی تھیں. ساڑھے دس بج گئے لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں تھا. شائد سو گئی ہو...؟ مجھے یاد آیا. اس نے بتایا تھا کہ بہت تناؤ میں اسے نیند آجاتی ہے. وہ یقیناً تناؤ میں ہوگی اور اب نیند میں ہے...! میں باہر آیا. سیڑھی کے پاس کا صدر دروازہ بند تھا. میں نے چاہا دستک دوں....لیکن پھر سوچا مصلحت اسی میں ہے کہ خاموش رہوں.....یہ بات چبھ رہی تھی کہ اس نے مجھے دس بجے کمرے میں آنے کے لیئے کہا تھا اور خود چین کی نیند سو رہی تھی اور میں ماہی بے آب ہو رہا تھا.....صبح اس سے سمجھ لوں گا.....میں نے غصّے میں دروازہ بند کیا اور کمرے میں آکر سگریٹ سلگائی اور روشن دان کی طرف دیکھتے ہوئے دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا...وہ اب نہیں آئے گی.....سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے میں نے سوچا اور روشنی گل کرنے کے لیئے آگے بڑھا لیکن پھر رک گیا. سوئچ بورڈ کے قریب کرسی رکھی تھی. وہاں سے کرسی اٹھا کر روشن دان کے نیچے رکھا اور اس پر چڑھ کر پرے جھانکنے کی کوشش کی. وہاں اندھیرا تھا. یہاں تک کہ سیڑھی کی دیوار تک نظر نہیں آرہی تھی. اور مجھ کو اپنی حماقت پر غصّہ آگیا خود کو ملامت کرتے ہوئے کرسی سے نیچے اترا روشنی گل کی لیکن بستر پر لیٹنے کے بجائے میں نے دوسری سگریٹ سلگائی آخر کیوں نہیں آئی....؟ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا. سوا گیارہ بجے تھے....ابھی وقت ہے...وہ آدھی رات کے قریب آئیگی...اور اگر نہیں آئی تو....؟ اور اگر آگئی تو....؟ میں مسکرایا اور سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر آنگن میں آیا. گرد سے اٹے آسمان میں ستارے دور دور تک نہیں تھے. تنہا چاند آسمان کے وسط میں لہک رہا تھا.....اگر آگئی تو بھری چاندنی میں.....اچانک کلک کی آواز ابھری....اس کے کمرے میں روشنی ہوئی تھی۔ میں کمرے میں آیا اور روشن دان پر نظر کی.....ہیرے سی اگلتی آنکھیں.....میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی.

کاری ڈور میں چٹخنی گرنے کی آواز آئی.....میں نے دروازہ کھولا اور حیران رہ گیا.....وہ سج دھج کر کھڑی تھی.....بنارسی ساری میں ملبوس۔۔۔زیور سے لدی ہوئی.....ایک دلہن کی طرح.....میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا. وہ خاموش کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے؟''

وہ چپ رہی۔

''اس روپ میں...؟ کہیں پارٹی سے آرہی ہو؟''

وہ پھر بھی خاموش رہی ۔ میں مسکرایا اور اس کے نیکلس پر انگلی پھیری۔

''اس طرح سج دھج کر...؟''

اس نے ایک بار پلکیں اٹھا کر دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

''بتاؤ نہ کیا بات ہے؟ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوے نرمی سے پوچھا۔

اس نے مجھے اپنے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ میں پیچھے پیچھے اس کے کمرے میں آیا۔ کمرے میں مدھم روشنی تھی ۔ بستر پر نئی چادر بچھی ہوئی تھی۔ کمرے میں آکر وہ بھی خاموش تھی ۔ اور مجھے سب کچھ پراسرار معلوم ہوا۔ وہ بس مجھے تکے جا رہی تھی ۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ کسی الجھن میں مبتلا ہے۔ تب میں نے اس کے چہرے کا دونوں ہاتھوں سے کٹورہ سا بنایا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''خوب صورت لگ رہی ہو۔''

اس نے پلکیں جھکا لیں اور رندھے ہوے گلے سے بولی۔

''مجھے سیندور لگاؤ۔''

''سیندور۔۔؟''

میں مسکرایا...۔''اتنی سی بات...؟''

''اتنی سی بات....؟تم اسے اتنی سی بات کہتے ہو؟''وہ تقریباًرو پڑی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی اور آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔اس فیصلے تک پہنچنے میں وہ یقیناً کرب سے گذر رہی ہوگی۔مجھے اس کی خود فریبی پر ترس آرہا تھا.میں سوچے بغیر نہیں رہا کہ یہ عورت یا تو انتہائی چالاک ہے یا بالکل بیوقوف۔سیندور کے بہانے وہ مجھے متاثر کرنا چاہ رہی ہے کہ اس کے جذبات سچے ہیں لیکن ایک عدد شوہر والی عورت کے لیئے سیندور دان کیا معنی رکھتا ہے۔؟ کیا اس کے بعد وہ گناہ سے بری ہوجائیگی؟لیکن میری سوچ غلط بھی ہوسکتی ہے۔میں کیوں بھول جاتا ہوں کہ میں کمار ہوں۔صدیوں سے اس کی روح کی پنہائیوں میں بسا ہوا کمار جو آج اچانک سامنے آگیا ہے۔اسے وہ کسی قیمت پر نہیں کھو سکتی۔اسے حاصل کرنے کے لیئے وہ کسی بھی حد تک جاسکتی ہے۔مجھے اس سے عجیب سی ہمدردی محسوس ہوئی۔ٹھوڑی پکڑ کر میں نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

''جانِ من!بتاؤ کہاں ہے سیندور۔''؟

اس نے طاق کی طرف اشارہ کیا.طاق میں بھگوان شیو کی چھوٹی سی مورتی رکھی ہوئی تھی.وہاں پر سیندور کی ایک ڈبیہ بھی پڑی تھی.

''بھگوان کو حاضر ناظر جان کر مجھے سیندور لگاؤ۔''

میں نے سیندور کی ڈبیا اٹھالی۔

''چلو صحن میں کھلے آسمان کے نیچے سیندور دان کرتا ہوں۔''

''نہیں.یہاں....بھگوان کے سامنے؛''

''بھگوان تو ہر جگہ ہے.کہیں بھی لگائیں کیا فرق پڑتا ہے؟''

وہ خاموش رہی۔اس کا ہاتھ پکڑ کر میں اسے صحن میں لایا۔چاند آسمان کے وسط میں لہک رہا تھا۔مجھے یاد آگیا پہلو نرودا نے چاند کو گواہ بنا کر شادی کی تھی.

ہم چاند کو گواہ بنائینگے''،میں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا.

''.چاند ازل سے پیار کرنے والوں کے ساتھ ہے.''

اس نے چاند کی طرف دیکھا

میں نے اس کی پلکیں چومیں.''آؤ....ہم بھی عہد کریں اور چاند کو اپنا گواہ بنائیں.''

میں نے آسمان کی طرف دونوں ہاتھ پھیلائے.''اے چاند...!تو گواہ ہے.میں اس عورت کو اپناتا ہوں....!''اور میں نے چٹکی بھر سیندور اس کی مانگ میں بھر دی.۔...اس کی آنکھیں چھلک پڑیں.

''میں تو دروپدی ہوگئی.''

اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا.

مجھے احساس ہوا کہ میری وحشت کہیں کافور ہوچکی ہے.....چند لمحے پہلے میں جس آگ میں جھلس رہا تھا اس کی آنچ تک باقی نہیں تھی وہ میرے سینے سے لگی کانپ رہی تھی اور میں سر دکھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی وہ احساس گناہ میں مبتلا تھی اور اب دروپدی ہوگئی....؟لیکن وہ دروپدی نہیں ہوسکتی.دروپدی ایک بہادر عورت تھی اس نے مرد کی جارحیت کے خلاف جنگ کی تھی لیکن اس نے میری جارحیت کو گلے لگایا تھا...اور خود چل کر میرے پاس آئی تھی....پاں بجولا...طلائی زنجیروں میں لپٹی ہوئی...یہ زیور نہیں تھے جن سے وہ لدی ہوئی تھی...یہ زنجیریں تھیں جن میں وہ جکڑی ہوئی تھی....نکلس...چق...کنگن...جھمکے..لونگ...پائل...یہ بیڑیاں ہیں جنہیں عورت مرد کی غلامی میں خوشی سے قبول کرتی ہے..مرد کی فطرت میں ہے غلام بنانا اور عورت کی فطرت میں ہے غلام ہونا۔غلامی کے بیج عورت کے اجتماعی شعور میں پنہاں ہیں۔وہ کبھی بھی مرد کی بالادستی سے آزاد نہیں ہوسکتی۔

میں اسے بازوؤں میں لیئے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا۔گلے میں نکلس چمک رہا تھا۔جگہ جگہ سرخ نگینے جڑے ہوے تھے۔میں اسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔

''کیا دیکھ رہے ہو...؟''اس نے اپنے بازو میری گردن میں حمائل کردیئے۔میں خاموش رہا۔

''تم مجھے مل گئے ہو.....مجھے کچھ اور نہیں چاہیئے۔''وہ میری گود میں اور سمٹ گئی۔

میں اس پر جھکا.........

اس نے دونوں ہاتھ چھاتیوں پر باندھ لیئے اور آنکھیں بند کرلیں۔میں نے محسوس کیا کہ اس کی چھاتیاں ابھی بہت سوکھی نہیں ہیں۔۔چاند آسمان کے اور وسط میں آگیا تھا.ہر طرف گہری خاموشی تھی..چاند کی کرنیں اس کے نیم برہنہ جسم سے لپٹ رہی تھیں.اس کا گندمی رنگ مٹ میلی چاندنی میں اور بھی گندمی ہوگیا تھا...گلے میں زیور کی چمک بڑھ گئی تھی۔نکلس کے سرخ نگینوں سے چینگاریاں سی پھوٹتی محسوس ہورہی تھیں۔میں نے بے اختیار نکلس پر ہاتھ پھیرا.مجھے عجیب سی تپش کا احساس ہوا.میں نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھا۔مجھے لگا چاند آگ برسا رہا ہے اور اس کا سارا وجود جیسے چاندنی میں تپ رہا ہے۔

اور مجھے اسی جنگلی گھاس کی سی مہک کا احساس ہوا......یہ اس کی سانسوں میں نہیں تھی۔یہ جسم کے مساموں سے پھوٹ رہی تھی اور میری سانسوں میں گھل رہی تھی۔میں نے آہستہ سے اس کے رخساروں کو ہونٹوں سے برش کیا۔اس کے لب ور خسار آگ میں دہک رہے تھے اور مجھ پر نشہ سا طاری ہورہا تھا۔اچانک وہ میری طرف متحرک ہوئی تھی اور پھر میرے کان کی لوؤں کو اپنے دانتوں میں آہستہ سے دبایا تو ایک پر اسرار سی بُو میرے نتھنوں میں سرائت کرگئی۔میں نے سہرن سی محسوس کی۔مجھے لگا بھری تپش میں میں چیڑھ کے درختوں سے ہو کر گذر رہا ہوں......وہ سرگوشیوں میں کچھ بولی جو میں سن نہ سکا...۔اس کی آواز خواب میں کہیں پکارتی سی محسوس ہوئی۔میں نے آنکھیں کھولیں۔ایک نظر اس کو دیکھا۔چاندنی میں دہکتا ہوا اس کا نیم برہنہ جیسم بہت پر اسرار معلوم ہورہا تھا۔اور تب اس کو پوری طرح برہنہ دیکھنے کی خواہش نے انگڑائی لی۔چاند کی روشنی میں زنجیروں سے آراستہ ایک عورت کا برہنہ جسم.....

باقی صفحہ آخر پر ملاحظہ کیجیے

''ہفت افلاک''

''آسماں رویا''

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

آسماں رویا، بہت بارش ہوئی
بادلوں نے ماتمی ملبوس میں
سینہ کوبی ایسی، اور اتنی زیادہ کی
کہ ہفت افلاک گریاں ہو گئے
گوشہ گوشہ
سب زمین و آسماں
لرزاں ہوئے
ارض مادر کا کلیجہ شق ہوا

ندی، نالے اور دریا
ساحلوں، بندوں کو
اپنی سرحدوں کو توڑنے میں لگ گئے
سیلاب آئے

عورتیں اور بوڑھے بچے بھی تھے شامل
ریلیوں اور دھرنوں میں۔۔ مجنونوں کے ساتھ
جو گھروں کو چھوڑ کر
سنگ بستہ آہنی دیوار و در کے سامنے
بھوکے ننگے جبر و استحصال کے ماروں کی خاطر
شور و واویلہ مچانے، سر اٹھانے آئے تھے
بے ضمیروں کو جگانے آئے تھے

سنگ بستہ آہنی دیوار و در
لوٹنے والوں کے ساتھ
اپنی دیرینہ وفاداری لئے
ریلیوں، دھرنوں کے دیوانوں پر کھڑے
ہنستے رہے
آسماں رویا، بہت بارش ہوئی

نئے مسیحاؤں کے نام

غالب عرفان
(کراچی)

نئے مسیحا!
تمہیں مبارک ہو، اپنے تکمیلِ علم و فن کی یہ کامرانی
یہ سرفرازی یہ شادمانی!
خدائے برتر کی مہربانی، تمہاری محنت، تمہاری شہرت
تمہاری زندہ دلی کے صدقے!
تمہیں تمہارے نئے سفر کی حسین راہیں سلام کہتی ہیں
زندگی کا، چلن تو دیکھو! محبتوں کے نئے مناظر
تمہاری امید پر نے جانے کہاں کہاں منتظر کھڑے ہیں
تمہارے قدموں کو تک رہے ہیں
تمہارے دستِ شفا میں پنہاں حیات نو کو
ترس رہے ہیں، یہ کہہ رہے ہیں،
اے جسم و جاں کی اذیتوں کو شفا کی تسکین
دینے والے نئے مسیحا!
نئے زمانے کی ابتدا میں، نئی فضاؤں کی لاج رکھنا
خلوص اپنا مزاج رکھنا۔ جو ہو سکے تو سسکتی روحوں
کے روگ کا بھی علاج رکھنا!
ہماری آئندہ نسل کا ذہن صاف رکھنا
کہ تم سے وابستہ نوعِ انساں کی زندگی ہے!
بقائے تہذیب آگہی ہے
تمہی سے زندہ ہر ایک چہرے کی روشنی ہے
تمہی سے مُردہ دلوں میں
تازہ لہو کی ترسیل ہو سکے گی
فضا یہ تبدیل ہو سکے گی
تمہی سے انسانیت کی تکمیل ہو سکے گی!

○

''مغربی فضاؤں میں''

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

تلاش میں رہا مسلسل، نہ ہاتھ لگے
وہ لمحے جو تیری روح کو تسکین ملے
آماجگاہِ محبت میں ہے چھایا سنّاٹا
اسمیں جھانک کر دیکھوں تو دلمیں ہول پڑے
بات تو دل کی ہے جنّتی ماحول سہی
کوئی ساتھ نہو تو جنّت اچھی نہ لگے
یار جب ساتھ میں ہو، جنگل میں بھی منگل ہو
اپنا ہو کے بھی اپنا نہو، تو جی کیسے لگے
زندگی دوڑتی ہے یاں ،مگر تنہا تنہا
گھر سے نکلے تو خاموشی کے جہاں میں اُترے
مغربی فضاؤں میں گھِرا ہوا ہوں ہمدم
مشرقی ماحول کے ہوتے ہیں اپنے مزے
وہ خوش گپیاں ، میل جول ملاقاتیں!
مشرقی سوغاتوں کے لیے پل پل ترسے
اپنے حال میں ہرکوئی یہاں مست الست
یار بھی کوئی نہیں کہ دل کی بات چلے
شہرِ خوباں ہے، جذبۂ شوق وجنوں مفقود
کسکو فرصت ہے یہاں! پیار سے بات کرے
اس خرابے میں ایدوست کہاں ہے ممکن
اپنے دل کی کہے، درد اپنا کسی سے بانٹے
تندرستی ہزار نعمت سہی، مگر یہ بھی سچ ہے
دورِ پیری، بہتر ہے کہ سنبھل کے چلے
تشنگی تو نہیں، سیرابی بھی نہیں ایسی
کسطرح تشنہ یہاں منچلے اشعار کہے

○

''حرفِ حیات''

صفوت علی صفوت
(امریکہ)

یہ جو اپنے ساقی کا ظرف ہے
یہ جو مہکی مہکی سی برف ہے
مجھے اِس نے پینا سکھادیا
میں حقیر ذرّہ تھا معدنی
مری موت بن گئی چاندنی
مجھے ایک شجر پھر بنادیا۔
مِری زندگی اک شجر کی تھی
وہی موت اِس بے ضرر کی تھی
مجھے اک پرندہ بنادیا۔
تو میں آسماں کو اُڑا تھا پھر
میں فرشتگی سے جُڑا تھا پھر
وہی موت آئی تو کیا ہوا
مجھے ایک انساں بنادیا۔
مجھے اب نہ فکرِ ممات ہے
کہ یہاں سے آگے جو بات ہے
وہ جو ایک اُسکی جو ذات ہے
کہ جہاں پہ حرفِ حیات ہے
مجھے اُس کا حصّہ بنادیا۔

○

لے روزیٹا (Rosetta) خلائی جہاز
مولانا جلال الدین رومیؒ۔ منازلِ ارتقاع

مٹّی پاؤ

جاوید زیدی (امریکہ)

مٹی پاؤ
بھُولتے جاؤ
بھُولتے جاؤ
بھُولتے جاؤ
خوشی کے موتی
رولتے جاؤ
غم پگڈنڈی کو
چھوڑتے جاؤ
مقتل میں بھی
جھومتے جاؤ
گاتے جاؤ
جھومتے جاؤ
چاک گریباں دیکھنے والوں
اپنا دامن سیتے جاؤ
اپنی اپنی سانس کا حصّہ
اپنے اپنے پاس ہی رکھّو
مثبت پہلو زیست کا یہ ہے
ہر عالم میں آس ہی رکھو
گِرتے ہوئے کو تم یوں سنبھالو
بندوں کو بس گلے لگالو
خُدا کو دل کے پاس بلالو
اپنے گنہ کا بوجھ اٹھالو
دل نگری میں شور مچاؤ
روز فتح کا جشن مناؤ
ہر موسم کا مزا اٹھاؤ
جب تک سانس کا دفتر باقی
ہر غم کی تم کردو چھٹی
زیدی ہو یا تم ہو بھٹّی
مٹی پاؤ بھُولتے جاؤ
مقتل میں بھی جھومتے جاؤ

بوڑھے سامری

عظمیٰ صدیقی (لندن)

ہاں میں بے ادب ہوں
اور مجھ کو پاسِ ادب ہی نہیں ہے
کہ میں کسی بھی شعبدہ گر سامری کو
سلام تعظیم و توقیر بھیجوں
جو منظر کہیں پر بھی موجود نہ ہو
اُس منظر کی جھوٹی تصویر بھیجوں
مجھے بوڑھے، عیار، ظالموں کے
جھوٹی عزت کے مرقدوں پر
اپنی عقیدت کے پھول چڑھانے کی
کوئی بھی حاجت، کوئی ضرورت
نہ محسوس تھی نہ محسوس ہوگی
ہاں میں بے ادب ہوں
اور مجھ کو پاسِ ادب ہی نہیں ہے
کہ میں نے عزت و توقیر کے پیمانۂ بے قدر کو
کبھی بھی قدر کی نظر سے نہ دیکھا
اِس عمرِ ذیاں کے سفر سے نہ دیکھا
طویل اس سفر میں
یہ زندہ جسموں میں مردہ روحیں
میں اِن کی تعظیم کیسے کرلوں
میں اِن کو تسلیم کیسے کرلوں
یہ عمرِ رفتہ کا انبار لے کر
شب و روز کی ڈھیریوں سے اپنی
قد و قامتِ توقیر ناپتے ہیں
کہ جن کی بے راہ روی کے چلن سے
ہم انساں تو کیا شیاطیں کانپتے ہیں

○

رحم کر اہلِ فلسطین پر خدا!

ڈاکٹر انیس الرحمٰن
(سکھر)

اے فلسطین، سرزمینِ انبیاء
پھر بپا ہے آج تجھ پر کربلا
پھر مسلماں خون میں لتھڑے ہوئے
زندگی ان کے لیے پھر ابتلا
پھر یہودی فوج کی غارت گری!
آگ کے شعلوں نے گھیرا پھر غزا
پھول سے بچوں کے چھلنی ہیں بدن
مانگتی ہیں مائیں سب سے حوصلہ
ہر طرف بہتا شہیدوں کا لہو
کہہ رہا ہے داستانِ اشقیا

☆

سو رہا ہے ساری دنیا کا ضمیر!!
سو رہی ہے ساری ہی خلقِ خدا!!!
ہیں کہاں سب امنِ عالم کے نقیب؟
ہیں کہاں مردانِ حق، صدق ووفا
سر بریدہ جابہ جا لاشے پڑے
دے رہے ہیں اپنی ملّت کو صدا

☆

سچ یہی ہے بس! یہودی سوچ نے
گلشنِ انسانیت جھلسا دیا

☆

کوئی تو نکلے بچانے اب غزا!
کوئی تو دے ظالموں کو اب سزا
عرض کرتا ہے انیسؔ بے نوا!!!
رحم کر اہلِ فلسطین پر خدا!

○

''حالیہ سیلاب کے تناظر میں قطعات''

اسدا عوان (جھنگ)

جس جگہ سے بھی سبک پائی سے پانی گزرا
چھوڑ کر اپنی رعونت کی کہانی گزرا
ان گنت شہروں کو مسمار کیا ہے اِس نے
بستی بستی کی مٹا کر یہ نشانی گزرا

راجدھانی ہے نہ شاہی ہے خدا خیر کرے
یہ قیامت کی گواہی ہے خدا خیر کرے
اِس طرف سے بھی کہیں گزرا ہے سیلاب کوئی
دور تک کیسی تباہی ہے خدا خیر کرے

سامنا ہم کو جو پانی کا ہوا
رنج دریا کی روانی کا ہُوا
گھر تو اپنے تھے سبھی کے لیکن
دُکھ ہمیں نقل مکانی کا ہُوا

مری جوانی جوانیوں میں گھری ہوئی ہے
یہ ایک بستی ہے پانیوں میں گھری ہُوئی ہے
ترا فسانہ کھُلا ہُوا ہے زمانے بھر میں
مری حقیقت کہانیوں میں گھری ہُوئی ہے

دھوپ میں چھاؤں سے نکل آئے
مہ جبیں گاؤں سے نکل آئے
تیری آنکھوں میں ڈوبنے والے
آج دریاؤں سے نکل آئے

زمیں پہ جیسے ترے ہفت آسماں گرے
کچھ اس طرح سے غریبوں کے ہیں مکان گرے
چہارسمت سے پانی دکھائی دیتا ہے
چہارسمت امیدوں کے سائبان گرے

○

''قرطاس وقلم کا قیدی''

رئیس الدین رئیس
(علی گڑھ، بھارت)

شہرت ومقبولیت کی دیوی کسی کے سر پہ شہرت وشہامت کا تاج یونہی نہیں رکھ دیتی وہ انسان کو پہلے جدّ وجہد اور عملِ پیہم کے سُلگتے جھلستے صحراؤں کی تپتی ریت پر پیدل دوڑاتی ہے۔ اگر وہ عاشق مزاج ہو تو اُس کے ہاتھ میں تیشہ تھما کر جوئے شیر نکالنے کے لیے اُسے سنگلاخ زمینوں کی کھدائی کے اُمور پر مامور کر دیتی ہے اور اگر ملک کی آزادی کسی کا خواب ہو تو اُسے بغاوت پر اکسا کر اور ستونِ دار پر لٹکوا کر شہیدِ اعظم کے خطاب سے سرفراز کر دیتی ہے۔ اسی طرح ترقی کا خواہاں اگر کوئی شاعر یا ادیب ہوتا ہے تو یہ اُسے قلم وقرطاس کا قیدی بنا کر اور مسلسل غور وفکر کی عادت سے اُس کا آرام وسکون چھین کر اُسے فطری مسرتوں سے دُور کر دیتی ہے۔ اور اس طرح جب کوئی فنکار ساری دنیا کو بالائے طاق رکھ کر مجنونانہ طور پر اپنے پورے وجود کے ساتھ صرف ایک ہی شغل یا ایک ہی فن سے وابستہ ہو کر رہ جاتا ہے تو کامیابی ترقی اور شہرت ومقبولیت خود بخود اس کے گلے کا ہار ہو جاتی ہیں۔

یہ بات میں نے ڈاکٹر مظفر حنفی کی ادب کے آگے مکمّل خود سپردگی کو پیش نگاہ رکھ کر ہی کہنے کی جسارت کی ہے۔ ان کا پچاسیوں کتابوں کا مصنف و مؤلف ہونا بذات خود اس صداقت کی پختہ دلیل ہے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی قلم وقرطاس کے ساتھ جی کر ہی ادبی سرمائے کی یہ گھنی فصل کاٹی ہے اور آج جو عالمگیر ناموری اور شہرت ومقبولیت انہیں حاصل ہے وہ اُن کے اسی تپاک اور قربانی کا نتیجہ ہے۔ اپنے استاد شادؔ عارفی سے ان کی وفاداری نے بھی انہیں خوب آزمایا اور وہ اس آزمائش میں بھی کھرے ثابت ہوئے۔ استاد کی کلیات کی ترتیب وتدوین کے علاوہ ان پر ایک نہ دو بلکہ نو کتابیں منظر عام پر لانا اور مختلف رسائل وجرائد میں استاذی پر گوشے شائع کرانا استاد سے اُن کی گہری عقیدت کا شاخسانہ نہیں تو اور کیا ہے۔ شاد عارفی معاشی اعتبار سے بھلے ہی بدقسمت رہے ہوں لیکن اس معاملے میں شاید ہی کوئی ایسا خوش قسمت ہوگا جیسے خوش نصیب شاد عارفی ہیں کہ انہیں ڈاکٹر مظفر حنفی جیسا شریف اور وفادار شاگرد ملا ہے۔

آج جب کہ گرسنی میں ان کی صحت جواب دے چکی ہے اور مطالعے سے آنکھوں پر زور پڑتا ہے۔ ایسے نازک وقت میں خدا کا شکر ہے کہ ان کے صاحبزادے جناب فیروز منظر اُن کی ڈھال بن گئے ہیں اور باپ کی زیر نگہداشت انہوں نے کتابیں ترتیب دے کر اُن کی کتابت وطباعت اور اشاعت کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اُٹھالی ہے۔ حال ہی میں انہوں نے ڈاکٹر مظفر حنفی کی شخصیت اور اُن کے فکر وفن پر لکھے گئے مضامین پر مبنی ایک ضخیم وجسیم اور گرانقدر کتاب منظر عام پر لا کر دنیائے ادب سے بھرپور داد وتحسین وصول کی ہے۔

اور اب موصوف بطور مدون شاد عارفی کی شخصیت اور اُن کے فکر وفن کو اُجاگر کرنے والے مضامین پر مبنی ایک اور اہم اور ضخیم وجسیم کتاب ''شاد عارفی۔ حیات وجہات'' بھی جلوہ گہہ آفاق پر طشت از بام کر چکے ہیں۔ چار سو چھپن صفحات کو محیط یہ کتاب جس کے حسین ورنگین سرورق پر شاد عارفی کی تصویر چسپاں ہے پختہ جلد قیمتی کاغذ روشن کتابت وطباعت اور حسنِ ترتیب وتزئین سے آراستہ وپیراستہ ایک ایسی نظر افروز اور دلپذیر کتاب ہے جو شاد عارفی کی حیات اور اُن کی شعری جہات کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ کتاب حیات، جہات اور تاثرات جیسے تین ابواب میں منقسم ہے۔ حیات کے تحت محشر عنایتی، ابرؔ احسن گنوری، خلیل الرحمٰن اعظمی اور عروج زیدی جیسے دس مشاہیر ادب نے ان کے اقوال وکوائف ان کی معاشی ابتری، مزاج ومنہاج اور اطوار وعادات کا بخوبی محاسبہ ومحاکمہ کیا ہے۔ ان سب کی تحاریر سے ان کی شخصیت کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔ سبھی قلمکار اس بات پر ایک رائے اور متفق ہیں کہ شادؔ ایک سادہ دل، معصوم، بھولے بھالے، بے ریا، سیدھے سچے اور بیباک انسان تھے۔ سادہ دل وہ اس معنی میں تھے کہ اگر کوئی اُن سے کسی کی بُرائی کرتا تو وہ یہ جانے بغیر کہ جس کی بُرائی کی جا رہی وہ ان کا دوست ہے یا دشمن جھٹ بُرائی کرنے والے کی بات کی تائید وتوثیق کر دیتے۔ بقول محشر عنایتی۔۔۔ ایک دن محشرؔ سائیکل پر سوار ان کے گھر کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ دروازے پر کھڑے شادؔ نے انہیں آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد محشرؔ وہاں سے چلے گئے اور پھر جب واپس آئے تب بھی شادؔ دروازے پر کھڑے تھے۔ محشرؔ نے اُن کے دروازے پر سائیکل روکی تو شاد نے اُنہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا اور بات کی تو جواب تک دینا گوارا نہ کیا۔ بعد میں جب کسی دوست سے انہوں نے شادؔ کے مزاج کی تبدیلی کا ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ کسی نے شادؔ سے یہ کہہ دیا تھا کہ پتہ بھی ہے آپ جس سے ہنس ہنس کر بات کر رہے تھے وہی کل آپ کے مطلع میں عیب نکال رہا تھا۔ غرض یہ کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر بچوں کی طرح بُرا مان کر بولنا چھوڑ دیتے اور پھر جیسے ہی دل سے غبار چھٹتا وہ اس طرح ہنس ہنس کر باتیں کرنا شروع کر دیتے جیسے کل کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی وہ خاموش طبع اور بند بند سے آدمی بھی نہ تھے۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں خوب لطیفے سناتے اور چہکتے یہاں تک کہ مغلظات اور گالی گلوچ سے بھی محفل میں لطف پیدا کر دیتے۔ جہاں تک معاشی بدحالی تنگ دستی اور فاقہ مستی کا تعلق ہے ان کی زندگی یاس یگانہ چنگیزی سے مشابہہ ہے مگر چنگیزی میں انانیت، نرگسیت اور خود پرستی کا مادّہ تھا جب کہ شادؔ نہایت غیور اور خوددار انسان تھے انہوں نے اپنی خود نمائی کے لیے کبھی اکابر اور مسلم الثبوت اساتذہ کو اپنی تنقید کا ہدف نہیں بنایا۔

باقی صفحہ ۱۱۳ پر ملاحظہ کیجیے

ایک صدی کا قصہ

پرتھوی راج کپور

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

چند سال قبل یوپی کے ایک گاوں کے ایک اسکول میں اُستاد اپنے طالب علموں کو کھڑا کر کے اُن سے تواریخ کے بارے میں سوال پوچھ رہا تھا۔ اُنہوں نے ایک لڑکے سے پوچھا کہ اکبر بادشاہ کون تھے تو بچے نے بے ساختہ جواب دیا۔ پرتھوی راج کپور۔ پرتھوی راج کپور نئی پود کا اکبر اعظم تھا۔ پرتھوی راج کپور جی کو انڈسٹری پاپا جی کے نام سے جانتی تھی۔ وہ فلم انڈسٹری کی اُن قد آور شخصیتوں میں سے ایک تھے جنہیں آج بھی ممبئی کی فلم نگری عزت و احترام کے ساتھ یاد کرتی ہے۔

پاپا جی 3 نومبر 1906 کو پشاور کے قصبے سمندری لائلپور کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے جو آج خیبر پختونوا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اُنکے والد کا نام دیوان بشیشور ناتھ کپور تھا جو کہ لائل پور پولیس میں سب انسپکٹر کے عہدے پر طعینات تھے۔ اُنکے دادا دیوان کیشومل کپور بھی سرکاری افسر تھے۔ وہ لائل پور کے تحصیلدار رہے تھے اور علاقے میں اُنکا کافی دبدبہ تھا۔ پاپا جی اپنے والد سے زیادہ اپنے دادا کے قریب رہے اور وہ اُن ہی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے رہے۔ اُنہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم لائلپور اور لاہور میں پوری کی۔ اپنی اسکولی تعلیم پوری کرنے کے بعد اُنہوں نے ایڈورڈ کالج پشاور میں داخلہ لیا۔ یہیں پر اُنکے اندر اداکاری کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ ابھی اُنہوں نے اپنی پڑھائی پوری بھی نہ کی تھی کہ اُنکے گھر والوں کو اُنکی شادی کرنے کا خیال آیا۔ اُنکا ایک چھوٹا بھائی تھا جس کا نام ترلوک کپور تھا۔ بہن کوئی نہیں تھی اسلئے بڑا بیٹا ہونے کے ناتے اُنکی شادی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اُنکی شادی رام سرنی مہرہ سے ہوئی جنکی عمر شادی کے وقت محض چودہ سال تھی۔

اسی بیچ اُنہوں نے اپنی گریجویشن پوری کی اور ایک سال کے لئے قانون کی پڑھائی بھی کی مگر وہ اپنی پڑھائی جاری نہ رکھ سکے۔ ایکٹنگ کا جنون اُن پر اسحد تک سوار ہو چکا تھا کہ اُنہوں نے اپنی تعلیم اپنے شوق کے تکمیل کی خاطر قربان کر دی۔ وہ اب باقاعدگی کے ساتھ اسٹیج ڈراموں میں حصہ لینے لگے۔ اس دوران اُنکے تین بچے ہوئے۔ سب سے بڑے راج کپور تھے۔ 1928 میں اپنی چاچی سے کچھ پیسے اُدھار لے کر، اور اپنے بال بچوں کو گھر والوں کے سہارے چھوڑ کر وہ اپنی قسمت آزمانے پشاور سے بمبئی کے لئے نکل پڑے۔ اُنہوں نے اپنی بیوی کو یقین دلایا کہ بمبئی میں پاوں جماتے ہی وہ اُنہیں بچوں کے ساتھ بلا لیں گے۔

بمبئی پہونچ کر اُنہوں نے امپیریل فلم کمپنی جوائن کر لی۔ یہاں پر اُنہیں چھوٹے موٹے رول ملنے لگے جسے عام اصطلاح میں اکسٹرا کہا جاتا ہے۔ ایک دو فلموں میں وہ ایک اکسٹرا کا رول کرتے رہے۔ اُنہیں لگا کہ وہ کبھی کلیدی رول حاصل نہیں کر پائیں گے حالانکہ وہ کافی وجیہہ اور قد آور شخص تھے۔ بہت جلد اُنکی مایوسی ایک حیرت انگیز خوشی میں بدل گئی جب اُنہیں 1929 میں فلم ''سینما گرل'' میں لیڈ رول کی پیشکش کی گئی۔ اس فلم کی ہیروئن ایرمیلین تھی جو کہ ہندوستان کی کالرا بو کہلائی جاتی تھی۔ یہ فلم 1930 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے ساتھ ہی اُنہوں نے نو خاموش فلموں میں کام کیا۔ اسی سال اُنہوں نے اپنی بیوی بچوں کو بمبئی بلا لیا۔ اُنکی بیگم چوتھی بار اُمید سے تھیں کہ اُنکی زندگی میں ایک ایسی دردناک گھٹنا گھٹی جو کہ بڑی دلدوز تھی۔ اُنکے دو بیٹے ایک ہفتے کے دوراں مر گئے۔ ایک ڈبل نمونیا کا شکار ہوا اور وہ اس سے نکل نہیں پایا اور اس موذی مرض نے اُسکی جان لے لی۔ دوسرے بچے نے غلطی سے چوہے مار دوائی کھا لی جس کے سبب اُس کی موت ہوئی۔ یہ دوہرا غم تھا جو اس خاندان کو ایک ساتھ بھگتنا پڑا۔ ایک طرف اُن پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا تو دوسری طرف خوشی کی نوید آ گئی۔ اُنہیں پہلی متکلم فلم ''عالم آرا'' میں ایک معاون کلاکار کے طور پر کام کرنے کی آفر ملی۔ یہ فلم 1931 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کی ریلیز کیساتھ ہی فلموں کی تقدیر ہی بدل گئی۔ خاموش فلموں کی جگہ بولتی فلموں نے لے لی۔ سینما دیکھنے کا مزہ دو بالا ہو گیا۔ لوگ پرچھائیوں کو باتیں کرتے دیکھ کر خوشی سے اُچھل پڑتے تھے۔

1934 میں اُنکی ایک اور فلم ''سیتا'' ریلیز ہوئی۔ اصل میں جس فلم سے پاپا جی کو مقبولیت ملی اور اُنکی اداکارانہ صلاحیتوں کو سراہا گیا وہ تھی فلم ''ودیاپتی'' جو کہ 1937 میں ریلیز ہوئی۔ اُسکے بعد جس فلم نے اُنکی شہرت میں چار چاند لگا دئے وہ تھی سہراب مودی کی فلم ''سکندر'' جس میں اُنہوں نے سکندر اعظم کا کردار اس خوبی سے ادا کیا تھا کہ فلمی نقاد بھی اُنکی قابلیت دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ اس میں سہراب مودی کے بالمقابل کام کر کے اُنہوں نے یہ ثابت کر کے دکھایا کہ وہ پیدائشی اداکار ہیں اور کسی بھی رول کو بڑی آسانی کے ساتھ نبھا سکتے ہیں۔

اس بیچ اُنکے یہاں دو اور بیٹے اور ایک بیٹی کا جنم ہوا تھا۔ بیٹے کا نام شمشیر راج یعنی شمی کپور بیٹی کا نام اومی اور چھوٹے کا نام ششی کپور تھا۔ راج کپور اپنے تین بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا۔ وہ بھی باپ ہی کے نقش قدم پر چل پڑا تھا۔ اُسنے پہلے تھیٹر سے شروعات کی بعد میں آوارہ گردی شروع کی۔ پاپا جی راج جی کی حرکتوں سے خوش نہ تھے اور ہمیشہ اُنہیں اُنکے مستقبل کی فکر ستاتی رہتی تھی کیونکہ راج جی کو پڑھائی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ بس مسخروں جیسی حرکتیں کرتے رہتے تھے۔

ایک دن پاپا جی نے اپنی پریشانی کا اظہار اپنے دوست مشہور ہدایت کار کیدار شرما سے کیا۔ کیدار جی پاپا جی سے بولے کہ وہ راج کو اُنکے پاس بھیج دیں۔ اُنہوں نے راج کپور کو کلیپر بوائے کی حثیت سے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ راج جی کی پرابلم یہ تھی کہ وہ کلیپ دینے سے پہلے کیمرہ کے لینس میں جھانک کر اپنے بالوں میں کھنگی کرتے تھے۔ جب وہ کلپ دیتے تھے تو اُنکی نگاہیں آرٹسٹ پر نہیں ہوتی تھیں بلکہ وہ

کیمرہ میں جھانکا کرتے تھے تا کہ اُنکی شکل کیمرہ میں قید ہو جائے۔ایک دن کیا ہوا کہ جب وہ کلپ دے رہے تھے تو بے خیالی میں ہیروئن کے بال کلپ بورڈ میں پھنس گئے اور وہ ایک چیخ مار کر کیمرہ کے سامنے سے ہٹ گئی۔ کیدار شرما جی کیمرہ کے پیچھے کھڑے تھے اور راج کپور کی ان ساری حرکتوں کو نوٹ کر رہے تھے۔ وہ طیش میں آکر آگے بڑھے اور اُنہوں نے راج کپور کو ایسا زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا کہ راج جی کو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ کیدار شرما جی نے اُسی وقت شوٹنگ پیک اپ کروالی۔

وہ رات بھر سو نہ سکے۔ کیدار شرما پاپا جی کے زیر بار تھے۔ سہگل صاحب سے ملوانے والے پاپا جی ہی تھے۔ اسکے علاوہ جب اُنکی مالی حالت ٹھیک نہ تھی تو پاپا جی دامے درمے سخنے شرما جی کی مدد کیا کرتے تھے۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ جب راج کپور نے اپنے والد کو یہ واقعہ سنایا ہوگا تو اُنکا ردِ عمل کیا رہا ہوگا۔ وہ صبح جب سیٹ پر آئے تو اُنکا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ نگاہیں دروازے پر ٹکی تھیں۔ اُنہیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ پرتھوی راج جی اپنے بیٹے کو لے کر اُنسے ملنے ضرور آجائیں گے۔ وہ کیسے اُنکا سامنا کر پائیں گے۔ وہ انہی خیالوں میں غلطاں و پیچاں تھے تبھی راج جی اپنے کھلنڈرے انداز سے اسٹوڈیو میں داخل ہوئے۔ شرما جی آگے پیچھے نظریں دوڑانے لگے۔ وہ پاپا جی کو تلاش کر رہے تھے۔ اُنہوں نے اپنے چپراسی کو اندر بلا لیا اور اُس سے پوچھا کہ راج کپور اکیلے آیا ہے یا ساتھ میں اور کوئی بھی ہے۔ وہ بولا نہیں راج جی اکیلے آئے ہیں۔ شرما جی نے چپراسی سے کہا کہ وہ راج کو اُنکے پاس بھیج دیں۔

راج کپور بھاگ کر شرما جی کے پاس چلا گیا۔ شرما جی کافی نادم تھے۔ اُنہوں نے راج کپور سے کہا۔ ''بیٹا کل میں نے تمہیں غصے میں جو تھپڑ مارا اُسکے لئے میں شرمندہ ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا''

راج کپور روہانسا ہو گیا۔ وہ آگے بڑھکر شرما جی کے پاؤں پر گرا اور اُنکے پاؤں کو چھو کر بولا ''آپ مجھ سے مافی مانگ کر مجھے شرمندہ کر رہے ہیں سر۔ آپ میرے گورو ہیں اور گورو کے ناتے اگر آپ نے مجھے ایک تھپڑ مارا تو میری بہتری کے لئے ہی مارا۔ معافی تو مجھے آپ سے مانگنی چاہیے کہ میری ایک بیوقوفانہ حرکت سے آپ کا اتنا نقصان ہوا۔ آپ کو پیک اپ کرنا پڑا۔''

شرما جی نے راج کپور کو اوپر اُٹھایا اور پھر اُنہیں گلے سے لگا کر بولے۔

''تم اب کلیپر بوائے کا کام نہیں کرو گے بلکہ میری اگلی فلم میں بطور ہیرو کام کرو گے''

''نیل کمل'' میں شرما جی نے راج کپور کو پہلی بار ہیرو کے طور پر متعارف کیا۔ اس فلم میں اُنکی ہیروئن مدھوبالا تھی۔ راج کپور صحیح معنوں میں ہرفن مولا تھا۔

پاپا جی نے اپنی جمع پونجی سے جوہو بیچ پر ایک جگہ خرید لی جس کا نام اُنہوں نے پرتھوی تھیٹر رکھ دیا۔ اسے اُنہوں نے روایتی تھیٹر سے الگ شکل دینے کی کوشش کی۔ اُن دنوں فوک اور پارسی تھیٹر کمپنیوں کا بول بالا تھا۔ تھیٹر کو منعفت بخش دھندہ سمجھا نہیں جاتا تھا۔ یہ ایک طرح کا جوا تھا جو بہت کم لوگ کھیلا کرتے تھے۔ پاپا جی چونکہ تھیٹر کی پیداوار تھے اسلئے وہ اپنی پہلی محبت سے آنکھیں پھیرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب آزادی کی تحریک زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اُنہوں نے ایسے ڈرامے پیش کئے جو نوجوانوں میں آزادی پانے کی للک کو مہمیز دیتے تھے۔ اُنہوں نے کبھی سود زیاں کی پرواہ نہیں کی۔ وہ فلموں سے جتنا کماتے تھے اُسکا آدھے سے زیادہ حصہ وہ پرتھوی تھیٹر میں ڈال دیتے تھے۔ پرتھوی تھیٹر نے 2662 شوز کئے۔ ہر شو کا مرکزی کردار وہ خود ادا کرتے تھے۔ اُن پر کام کرنے کا جنون اس طرح سوار تھا کہ اگر وہ بیمار بھی ہوتے تھے تب بھی وہ کام کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اُنکی دیوانگی کا عالم دیکھئے کہ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف سے جب اُنہیں ایک فارن کلچرل ڈیلیگیشن کے ساتھ باہر جانے کا دعوت نامہ ملا تو اُنہوں نے اُنکی یہ پیشکش یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ وہ تھیٹر کو پہلے ہی اپنا وقت دے چکے ہیں اسلئے وہ ملک سے باہر نہیں جا پائیں گے۔ پرتھوی تھیٹر کے بینر تلے اُنہوں نے کئی سارے ڈرامے اسٹیج کئے جن میں 1947 کے ''دیوار'' اور پٹھان'' 1948 کا ''غدر'' اور 1954 کا ''پیسہ'' قابل ذکر ہیں۔ اُنکا ڈرامہ ''پٹھان'' سب سے مقبول ڈرامہ تھا جو ایک مسلم اور ایک ہندو دوست کی کہانی پر مبنی تھا۔ اکیلے بمبئی میں اُسکے چھ سو شو ہوئے۔ اپنے دوسرے ناٹک ''پیسہ'' کو اُنہوں نے کئی سال بعد سلو لائڈ پر اتارا۔ اس فلم کی ہدایت کاری کا بار بھی اُنہوں نے ہی اُٹھا لیا تھا۔ یہ فلم 1957 میں ریلیز ہوئی۔ بدقسمتی سے اس فلم کی فلمبندی کے دوران اُنکے ساتھ ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس نے اُنکی زندگی ہی بدل کے رکھ دی۔ اس فلم کے دوراں اُنکی آواز بیٹھ گئی جو بعد میں اُبھر نہ سکی۔ دراصل وہ حلق کے کینسر میں مبتلا ہو چکے تھے جس کا علم اُنہیں بہت بعد میں ہوا۔

1950 کے آتے آتے پرتھوی تھیٹر کی سرگرمیاں کم ہونے لگیں۔ فلموں کا اثر اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ چلتے پھرتے تھیٹر میں اب کوئی کشش باقی نہ رہی تھی۔ یہ اب گھاٹے کا سودا بن کر رہ گیا تھا۔ ستر اسی لوگوں کو ٹرینوں میں لے کر چلنا پھر چھ چھ مہینے پورے تام جھام کے ساتھ اُنہیں گھمانا، اُنکے کھانے پینے کا خیال رکھنا کافی خرچیلا سودا تھا جسے کسی بھی زاویے سے سود مند نہیں کہا جا سکتا تھا۔ علاوہ اسکے جن اداکاروں اور ٹیکنشنوں کے دم سے پرتھوی تھیٹر نے کامیابی پائی تھی وہ ایک ایک کر کے پرتھوی تھیٹر کو چھوڑ کر فلموں سے جڑتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ اُنکے تینوں بیٹے بھی فلموں میں اپنی اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ پاپا جی نے وقت کے بدلاؤ کو بھانپ لیا اور اُنہوں نے تھیٹر کو الوداع کہا۔

پرتھوی تھیٹر نے فلم انڈسٹری کو کئی انمول رتن دئے۔ راما نند ساگر، شنکر جے کشن اور رام گنگولی پرتھوی تھیٹر کی ہی دین ہیں۔ زہرہ سہگل بھی پرتھوی تھیٹر کے ساتھ کئی برس تک جڑی رہی۔ اپنے ایک حالیہ انٹرویو کے دوران اُنہوں نے پاپا جی کی خوبیاں گناتے ہوئے کہا کہ جب بھی وہ ٹور پر جاتے تھے تو اُنکی ٹکٹ تھرڈ کلاس کی ہوا کرتی تھیں جب کہ پاپا جی راجیہ سبھا کے ممبر تھے اور اُنہیں فسٹ کلاس میں سفر کرنے کی سہولیات دستیاب تھیں مگر وہ فسٹ کلاس چھوڑ

کر اُنکے ڈبے میں آجاتے تھے اور ایک میلی کچیلی چادر فرش پر بچھا کر اُنکے ساتھ ہی سجایا کرتے تھے اور وہی کھانا کھاتے تھے جو دیگر آرٹسٹ کھایا کرتے تھے۔

1950 کی فلم ''دہیز'' میں اُنہیں وی شانتارام کے ساتھ کام کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ شانتارام جی اول نمبر کے ہدایت کاروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اُنکے ساتھ کام کرنا اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔ پاپا جی کا قد اتنا اونچا ہو چکا تھا کہ ایسے جید ڈائرکٹر اُنکے ساتھ کام کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

اسی دوران اُنکے صاحبزادے راج کپور نے اپنی ایک فلم کمپنی کھولی جسکا نام آر کے فلمز رکھا گیا۔ اُنہوں نے پہلی فلم ''آگ'' بنائی جو بری طرح فلاپ ہوئی۔ دوسری فلم بنانے کا فیصلہ کیا جس کا نام ''برسات'' تھا۔ اس فلم کی کہانی رامانند ساگر نے لکھی تھی۔ اس کے مرکزی کردار میں راجکپور کے علاوہ نرگس، نمی اور پریم ناتھ شامل تھے۔ اس فلم میں راج جی نے موسیقار کے طور پر رام گنگولی کو ہی سائن کیا تھا، جنہوں نے اُنکی پہلی فلم ''آگ'' کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ جب رام گنگولی نے اس فلم کے لئے پہلا گانا بنایا تو لتا جی کو آر کے اسٹوڈیو میں ریہرسل کے لئے بلایا۔ جب لتا جی نے ٹیون سنی تو وہ اُچھل پڑی۔ اُنہوں نے راج جی سے کہا کہ میں ابھی ایسی ہی ٹیون پر ایک گانا ریکارڈ کر کے آئی ہوں۔ راج جی کو لتا جی کی بات سن کر شاک لگا۔ اُسنے اُسی وقت سنگیت کار بدلنے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ اس فلم کا بجٹ مارکیٹ کے کسی بڑے موسیقار کو لینے کا محتمل نہ تھا اس لئے وہ کسی نئے موسیقار کی تلاش میں نکل گئے۔ اچانک اُنہیں پرتھوی تھیٹر میں شنکر نام کا ایک سنگیت کار یاد آیا جو وہاں کام کر رہا تھا۔ وہ شنکر جی سے ملے اُنہیں اپنی فلم میں کام کرنے کی آفر دی۔ اُنہوں نے یہ شرط رکھی کہ وہ اکیلے کام نہیں کرے گا بلکہ اپنے ساتھ ایک اور لڑکے کو بھی شامل کرے گا جس کا نام جے کشن ہے۔ راج جی نے منظوری دیدی۔ جب اُنہوں نے سارے گانے ریکارڈ کئے اور فلم بن کر تیار ہوگئی تو راج کپور جی نے فلم کے ٹائٹلز میں اُن کا نام دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ نئے تھے اسلئے وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتے تھے۔ اسکی جگہ وہ کسی نامی موسیقار کا نام استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن پاپا جی کو ٹرائل پر بلایا گیا۔ جب اُنہوں نے فلم دیکھی تو وہ اس فلم کے سنگیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُنہوں نے دونوں لڑکوں کو بلا کر اُنہیں جی بھر کے آشیرواد دیا۔ جب اُنہیں پتا چلا کہ اُن کا نام فلم میں نہیں دیا جا رہا ہے تو اُنہیں یہ سنکر بڑا دکھ ہوا۔ اُنہوں نے بیٹے کو اُسی وقت اپنے سامنے طلب کیا اور اُس کی نہ صرف سرزنش کی بلکہ اُسے اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ان دونوں کا نام بطور موسیقار اپنی فلم میں دے۔ ایسا دل پایا تھا پاپا جی نے۔ وہ جتنے لحیم شحیم تھے اُن کا دل اُس سے بھی کہیں زیادہ وشال تھا۔ وہ کسی کو اُسکا حق دلانے کے لئے اپنے بچوں کے ساتھ بھی لڑ سکتے تھے۔ وہ سچے اور کھرے پٹھان تھے۔

''برسات'' کی ریکارڈ توڑ کامیابی کے بعد راج کپور نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اگلی فلم جو وہ بنانے جا رہے تھے وہ تھی ''آوارہ''۔ اس فلم کی کہانی خواجہ احمد عباس اور وی پی ساٹھے مل کر لکھ رہے تھے۔ اس فلم میں جو کلیدی کردار تھا وہ جج رگوناتھ کا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ رول پاپا جی کریں۔ جب راج جی نے باپ سے بات کی تو پاپا جی نے اُنکی پیش کش سرے سے ہی ٹھکرا دی۔ راج جی نے ماں سے بات کی۔ اُنہوں نے بھی سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ تب بھی نہیں مانے۔ وہ ہیرو کا رول ادا کر چکے تھے اسلئے وہ ایک منفی کردار نبھانے کے لئے کسی بھی قیمت پر تیار نہ تھے۔ جب گھر والوں کی کوششیں بھی اکارت گئیں تو راج جی چنتا میں پڑ گئے۔ اس رول میں پاپا جی کو چھوڑ کر کوئی بھی ایکٹر فٹ نہیں بیٹھ رہا تھا۔ ایک دن وہ اسی پریشانی میں بیٹھے تھے کہ عباس صاحب ملنے آگئے۔ راج جی نے عباس صاحب کو اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ عباس صاحب نے راج جی سے کہا۔ ''میں کوشش کر کے دیکھوں'' راج جی نے کہا۔ ''ہم سب کوشش کر چکے ہیں۔ آپ بھی کوشش کر دیکھئے۔ میں جانتا ہوں نتیجہ کیا ہوگا۔ وہی ڈھاک کے تین پات۔ میرا باپ پٹھان ہے۔ پٹھان ایک بار جو ضد لے کر بیٹھ گیا اُسے آسانی سے چھوڑے گا نہیں''۔ عباس صاحب نے کہا۔ ''راج جی ایک بار مجھے کوشش تو کرنے دیجئے۔'' راج جی نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ کوشش کر کے دیکھئے''

اگلے روز عباس صاحب پاپا جی سے ملنے اُنکے گھر پر چلے گئے۔ پاپا جی تو پہلے سے ہی من بنا چکے تھے کہ وہ اس فلم میں کام نہیں کریں گے جس سے اُنکی امیج کو نقصان پہونچے گا۔ عباس صاحب بھی طے کر کے آئے تھے کہ وہ پاپا جی کو فیصلہ بدلنے پر مجبور کریں گے۔ اُنہوں نے پاپا جی سے کہا کہ اُنہوں نے فلم کی کہانی پوری طرح سنی ہی نہیں ہے۔ اصل میں اُنہیں جو کردار ویلین کا لگ رہا ہے وہ اصل میں اس فلم کا ہیرو ہے۔ اُسکے بعد عباس صاحب نے اُنہیں نئے سرے سے پوری کہانی سنائی اور کہانی بھی اس ڈھنگ سے سنائی کہ کہانی سن کر پاپا جی کی باچھیں کھل گئیں۔ عباس صاحب نے اُنکا کردار اس طرح پیش کیا کہ پاپا جی گدگد ہوگئے۔ اُنہوں نے اپنا فیصلہ بدل ڈالا اور وہ اس فلم میں کام کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ جب عباس صاحب یہ خوشخبری لے کر راج جی کے پاس لوٹے تو راج جی یہ خبر سن کر پھولے نہیں سمائے اور اُنہوں نے عباس صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

فلم ''آوارہ'' ایک ایسی فلم ہے جس نے کامیابی کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اس فلم نے ہندوستانیوں کو ہی نہیں بلکہ روسیوں کو بھی دیوانہ بنا ڈالا۔ پاپا جینے اپنے کردار میں جان ڈال دی تھی۔ یہ پوری فلم اُن ہی کے کردار کے گرد گھومتی ہے۔ اس فلم نے پاپا جی کو شہرت کی معراج تک پہونچا دیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس فلم میں پاپا جی کے والد بشیشور ناتھ جی نے بھی ایک چھوٹا سا رول بخوبی ادا کیا تھا۔

اپنی خرابی صحت کے باعث اُنہوں نے اپنی سرگرمیاں کم کر دیں اور منتخب فلموں میں کام کرنے لگے۔ 1951 میں ''آوارہ'' کی ریلیز کے بعد اُنہوں نے فلم ''آنند مٹھ'' میں کام کیا جو کہ 1952 میں ریلیز ہوئی۔ اُسکے بعد اُنہوں نے ''چندر پتی شوا جی'' میں کام کیا جو کہ 1953 میں ریلیز ہوئی۔ اسی بیچ کے آصف صاحب نے فلم ''مغل اعظم'' کو نئے سرے سے بنانے کی تیاری شروع کی تھی۔ یہ فلم پہلے بھی چھ سات ریل بن چکی تھی جب کہ اس فلم کے ہیرو چندر موہن صاحب کا انتقال ہوگیا۔ آصف صاحب نے کاسٹ میں پھیر بدل کر کے چندر موہن کی جگہ سپرو صاحب کو سلیم کے

رول میں لے لیا۔ سپرو صاحب تاریخی اور دھارمک فلموں کے مشہور اداکار تھے۔ اس سے پہلے کہ فلم سیٹ پر جاتی ءملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ اس فلم کے سرمایہ کار شیراز علی جو کہ بمبئی کے فینس مہالکشمی اسٹوڈیو کے مالک تھے ہندوستان چھوڑ کر پاکستان میں جا کر بس گئے۔ آصف صاحب کا خواب خواب بن کر ہی رہ گیا۔

جب حالات کچھ سنبھلے تو آصف صاحب نے نئے سرے سے اس فلم کو بنانے کا بیڑہ اٹھالیا۔ تقدیر سے اُنہیں ایک بہت بڑا پارسی سرمایہ کار مل گیا جو فلم میں پیسہ لگانے کے لئے تیار تھا۔ آصف صاحب نے سب سے پہلے شہنشاہ اکبر کے رول کے لئے پاپا جی کو سائن کیا۔ اُسکے بعد وہ نرگس کے پاس چلے گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ نرگس ہی انارکلی کا رول ادا کرے۔ چونکہ آصف صاحب نے سلیم کے رول کے لئے دلیپ صاحب کو سائن کیا تھا اسلئے راج کپور جی نہیں چاہتے تھے کہ نرگس جی دلیپ صاحب کے ساتھ کام کرے کیونکہ اُن دنوں اُنکا عشق سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ یہ رول مدھو بالا کے حق میں چلا گیا جب کہ اُنکے اور دلیپ صاحب کے رشتے میں دراڑ پڑ گئی تھی۔ بہر حال فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ جب شہنشاہ اکبر اولاد مانگنے کی غرض سے ننگے پاؤں ریگستان میں خواجہ کی زیارت پر جاتے ہیں تو اس سین کو فلمانے کے لئے ایک ایسی چپل تیار کروائی گئی جو دکھائی نہیں دیتی تھی مگر پاپا جی نے چپل پہننے سے انکار کر دیا۔ اُنہوں نے آصف صاحب کو سمجھایا کہ جب اتنا عظیم شہنشاہ ننگے پاؤں چل کے جا سکتا ہے تو وہ کیوں نہیں جا سکتے۔ اُنہوں نے تپتی ریت میں وہ سین کیا۔ اُنکے پاؤں اس حد تک جھلس گئے کہ ساری زندگی وہ ان جھلسے ہوئے پاوں سے دکھی رہے۔ یہ تھا کام کرنے کا جنون۔

''مغل اعظم'' پاپا جی کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُنہوں نے اپنی دم دار اداکاری سے شہنشاہ اکبر کا تصور ہی بدل کے رکھ دیا۔ اس فلم کو بننے میں دس برس لگ گئے۔ جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو سینما شائقین کو پرتھوی راج کپور جی کا ایک انوکھا روپ دیکھنے کو ملا۔ اس فلم میں اُنہوں نے فنکاری کی معراج کو چھو لیا تھا۔ برجستہ مکالمے، شاہانہ چال ڈھال، چہرے کے تاثرات ،آواز میں گرج۔ ان سب چیزوں کا اُنہوں نے بخوبی استعمال کیا تھا۔ اُنکے منجھلے صاحبزادے شمی کپور نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ ایک بار وہ ''مغل اعظم'' کے سیٹ پر پاپا جی سے ملنے گئے۔ کچھ نجی پریشانیاں تھیں جن میں وہ اُنکی صلاح لینا چاہتے تھے۔ باپ بیٹے بڑے اچھے موڈ میں بیٹھ کے باتیں کر رہے تھے تبھی ایک اسسٹنٹ آ گیا اور اُس نے پاپا جی سے کہا ''سر آصف صاحب کہہ رہے ہیں کہ شاٹ تیار ہے''۔ وہ اسسٹنٹ سے بولے۔ ''آصف صاحب سے کہہ دو جہاں پناہ آ رہے ہیں''۔ یہ کہتے ہی وہ بھول گئے کہ وہ پرتھوی راج کپور ہیں اور سامنے بیٹھا شخص اُسکا بیٹا ہے۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بیٹے کی طرف مڑ کے بھی نہیں دیکھا اور سیدھے سیٹ پر چلے گئے۔ شمی کپور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔

پاپا جی نے انڈسٹری کو بہترین کلاکار اپنے تینوں بیٹوں کے روپ میں دئے۔ راج کپور، شمی کپور اور ششی کپور۔ تینوں نے باپ سے بڑھ کر نام کمایا۔ راج کپور نے تو اداکاری کیساتھ ساتھ، فلمسازی اور ہدایت کاری میں بھی اپنا لوہا منوالیا۔ اُسکے بعد اُنکی تیسری پود میں رندھیر کپور، رشی کپور اور راجیو کپور نے بھی کپور خاندان کے نام کو روشن کیا۔ اب اُنکی چوتھی پیڑی بھی انڈسٹری پر چھائی ہوئی ہے۔ پہلے کرشمہ کپور نے اپنے جلوے دکھائے۔ اُسکے بعد اُنکی چھوٹی بہن کرینا نے تو اسٹار کا درجہ پالیا۔ یہ دونوں رندھیر کپور کی بیٹیاں ہیں۔ رشی کپور کا بیٹا رنبیر کپور آجکل بڑی تیزی کے ساتھ کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتا چلا جا رہا ہے۔

پاپا جی اپنے بچوں کی مدد کے کبھی محتاج نہیں رہے۔ اُنہوں نے بمبئی کے جوہو بیچ پر ایک کاٹیج لیز پر لی تھی جہاں وہ مرتے دم تک اپنی بیوی کے ساتھ رہے حالانکہ راج کپور نے چمبور میں ایک بہت بڑا بنگلہ خریدا تھا مگر وہ اُس بنگلے میں ایک دن بھی نہیں رہے۔ وہ اپنے بچوں پر بوجھ بننا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ اپنے ڈھنگ سے جینے کے عادی تھے۔ بہر حال وہ اپنے بچوں سے کبھی لاتعلق نہیں رہے۔ جب اُنکے پوتے رشی کپور کو اپنی پہلی فلم ''میرا نام جوکر'' کے لئے ایوارڈ ملا تو راج جی نے بیٹے سے کہا کہ یہ خوش خبری پہلے اپنے دادا کو سنا کر آجائے۔ رشی کپور جب پاپا جی کے پاس یہ خوشخبری لے کر پہنچے تو پاپا جی نے اُنہیں گلے سے لگالیا اور اُنکی پیشانی چوم کر بولے۔ ''راج سے کہنا کہ تم نے آج مجھے میرا سود لوٹا دیا'' اتنا پیار کرتے تھے وہ اپنے پوتے پوتیوں سے۔

پاپا جی نے فلم ''مغل اعظم'' کے بعد کئی بے مثال فلموں میں کام کیا۔ 1964 میں رامانند ساگر کی ہدایت میں بننے والی فلم ''زندگی'' میں اُنہوں نے راجندر کمار اور وجینتی مالا کے ساتھ کام کیا۔ یہ فلم بھی باکس آفس پر بیحد کامیاب رہی۔ اسکے بعد اُنہوں نے 1965 میں ریلیز ہونے والی فلم ''جانور'' میں اپنے منجھلے بیٹے شمی کپور کے ساتھ کام کیا۔ اسی سال اُنکی ایک اور فلم ''سکندر اعظم'' ریلیز ہوئی۔ یہ فلم بھی بیحد کامیاب رہی۔ اسی سال اُنکی پانچ اور فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''شری رام بھرت ملن'' ''لٹیرا'' ''خاقان'' ''جہاں ستی وہاں بھگوان'' اور ''آسمان محل''۔ 1966 میں بھی اُنکی سات فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''یہ رات پھر نہ آئے گی'' ''شیر افگن'' ''شنکر خان'' ''لو اینڈ مرڈر'' ''لال بنگلہ'' ''انصاف'' اور ''ڈاکو منگل سنگھ''۔ 1967 میں اُنکی ایک ہی فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''شمشیر'' تھا۔ 1968 میں اُنکی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''تین بہو رانیاں'' اور ''بلرام شری کرشنا''۔ 1969 میں اُنکی چار فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''ستی سلوچنا'' پنجابی زبان میں بنی فلم ''نانک نام جہاز ہے'' یہ فلم بیحد کامیاب رہی۔ تیسری فلم ''نئی زندگی'' اور چوتھی فلم ''انصاف کا مندر'' ہے۔ اسی سال حکومت ہند نے اُنہیں ''پدم بھوشن'' کے سرکاری اعزاز سے نوازا۔ 1970 میں اُنکی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''ہیر رانجھا'' ''گناہ اور قانون'' اور ''ایک ننھی منی لڑکی تھی''۔ 1971 میں تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''کل آج اور کل''۔ یہ تین پیڑھیوں کی کہانی تھی۔ اسمیں تینوں پیڑھیاں شامل تھیں۔ پرتھوی راج کپور جی، راج کپور اور رندھیر کپور جو اس فلم کے ہدایت کار بھی تھے۔ ''آوارہ'' کے بعد ایک اور فلم تھی جسمیں اُنہوں نے نہ صرف اپنے بیٹے، بلکہ اپنے پوتے کے ساتھ کام کیا تھا۔ اسی سال اُنکی ایک کنڈ فلم ''سنسکھر تا''

ریلیز ہوئی۔تیسری فلم تھی ''پڑوسی''۔سن 1972 میں اُنکی جو آخری فلم ریلز ہوئی اُس کا نام ''ناگ پنچھی'' تھا29 مئی 1972 کو اُنہوں نے اس جہاں فانی کو الوداع کہا۔ اُنکے انتقال کے ٹھیک سولہ دن بعد اُنکی شریک حیات رام سرنی نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ دونوں کینسر کے موذی امراض میں مبتلا تھے۔اُنکے انتقال کے بعد اُنہیں داداصاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پاپا جی سچ مچ ایک سخت جان پٹھان تھے۔وہ برسوں کینسر کے جان لیوا مرض میں مبتلا رہے پھر بھی اُنہوں نے آخری دم تک کام کیا۔اُنہوں نے اپنی بیماری کو کبھی بھی کام کے آڑے آنے نہیں دیا۔وہ لمبی عمر تو نہیں جئے البتہ جتنے بھی وہ جئے شان سے جئے اور ہمیشہ اپنے مادر وطن کو یاد کرتے رہے۔اُنکے اور دلیپ صاحب کے گھرانے کے مراسم اتنے قریبی تھے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے گھر آیا جایا کرتے تھے۔یہ سلسلہ برسوں تک چلتا رہا۔آج پاپا جی ہمارے ساتھ نہیں ہیں مگر وہ جہاں بھی ہونگے خوش وخرم ہونگے۔

بقیہ : بروری روڈ

دی کہ زخمیوں کو قتل کرنا شان مردانگی کے خلاف ہے وہ سبھی نہتے بھی ہو چکے ہیں۔ان پہ ہاتھ نہیں اٹھایا جائے گا۔پھر انہوں نے بروری کو آگ لگا دی۔چونکہ الکوحل کا ذخیرہ تھا بس دیا سلائی دکھانے کی ہی دیر تھی۔آگ بھڑک اٹھی اور سب کچھ خس وخاشاک ہو گیا۔چھاؤنی میں بے بسی سے اس چتا کا نظارہ سب نے دیکھا۔رات کے اندھیرے میں جوابی حملہ خطرناک ہو گیا۔کیا عجب گھات لگائے بیٹھے ہوں۔اگلے روز کمانڈر افسروں کو جھاڑ پلا رہا تھا۔سبھی ندامت سے آنکھیں چرائے جا رہے تھے۔

''ہماری فائر پاور کہاں گئی؟''جن بندوقوں کی Muzzle Velocity سوا دو ہزار فٹ فی سیکنڈ ہے انہیں وہ پھکنی نما بندوقوں والے مار کر چلے گئے۔تمہارے گھوڑے اور خچر بھی لے گئے اٹھارہ بندوقیں اور ساڑھے چار سو روپے بھی لے گئے۔یہ ہے تمہاری کارکردگی۔تمہارا کورٹ مارشل کروں یا استعفیٰ دے کر چلا جاؤں؟'' وہ کچھ دیر دانت پیستا ان پہ برستا رہا۔افسر اٹینشن کھڑے جھاڑ برداشت کرتے رہے گرجنے برسنے کے بعد اس نے سوچا کہ افسروں کا مورال بھی بلند کیا جائے کافی بل شٹ کر چکا ہے۔

''اب کیا صورتحال ہے'' وہ نسبتاً نرم لہجے میں گویا ہوا۔کیپٹن جیمز نے پروگرس بتلائی ''کیولری کے جوان انہیں تلاش کرنے میں ناکام رہے، تاہم اب تک تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں۔حملہ آور کے کھوجی بھی اس کام پر لگا دیے ہیں۔وہ نعلوں کی نشان ڈھونڈتے کافی دور نکل گئے۔ پتھریلی زمین پہ البتہ دشواری پیش آ رہی ہے مگر ہم ان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ہمارے وفادار سردار بھی کوشاں ہیں۔''

کمانڈر کو سپاہیوں کے جذبات کا بھی اندازہ تھا۔شراب بنا وہ بیکل ہو جاتے۔''خیر! لوگ جعفر خان سرّ پرہ کو تو بھول جائیں گے۔مگر ہمارے بروری روڈ کو ہمیشہ یاد رکھیں گے! ہاں سپاہیوں کے راشن کے لیے جس بھی قیمت پہ ملے شراب حاصل کر لو۔ورنہ ہمارے افسر اسکاچ وہسکی کے کریٹ لنگریوں کے حوالے کر دیں۔اونٹوں کا بوجھ بھی کم ہوگا۔سپاہی بھی خوش ہو جائیں گے۔''

بقیہ : قرطاس وقلم کا قیدی

باب جہات کے تحت اٹھائیس مشاہیر ادب نے اُن کی شاعرانہ خصوصیات کو موضوع سخن بنایا ہے اور ان کے فکر وفن کے سبھی گوشوں کو بڑی فنی چابکدستی سے واشگاف کیا ہے۔شادؔ روایتی گل وبلبل کے موضوعات کے بجائے عصری زندگی کو درپیش مسائل ومصائب اور فی زمانہ سماجی رجحانات ومحرکات اور نئے خیالات کو ہی شعری اظہار کا خلعت فاخرہ زیب تن کراتے ہیں۔اُن کی شاعری میں ان کا موثر ہتھیار کاٹ دار طنز ہے جو اُنہیں انفرادو امتیاز عطا کرتا ہے۔ان کی زبان کھردری لہجہ تلخ ودرشت اور اُسلوب تیکھا تیور لئے ہوئے ہے۔بے رحم قیادت سیاست، تصنع مکروفریب، بے حسی، مردہ ضمیری جیسی تمام سیاسی سماجی اور اخلاقی برائیوں کو انہوں نے اپنے طنز کے نشانے پر لے لیا ہے۔وہ صحیح معنوں میں جدید شاعر ہیں۔

تاثرات یعنی تیسرے باب میں تیئیس دانشوروں کے مختصر تاثرات شامل کتاب کیے گئے ہیں۔پہلے اور دوسرے باب میں ان کی شخصیت اور فن پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہی ان سب نے بھی دہرایا ہے۔فرق ہے تو بس اختصار کا ہے۔یہ کتاب شاد عارفی کی پچاسویں برسی کے موقع پر انہیں سے منسوب کی گئی ہے۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید

(راولپنڈی)

گلزار بھائی، آداب۔

پہلے پہل تو مجھے آپ کی زبان سے قرطاس اعزاز کی دعوت کا سن کر اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ازاں بعد حالت کچھ سدھری تو آپ کے دلائل نے کام کر دکھایا۔ میری ناچیز شخصیت اور ناکافی مواد کو جس سلیقے، قرینے سے آپ نے قارئین چہارسو سے متعارف کرایا یہ فقط آپ ہی کا حصہ ہے جس کے لیے میں آپ اور ادارے کے تمام اراکین کی تہہ دل سے ممنون ہوں۔ مجھے امید ہے آپ کی اس کاوش سے دونوں دیشوں کے اہل قلم کے درمیان نہ صرف دوریاں مٹیں گی بلکہ اردو زبان وادب کو بڑھاوا بھی ملے گا۔

ڈاکٹر رینو بہل (چندی گڑھ)

محترم گلزار صاحب، تسلیمات۔

تازہ شمارے میں محترمہ رینو بہل کا گوشہ دیکھ کر خوشی ہوئی وہ اس کی مستحق بھی تھیں۔ محترمہ رینو نے کچھ پنجابی شاعری اردو ادب میں منتقل کی ہے اور اس طرح اردو کا دامن مالا مال کیا ہے۔ منیرہ احمد شمیم کے افسانے کا اسلوب روایتی ہے۔ روایتی موضوع کے ساتھ اسلوب بھی روایتی ہو تو بات بنتی نہیں ہے۔ ''مکالمے'' کچھ زیادہ ہی جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں اور محبت کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ رومانی افسانہ اگر مخملی انگلیوں سے چھوتا ہوا نہیں گزرتا تو قاری پر اپنی گرفت بھی نہیں بنا سکتا۔ آپ نے ''استاذ'' کی کردار نگاری میں استادی دکھائی ہے لیکن کہانی کے کلائمکس میں پسماندہ کردار کی جوان اور بڈھے کتے سے مماثلت مجھے کھٹکتی ہے۔ موسیقار نوشاد پر مضمون پسند آیا۔ چہارسو کی یہ انفرادیت ہے کہ اس طرح کے دلچسپ مضامین بھی پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔

شموئل احمد (پٹنہ، بھارت)

برادرم گلزار جاوید صاحب، سلام پہنچے۔

عرصہ بعد شرمندہ ہوں۔ خدا کرے آپ مکمل طور سے صحت یاب ہو چکے ہوں۔ جولائی اگست کے شمارے سے شک ہوا تھا کہ آپ شاید ابھی تک چہارسو کے دفتر نہیں جا رہے ہیں وہ اور اس سے پچھلا شمارہ مسکین احمد منصور صاحب نے بھیجا تھا۔ ستمبر کا شمارہ براہِ راست آیا اور اطمینان ہوا قلم کا سپاہی میدان ادب میں ڈیوٹی پر ہے۔ Email وغیرہ میرے بس کی چیزیں نہیں ہیں۔ Laptop کا استعمال دونوں بیٹیوں نے بہت سکھایا اور میں تو پوری طرح سیل فون سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا ہوں۔ بار نہ ہو تو رسالہ ڈاک سے بھیجتے رہیں۔ جسمانی صحت کے لیے ضروری نہیں، ذہنی طور سے اس سے افاقہ ہوتا ہے۔

میں زیادہ نہیں چلتا ہوں۔ گھر میں اِدھر اُدھر Compression stockings گھٹنوں تک چڑھائے تا کہ بلڈ پریشر نہ گرے اور مجھے نہ لے ڈوبے۔ کلینک جانا بند ہے۔ چند مریض مختلف جگہوں سے لمبے لمبے فون کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔ آنکھوں، کانوں اور یادداشت پر اثر پڑا ہے۔ مرض کا نام لمبا ہے سن کر کیا کیجیے گا۔ بحمد للہ اپاہج ہونے سے بچ گیا۔ حنیف باوا اور رینو بہل والے شمارے بہت کچھ میری دلچسپی کا سامان لے کر آئے تھے۔ باوا صاحب سے تفصیلی ملاقات آپ کے توسط سے ہوئی۔ خوب آدمی ہیں انہیں چاہیے اب قرآن مجید کا ترجمہ پنجابی میں کر ڈالیں۔ جو مجھے بمشکل ملا شاید میرے اور دوسرے عام پڑھنے والوں کے لیے واضح نہیں ہے۔ ان کی پنجابی نظمیں، افسانہ، انشائیہ سب قابل تعریف ہیں۔ دیوندر ستھیارتھی کو میں نے پڑھا کم ان کے بارے میں سنا زیادہ ہے۔ جوگندر کا یہ خط بھی کئی سال پرانا ہے۔ اب تو صرف فون پر ہی ان سے اور کرشنا بھابھی سے رابطہ رہ گیا ہے۔ خدا دونوں کو خوش رکھے۔

رسالے پر تبصرہ کرنا مشکل کام ہے۔ بہت سی چیزیں پسند آئیں بس دو ایک کا ذکر کر سکتا ہوں۔ فرخندہ شمیم کا سجدہ سہو دلچسپ بھی ہے اور اس کرب کا بیان ہے جو حد سے زیادہ تو نہ سہی انجانے میں صرف گناہ سے ڈرنے کا سبق دل و دماغ میں بٹھا لیتے ہیں اور جوان کے حلقہ اثر میں ہیں انہیں بھی وہی ازبر کراتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفات میں اس کے رحمٰن و رحیم ہونے کا ذکر سزا دینے سے کہیں زیادہ ہے۔ میں نے وہ مریض بھی دیکھے ہیں (خصوصاً خواتین) جو غلطی ہو جانے کے ڈر سے صلوٰۃ اور قرآن کی تلاوت چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

احمد ذین الدین صاحب کا افسانہ دلچسپ ہے۔ اس میں سے موجودہ دور جھانکتا رہتا ہے۔ فیروز عالم صاحب نے اپنی روداد میں ایک اور کہانی بھی سنائی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ گو بچپن سے ہائی اسکول تک میں مراد آباد میں رہا اور اس کے گلی کوچوں سے واقف ہوں لیکن باوجود دماغ پر زور دینے کے ان کرداروں اور جگہوں کا کھوج نہیں لگا سکا جن کا ذکر فیروز عالم صاحب نے کیا ہے مگر لطف آ گیا۔

سلمیٰ اعوان کا ''عراق جل رہا ہے'' میرے لیے ایک اہم تحریر ثابت ہوئی۔ نہ اصلی صدام کو دنیا جانتی ہے نہ فاتحین نے جو جنگجوئی وہاں فتح کے بعد ڈھائی۔ وہ اس سے زیادہ تفصیل سے لکھیں۔ شاید ''الیگزینڈر پشکن'' سے بھی ان کی ملاقات رہی ہے۔ باقی مضمون بھی دلچسپ تھا۔ ندا فاضلی کی نظمیں واہ واہ! ڈاکٹر پرویز شہریار کی نظم خوب ہے۔ باقی چیزیں ابھی پڑھنی ہیں۔

رینو بہل صاحبہ کے طویل افسانے میں میرے لیے وہی دلچسپی کا سامان تھا جو بلونت سنگھ اور دوسرے سکھ افسانہ نگاروں کے یہاں کبھی کبھی پڑھنے کو

ملتا ہے۔گھر کی زندگی، صبح تا شام، سادگی، نہ کہ اتراہٹ۔لیکن اس افسانے پر میرا خیال ہے ایک سوال ابھرے گا اور اس کا تعلق افسانے کی بنیاد سے ہے۔پیدائش سے پہلے، اُس زمانے میں جنس کا تعین شاید کسی ٹونے سے؟

اقبالؔ، تلوک چند محروم، کرشن چندر، فیضؔ، کنہیا لال کپورؔ، منٹوؔ، احمد ندیم قاسمیؔ اور ان گنت دوسرے بڑے ادیب اور شاعر (ہمارے دور میں انور سدیدؔ صاحب اور دوسرے) جس اردو میں نثر اور نظم لکھتے ہیں اس سے بہت مختلف ہے جواب لکھی جارہی ہے۔مجھے سنجیدگی سے خیال آتا ہے ایسا تو نہیں ہے کہ ایک نئی زبان وجود میں آرہی ہے اور سوا سو سال بعد وہ میرؔ درد، اقبالؔ، فانیؔ، سرسیدؔ اور فیضؔ کی زبان سے مختلف ہوگی۔ایسا ہوتا رہا ہے۔پہلے میں ادیبوں کو ان کی تحریر پڑھ کر لکھتا رہا ہوں مشکل پنجابی الفاظ کے معنی ضرور دیا کریں یا جملے کی ساخت ایسی ہو کہ جنہیں پنجابی نہیں آتی ہے وہ بھی سمجھ سکیں۔مگر اب تو اس کے علاوہ فعل بھی اس زد سے متاثر ہونے لگے ہیں۔میرا خیال ہے لسانیات کے ماہر اس Fendancy کا بہتر تجزیہ کر سکتے ہیں۔میں نے امرت رائے، گیان چند، سنیتی کمار وغیرہ کے یہاں اس موضوع پر تھوڑا بہت پڑھا ہے۔لفظوں کا اضافہ دوسری زبانوں سے تصادم یا میل میں ہوا کرتا ہے لیکن بنیادی زبان (مثال انگلش) ایک ہی رہتی ہے۔مگر بھائی میں لسانیات کا ماہر نہیں ہوں۔پنجابی اردو مجھے دونوں پیاری ہیں درحقیقت ہر زبان۔

ڈرامہ ''قبضہ'' شاید ریڈیو کے لیے لکھا گیا ہے۔''استاذ'' خوب کہانی ہے۔اچھا ہوتا خود آپ کے رسالے میں نہ چھپتی۔۔۔روشنائی، زیست یا انشا میں۔''عراق جل رہا ہے'' کا دوسرا باب بھی میرے لیے دلچسپی کا باعث ہوا۔یوگیندر بہل صاحب کی نظم ''بوڑھے'' دلچسپی سے پڑھیں گے وہ نہیں جن کے لیے شائع کی گئی ہو۔باقی چیزیں پھر پڑھوں گا۔

حسن منظر (کراچی)

محترم گلزار صاحب، محبتیں۔

چہارسو کا ڈاکٹر رینو بہل پر مشتمل قرطاس اعزاز وصول ہوا۔

آپ نے حسب دستور نہایت مشقت سے ایک مکمل اور انتہائی متاثر کن دستاویز تیار کی ہے جو مستقبل میں ادب کے طلبہ کے لئے کارآمد ہوگی۔رینو اردو کی پرستار ہیں اور انہوں نے ایک ایسے ماحول میں اردو کو گلے لگایا جب سرحد کے دونوں جانب صرف انگریزی سیکھنے اور بولنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔شاید اسی کے لئے کہا گیا ہے

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے
سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

مگر اردو رینو جی کا صرف شوق ہی نہیں بلکہ انہوں نے سنجیدگی سے اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے اور اسکا پورا پورا حق ادا کیا ہے جسکا ثبوت اردو میں انکی ایم اے اور پھر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں ہیں اس کے علاوہ کئی افسانوں کے مجموعے جو دل کو چھو لیتے ہیں۔وہ اردو ادب میں اب اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوگئی ہیں موجودہ شمارے میں انکا مضمون ''محبتوں کا جال'' جو انکی والدہ کی داستان حیات ہے بہت ہی دلکش تحریر ہے۔آپ نے ''براہِ راست'' میں بڑے معنی خیز سوالات کئے ہیں جن کے جوابات سے رینو کی شخصیت اور فن خوب نکھر کر ظاہر ہوئے ہیں۔ان پر قیصر نجفی کا مضمون ''بدلی میں چھپا چاند'' انکے طرز تحریر اور فن پر ایک جامع تحریر ہے۔اس کے علاوہ فاری شانے رینو پر مختلف مشاہیر کی آرا کو اچھے انداز سے جمع کیا ہے۔

شمارے کے باقی حصوں کا بھی مطالعہ کیا، افسانے حسب معمول ہیں مگر انجم جاوید کی کہانی چہار درویش کے متعلق یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ مجھے عجیب لگی۔

آپکا افسانہ ''استاذ'' وقت کے بہاؤ، قویٰ کی تنزلی اور انسانی زندگی کے فانی ہونے پر ایک استعاراتی نوحہ ہے۔یہ افسانہ دل کو چھو کر اس میں ایک کسک پیدا کر دیتا ہے۔انسان بہر حال فانی ہے اور عمر کے ساتھ پہلے جیسی قوت و توانائی باقی نہیں رہتی مگر اسکا ذہن اسے ماننے کو تیار نہیں ہوتا تا آنکہ کوئی جھٹکا اسکی آنکھیں کھول دیتا ہے۔اس افسانے میں بوڑھے کتے کا کردار اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔آپ نے دلی کی کرخنداری زبان میں اسے خوب نبھایا ہے۔کچھ الفاظ تو آپ نے ایسے استعمال کئے ہیں کہ مجھے اپنی مرحومہ نانی صاحبہ یاد آگئیں جن سے میں نے یہ الفاظ سنے تھے۔اب انکے استعمال کرنے والے اپنی تہذیب کے ساتھ مٹ چکے ہیں۔شبھ چنتک کی طرح آپ کا یہ افسانہ بھی قارئین کو برسوں یاد رہیگا۔

غزلوں میں منظر ایوبی کا نام دیکھ کر مسرت ہوئی یہ ۱۹۶۲ میں میرپور خاص میں میرے استاد تھے۔مہندر پرتاب اور یوگندر بہل کی نظم نے بہت متاثر کیا۔سعید نقوی، شگفتہ نازلی اور نوید شروش کی کی غزلیں حسب دستور اچھی تھیں۔میری سرگشت کو، جو جلد ہی اختتام کو پہنچنے والی ہے، جو احباب پسند کر رہے ہیں انکا تہہ دل سے شکریہ۔

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

عزیز از جان گلزار جاوید، دعائے سلامتی۔

''چہارسو'' سے گردوپیش کی خوش منظری نصیب ہوئی۔آپ کی محنت اور توجہ سے رسالہ اور زیادہ وضع دار ہو چکا ہے۔محترمہ ڈاکٹر رینو بہل کے متعلقات سے خوش گوار تعارف ہوا۔ان کی تحریریں بغور دیکھیں۔ایک صدی کا قصہ بمطابق نوشاد علی ایسا ہے کہ پڑھ کے آنکھیں بھر آئیں۔دیپک کنول نے یہ ''قصہ'' ایک حسن وخوبی سے بیان کیا ہے۔مجھے موسیقی سے مقدور بھر دلچسپی رہی ہے۔میں اور میرے احباب نوشاد پر فدا تھے۔نوشاد کے گانے جی بھر کے سُنے اور یاد رکھے۔کچھ تو نوشاد کی وجہ سے گانے والے مشہور ہوئے کچھ گانے والوں کی بدولت نوشاد کی شہرت کو پر لگے۔نور جہاں اور لتا منگیشکر کی گائیکی میں بہت فرق ہے۔اپنی اپنی جگہ دونوں ''منتہی الفن'' رہیں۔دونوں برصغیر ہی میں شارہ دار

رہیں۔ایک دوسرے پراثر انداز نہیں ہوئیں۔ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔جس طرح نوشاد کی موجودگی میں انڈیا کے کئی موسیقار چمکے دمکے۔پاکستان کے بھی بہت سے موسیقاروں نے اپنا اپنا رنگ جمایا۔ برصغیر میں موسیقی کی تہذیب وتعلیم بالکل یکساں ہے۔روایات کا پایۂ اعتبار ایک ہے۔ایبٹ آباد جسے شہرِ بہاراں کہیے کے تناظر میں انجم جاوید کا افسانہ''چہار درویش'' کہانی کے اسرار سے دنگ کر دینے والی نوشت ہے۔افسانہ''استاذ'' بھی قلم وری کی عمدہ علامت ہے۔رؤف خیر کی تحریر''خدا بھول گئے'' خدالگتی کہہ رہی ہے۔معین قریشی نے گدھا سمجھ کے میں مزاحیہ چابک دستی سے اچھا کام لیا ہے۔فکر تونسوی کی کتاب''گدھا''اس باب میں پڑھی جاسکتی ہے۔

آصف ثاقب (بوئی،ہزارہ)

جنابِ گلزار صاحب،سلام ونیاز۔

چہارسو کا تازہ شمارہ کمپیوٹر پر دیکھا۔قرطاس اعزاز ڈاکٹر رینو بہل کے نام دیکھ کر ازحد مسرت ہوئی۔ان سے میرا رابطہ اُس وقت ہوا تھا جب چہارسو نے یہ اعزاز مجھے بخشا تھا اور اُسی وقت سے ایک بہت اچھی اور سچی فنکارہ سے چہارسوہی کے ذریعہ تعلقات استوار ہوئے۔یقیناً اُردو کے لیے ان کی خدمات گراں قدر ہیں۔اس خصوصی شمارے سے انہیں اور قریب سے جاننے کا موقعہ آپ نے فراہم کیا جس کے لیے آپ مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ گرچہ میں انٹرنٹ پر پورا رسالہ نہیں پڑھتی صرف سرسری طور پر دیکھتی ہوں اور مجھے ہارڈ کاپی کا انتظار رہتا ہے لیکن رینو بہل کی تخلیقات.......ڈرامہ''قبضہ'' نے ذہن ودل پر یوں قبضہ کیا کے''خوشیوں کے جال'' سے نکلنا مشکل ہوگیا۔''قبضہ'' زندگی کی عبرت ناک سچائی سے بھر پور ہے جو ہمارے چاروں طرف بکھری ہوئی ہے اور اس میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ہمیشہ کی طرح''رس رابطے'' نے بھی باندھ لیا۔اس کے علاوہ ''آنگن میں کالی دھوپ''(منیرہ احمد شمیم) کے عنوان ہی نے بے ساختہ متوجہ کیا اور یہ افسانہ بہت پسند آیا۔''عاشی اور تتلی''(مسرت کلانچوی) بھی عمدہ تحریر ہے۔''ذراسی زندگی''(وجاہت علی عباسی) نے چند یادیں تازہ کردیں۔فی الحال انٹرنیٹ پر اتنا ہی مطالعہ کرسکی ہوں کہ اب ہارڈ کاپی کا انتظار ہے۔

پروین شیر (کینیڈا)

مکرمی گلزار جاوید،تسلیم ونیاز۔

چہارسُو کا قرطاسِ اعزاز پڑھ کر جی خوش ہوا اور دل سے بے ساختہ نکلا کہ حق بحقدار رسید۔جنابِ گلزار جاوید کا''براہِ راست'' شوق وانہماک سے پڑھا۔ بڑا دلچسپ اور معلوماتی ہے۔گلزار صاحب نے متن شروع کرنے سے پہلے ڈاکٹر رینو بہل کا تعارف اور ان کے لیے قرطاسِ اعزاز کا جواز صدق دلی سے پیش کیا ہے۔ یہ تعارف اتنا مناسب، برمحل، سیر حاصل اور جامع ہے کہ موصوفہ کی ادبی شخصیت اور ان کے دل میں اردو کے لیے جو بے لوث اور بے پناہ محبت ہے نیز اردو ادب کو جوان کی دین ہے یہ سب امور ایک منہ بولتی تصویر کی طرح سامنے آ گئے ہیں۔

''ابرِ گوہر بار'' رینو بہل کے نام مشاہیر کے خطوط پر مشتمل ہے۔ان خطوط سے موصوفہ کی ادبی شخصیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ جناب رتن سنگھ،شرون کمار ورما، دیپک بُدکی، اقبال انصاری، پروفیسر قیصر نجفی، انور گنگوہی، ڈاکٹر سلطان انجم اور رومانہ رومی نے رینو بہل پر عالمانہ مضامین لکھ کر قاری کے لیے رینو بہل کو صحیح طور پر جاننے کے لیے دروازے وا کردیئے ہیں۔ ڈاکٹر رینو بہل کا افسانہ''درد پدی جاگ اُٹھی'' اور ڈرامہ''قبضہ'' نیز''عُمر اں دی تھکان''(گورمکھی سے اردو میں تراجم) اور والدہ محترمہ کے خاکہ کی شمولیت سے چہارسو کے اس شمارے کو چار چاند لگ گئے ہیں۔''مائل بہ کرم'' کے زیرِ عنوان دونوں نعتیں پڑھ کر روحانی سرور ملا۔

افسانے حسبِ معمول ہیں۔''استاذ'' کے عنوان سے گلزار جاوید صاحب لکھا خاکہ ہزلیہ انہیں کا حصّہ ہے۔دلّی کی عوامی مقامی بولی Local slang ''آری یا ہوں۔۔۔جاری یا ہوں۔۔۔کِس چکّی کا کاوے ہے۔۔۔ابے کیا سونچ ریا اے۔۔۔کاتا کیوں نی۔۔۔لونڈیوں کی طریوں ٹسوے کیوں با ریا اے۔۔۔'' اور عوام کا یہ روزمرّہ ہی تو ہے جو زبانوں کی جان ہوتا ہے اور خطّے، علاقے یا کسی طبقے کی لسّانی اساس ہوتا ہے اور اس کا تشخص کیا کرتا ہے اور اسی سے سانجھے معاشروں کی تشکیل ہوتی ہے اور سماج کے مختلف طبقوں اور فرقوں کے درمیان آپسی پیار اور محبت پیدا ہوتے ہیں۔

''کوئے قاتل'' عنوان کے تحت غزلیں فصیح وبلیغ ہیں لیکن کئی جگہ عروضی سکتہ محسوس ہو رہا ہے۔''چشمِ ناحق'' کے زیرِ عنوان غزلیں بھی پسند آئیں۔''دل کا پنچھی'' آزاد نظموں پر مشتمل ہے اور خوب سے خوب تر ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم کا''ہوا کے دوش پر'' صرف داستانِ حیات نہیں یہ تو ہر بار ایک ادبی شہ پارہ ہوتا ہے۔سلمیٰ اعوان کا''عراق جل رہا ہے'' بہت خوبیاں لیے ہوئے ہے۔''مقدمے کا فیصلہ محفوظ ہے''''افسانوں میں کربلا''''عاشی اور تتلی'' ''خدا بھول گئے'' ''ذرا سی زندگی'' ''گدھا سمجھ کے وہ چپ تھا'' یہ سارے مشمولات خاصی دلچسپی لئے ہوئے ہیں۔

دیپک کنول ہر بار کسی ہردلعزیز فلمی ہستی پر بڑی مفید اور دل چسپ معلومات فراہم کرتے ہیں۔اس بار تو انہوں نے کمال کردیا۔نوشاد ایک ایسی ہستی ہوئے ہیں جنہوں نے ایسی دُھنیں بنائیں جو رہتی دنیا تک نہ صرف کلاسیکی موسیقی کے دیوانوں بلکہ ہر کس وناکس کے دماغ میں گونجتی رہیں گی۔

آخر میں پھر وہی بات کہہ رہا ہوں کہ چہارسو صرف ایک رسالہ یا جریدہ نہیں بلکہ اردو ادب کا قاموس ہے جو قسطوں میں شائع ہو رہا ہے۔

پرواز انبالوی (بھارت)

میرے بہت ہی عزیز اور پیارے گل وگلزار،سلامتی کی دعائیں۔

اس بار بھی چہارسُو ہر طرح کی مانند بہترین ولاجواب ہے۔''قرطاسِ

اعزاز'' کے لیے ڈاکٹر رینو بہل کا انتخاب اور اُن کی تخلیقات کا چناؤ واقعی قابل داد ہے۔ یوں تو عزیزہ نے افسانہ اور ڈرامہ بھی لاجواب تحریر کئے ہیں مگر والدہ صاحبہ کی نسبت تحریر کردہ ''خوشیوں کا جال'' تو سدا بہار تحریر ہے اور اُس کے آخر میں میں درج کردہ اشعار تو تحریر کو چار چاند لگا رہے ہیں۔ انٹرویو میں رینو نے جس قدر بردباری اور برجستگی کا مظاہرہ کیا ہے اُس سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ پنجابی شاعری کا ترجمہ بھی خوب ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ رینو کو یہ کام جاری رکھنا چاہیے۔

اب آیئے افسانوں کی طرف آپ نے پنجاب میں بیٹھ کر دلّی کی کرخنداری زبان میں کیا خوبصورت اور طنز سے بھرپور افسانہ لکھا ہے۔ کئی بار پڑھنے کے باوجود بھی دل نہیں بھرتا۔ اسی طرح چہار درویش، آنگن میں دھوپ، بستی بھی اپنی جگہ لائق توجہ ہیں۔

رؤف خیر کا مضمون ''خدا بھول گئے'' دل ہلا دینے والی تحریر ہے۔ کیسے کیسے عالم فاضل لوگ نالائق اولاد کے ہاتھوں رسوا ہوئے ہیں۔ وجاہت عباسی نے اپنے لائق والد کی برسی کے حوالے سے اُنہیں یاد کر کے فرمانبرداری کا ثبوت دیا ہے۔ سوگواری کے اس ماحول میں ڈاکٹر معین قریشی نے گدھے کے تعاون سے پڑھنے والوں کے جی کا بوجھ خوب خوب ہلکا کیا ہے۔ اور اپنے امرناتھ دھمیجہ جی کی ''فون پر گفتگو'' نے بھی دل کو خوب گدگدایا ہے۔

فیروز عالم اور دیپک کنول ہر بار کی طرح اس بار بھی چھائے ہوئے ہیں جس کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ شاعری میں محمود الحسن، شمیم ادیب، کرشن گوتم، وشال کھُلر کے علاوہ نصرت بخاری کی نظم ''ہم نے سب کچھ دیکھا ہے'' پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

محترم گلزار جاوید جی، اسلام علیکم۔

سب سے پہلے تو میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے صحرا میں کھڑے اس تنہا شخص کو ''چہارسو'' کی پر رونق اور میان بستی میں لے آئے جہاں رہتے ہوئے میں بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ اور میں اپنی اُس تنہائی کو ''چہارسو'' کی اس عظیم بستی سے باہر دم توڑتے ہوئے کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد میں ان عظیم شخصیات کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ''چہارسو'' مجھ ''نمانے'' پر مہکتے حرفوں کی برکھا کی ہے۔ میں جناب یوگیندر بہل تشنہ، جناب آصف ثاقب، قابل احترام شہناز خانم عابدی صاحبہ، جناب مہندر پرتاپ چاند، سید نصرت بخاری، پروفیسر زہیر کنجاہی، جناب نسیم سحر، محترمہ شگفتہ نازلی، جناب ابراہیم عدیل، جناب نیر اقبال علوی، جناب نوید سروش، محترم غالب عرفان صاحب، منفرد انداز کے مشہور افسانہ نگار جناب آغا گل جی اور تصور اقبال صاحب۔ یہ وہ شخصیات ہیں جو ''چہارسو'' کی اس میان بستی میں اپنے اپنے شعبوں میں اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں۔ ان شخصیات کا، ان میان لوگوں کا بارِ دگر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

''چہارسو'' کے تازہ شمارے میں قرطاس اعزاز کا سہرا محترمہ ڈاکٹر رینو بہل کی تخلیقات کی پیشانی پر سجا۔ یہ سہرا اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ رینو بہل اردو زبان سے قطعی بے بہرہ تھیں۔ انہوں نے پہلے اس میں دسترس حاصل کی پھر اسے پوری طرح اپنے اندر اتارا۔ یہ سب ڈاکٹر رینو بہل کا اردو زبان سے لگاؤ اور اُس سے مسلسل پیار کا نتیجہ ہے۔ آج جب ہم اردو زبان کی افسانوی پھلواڑی میں ان کے خوبصورت افسانوں کی چہل پہل دیکھتے ہیں تو دل انہیں داد دینے کو مچلنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر رینو بہل کو ''چہارسو'' کی جانب سے دیے گئے اس قرطاسِ اعزاز پر مبارکباد دیتا ہوں اور میں امید کرتا ہوں کہ وہ اسی طرح اپنے قلم کو رواں رکھتے ہوئے اپنی خوبصورت تخلیقات سے نوازتی رہیں گی۔

حنیف باوا (جھنگ)

برادرم گلزار جی، آداب۔

کچھ دن پہلے چہارسو کا شمارہ برائے ماہ ستمبر اکتوبر موصول ہوا۔ پڑھ کر از حد مسرت ہوئی۔ خاص کر اس شمارے میں محترمہ رینو بہل کی ادبی زندگی پر مبنی گوشہ ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ غیر ملکی قارئین نے بھی پڑھا۔ یہ باعثِ مسرت اس لیے ہے کیونکہ بھارت کے پنجاب میں واحد وہ اکیلی خاتون ہیں جو کہ ہندو خاندان سے تعلق رکھتے ہوئے برسوں سے اردو کی شمع جلائے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اپنے خطوط میں کئی نامور افسانہ نگاروں نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ محترمہ ادب نوازی کے ساتھ ساتھ مہمان نوازی میں بھی ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ ہماری دِلی دعا ہے کہ ان کا قلم اسی طرح افسانوں کی صورت میں اپنا رنگ بکھیرتا رہے۔

رس رابطے میں قارئین کے خطوط تعمیری اصلاح کے ساتھ ساتھ آپسی ملاپ کا بھی کام کرتے ہیں کیونکہ یہ لگ بھگ ہر قاری پڑھتا ہے۔ جیسا کہ اس شمارے میں سید نصرت بخاری صاحب نے اپنے خط میں فرمایا ہے کہ کچھ قارئین بغیر پڑھے ہی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے ہر افسانے یا غزل کی تعریف کر دیتے ہیں۔ یہ بات ہے تو قابل غور لیکن یہ افسانے یا ہر غزل کے علاوہ سب مضامین پہ اپنی رائے کا کھل کر اظہار کیا جائے تو پھر بہت سے پنّوں کی ضرورت ہوگی۔ ہر قاری کی پسند اپنی اپنی ہے کچھ لوگ صرف افسانوں کو ترجیح دیتے ہیں کچھ قارئین غزلوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ پھر بھی ناچیز کی یہ رائے ہے کہ جو پڑھا جائے اس پر تعمیری اصلاح یا تعمیری تنقید کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار ضرور کریں تا کہ لکھنے والے کو یہ پتہ چل جائے کہ وہ کہاں کھڑا ہے اور اُس نے کیا لکھا ہے اور قارئین کیا چاہتے ہیں۔ اس مرتبہ افسانوں میں شاہد جمیل کا افسانہ ''بستی'' حقیقی روپ لیے ہوئے ہے۔ آپ کا افسانہ ''استاذ'' پرانے زمانے کی یاد دلاتا ہے ایسا اکثر ہوتا ہے۔ آپ نے ٹھیٹ پنجابی زبان کو چھوڑ کر اس مرتبہ دلّی کی کرخنداری زبان کا استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ پچھلے افسانے ''شبھ چنتک'' میں ہندی کا بھرپور استعمال کیا تھا۔ نیا ڈھنگ، نئی بھاشا کو روانگی سے

پروسنا بھی ایک آرٹ ہے۔غزلوں اور نظموں میں ہندوستانی شعرا کی موجودگی بھی یہ احساس دلاتی ہے کہ بھلے ہی ہم کوسوں دُور ہوں لیکن اس کے برعکس ادبی دنیا میں ہم سب اپنی اپنی قلم سے ایک ایسا ادب پروستے ہیں جو سب کے لیے انسانیت اور محبت کا پیغام دیتا ہے۔ پنجابی نظموں کا اپنا ہی رنگ ہے وہ کیوں پیاری لگتی ہے کیونکہ وہ ماں بولی ہے۔جیسا کہ ''عمراں دی تھکان، پُتر، لائف سٹائل، جیون لُچا'' خاص کر بہت پسند آئیں۔ پشاور سے یونس صابر نے اپنی نظم میں گلزار صاحب کا دھن باد کرتے ہوئے کئی شاعروں کی نسبت اپنی محبت کا اظہار جس ڈھنگ سے کیا ہے قابل تعریف ہے۔انہوں نے کچھ پہلے چھپی ہوئی میری نظم ''ہم سفر'' پڑھ کر بھی ایک خط تحریر کیا تھا۔رؤف خیر کا مضمون ''نالائق اولاد'' پر ایک اچھا اور بھرپور طنز ہے۔ایسا آج کل کئی گھروں میں بزرگوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ برکت ہے اُسی گھر میں جہاں دو چار بڑے ہیں۔افسوس کہ آج بھی کئی بزرگ کونوں میں پڑے ہیں۔

میوزک ڈائریکٹر نوشاد صاحب ہندوستانی فلمی انڈسٹریز کے ایک ایسے ہیرے تھے جس کی قیمت نہیں لگائی جاسکتی۔اُن کی داستان زندگی پڑھ کر وہ پرانا وقت یاد آتا ہے جبکہ بہت سی عظیم ہستیاں جو کہ اپنی کلا سے آسمان پر چمکیں اور اونچا مقام پایا اپنی شروعاتی زندگی میں اتنی جدوجہد کی کہ بیان سے باہر ہے۔ ہر بار کی طرح دیپک کنول جی ایک ایسا معلوماتی خزانہ لے کر آتے ہیں کہ دل کو چھو جاتا ہے۔

امرناتھ دھمیجہ (لدھیانہ، بھارت)

جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ مل گیا تھا۔سب سے پہلے ''رس رابطے'' سے واسطہ پڑا کافی خطوط پُر از معلومات ہیں۔قرطاس اعزاز کے لیے آپ ایسی ایسی شخصیات کو ڈھونڈ کر سامنے لاتے ہیں جن سے بہت کم لوگ واقف ہوتے ہیں۔ میں نے خود ڈاکٹر رینو بہل کے صرف دو چار افسانے ہی پڑھے ہوئے ہیں۔اتنا تعارف نہ تھا۔ براہِ راست میں سوالات بھی اچھے ہیں اور جوابات بھی بڑے معقول اور حقائق پر مبنی ہیں۔ڈاکٹر رینو بہل نے جوابات میں سچ کو وطیرہ بنایا ہے اور یہ خاصی کامیابی ہے۔''مائل بہ کرم'' میں دونوں نعتیں پسندیدہ ہیں۔نسیم سحر کی نعت افضل ہے فرماتے ہیں:

یہ اُن کی عنایت ہے نسیم اُن کی عنایت
ہوتے ہیں جو یوں نعتیہ اشعار شب و روز

چاروں افسانوں میں منیرہ احمد شمیم کا افسانہ اچھا لگا شاید اس میں میری آپ بیتی کا رنگ تھا۔اس لیے مجھے بہت ہی اچھا لگا۔اگر وہ اس افسانے کا عنوان ''محبت جو چھوٹ گئی'' رکھتیں تو ''آنگن میں کالی دھوپ'' سے بہتر تھا۔ افسانے چاروں ہی پڑھ لیے۔''چہار درویش'' ایک بنی بنائی کہانی ہے جو انجم جاوید نے پیش کر دی ہے۔اکثر بستیوں میں ایسا ہی ہوتا ہے جیسے شاہد جمیل نے اپنے افسانے ''بستی'' میں پیش کیا ہے۔البتہ آپ کا افسانہ ''استاذ'' پڑھ کر حیرت ہوئی کہ آپ نے بھارت کی راجدھانی دلّی کی کرخنداری زبان کہاں سے سیکھ لی۔آپ کے اکثر افسانے پڑھتا رہتا ہوں۔آپ ہر افسانے میں چونکا دینے والی کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتے ہیں۔ میرے عزیز! یہ فن آپ نے کہاں سے سیکھا کچھ ہمیں بھی بتایئے گویا آپ ہر درد کے اُستاد اور ہر فن مولا ہیں۔

''آئینہ فن'' میں تین مضامین زیرِ مطالعہ آئے۔''مقدمے کا فیصلہ'' ''افسانوں میں کربلا'' اور ''عاشی اور تتلی'' وغیرہ ''مقدمے کا فیصلہ'' میں پروفیسر خالد اشرف نے فخر زمان کی شاعری کو موضوع بنایا ہے اسی طرح ''افسانوں میں کربلا'' میں ڈاکٹر عفت ذکیہ نے اسلم جمشید پوری کے افسانوں میں کربلا اور کربلا کے واقعات کو اپنے مضمون کا موضوع بنایا ہے اور اسلم جمشید پوری کے افسانوں کو زیر بحث لایا ہے۔مسرّت کلانچوی نے ''عاشی اور تتلی'' کے عنوان سے عاشی کی شاعری کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔

نظموں میں ایک دو نظم چھوڑ کر باقی سب پسندیدہ اور دلچسپ ہیں مثلاً غالب عرفان کی نظم ''وقت منتظر ہے'' پھر اور اشرف جہانگیر کی نظم ''خواہش'' بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔حیدر آباد دکن سے رؤف خیر نے ''خدا بھول گئے'' کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس نے تڑپا کے رکھ دیا۔کاش! خدا ایسی اولاد کسی دشمن کو بھی نہ دے۔ وجاہت علی عباسی نے اپنے والد محترم کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ''ذرا سی زندگی'' کے عنوان سے بڑا دلچسپ اور دل پسند مضمون لکھا ہے۔اللہ انہیں خوش رکھے۔اللہ تعالیٰ سب کو وجاہت علی عباسی ایسے بیٹے نصیب کرے۔آمین۔

دیپک کنول نے ''ایک صدی کا قصّہ'' کے تحت نوشاد کے حالات اس طرح بیان کیے ہیں کہ کچھ رہا نہیں۔نوشاد علی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے کہ جس نے بے شمار گانوں کو ایسے کمپوز کیا کہ ان گانوں کی بدولت فلمیں طویل عرصہ تک چلتی رہیں۔ یہ گانے آج بھی ایسے ہی پسند کیے جاتے ہیں جس طرح چالیس پچاس سال پہلے پسند کیے جاتے تھے۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

کرم فرما جناب انل ٹھکر کے توسط سے آپ کا دستاویزی نوعیت کا ماہنامہ ''چہارسو'' ملا۔یہ آپکی فراخدلی ہے کہ آپ نے ہمیشہ مستحق ادیبوں شاعروں کا ''چہارسو'' میں گوشہ نکالا ہے۔اس بار ڈاکٹر رینو بہل پر آپ نے بھرپور گوشہ دیا ہے ہر چند محترمہ مجھ سے عمر دس سال چھوٹی ہیں مگر ادب میں انہوں نے کافی نام کمایا ہے۔ان کے افسانے بیشتر رسائل میں نظر سے گزرتے رہتے ہیں جنہیں پڑھ کر رشک آتا ہے۔ دیپک کنول نے موسیقار اعظم نوشاد علی کے بارے میں کھل کر لکھا ہے۔

رؤف خیر (حیدر آباد، دکن)

جناب گل زار جاوید صاحب، السلام علیکم:۔

چہارسو کا مطالعہ ہو چکا۔آپ جن حضرات کے گوشے شائع کرتے

ہیں؛ کبھی موقع اور فرصت ملے تو ان کو کتابی صورت میں بھی شائع کروا دیں؛ محققین کے لیے بہت کارآمد چیز ہوگی۔ حواشی، حوالہ اور تعلیقات کی تلاش میں محقق مارے مارے پھرتے ہیں لیکن گوہرِ مقصود کبھی کبھار ہی ہاتھ لگتا ہے۔ اب اگر کسی کو پروفیسر لدملا وسیلیوا، ڈاکٹر امجد حسین، مہندر پرتاب چاند، شموئل احمد اور رینو بہل کے کوائف مطلوب ہوں تو کیا وہ چہارسو کو نظر انداز کر سکے گا؟ کبھی نہیں۔ اس لیے میں آپ سے افادہِ عام کے لیے ان گوشوں کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی درخواست کرتا ہوں؛ مجھے یقین ہے کہ چہارسو کو پڑھنے اور اس میں چھپنے والے میرے رائے سے اتفاق کریں گے۔

رینو بہل صاحبہ کے متعلق مضمون نگاروں نے خوب لکھا؛ لیکن مجھے تو ان کے افسانے ''دروپدی جاگ اٹھی'' نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ قدیم اور سچے افسانوی اسلوب میں گندھا یہ افسانہ بٹوارے کے اس پہلو کو اجاگر کر رہا ہے کہ بٹوارے میں صرف زمین اور اشیا ہی تقسیم نہیں ہوتیں، انسان بھی اندر سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ گل زار جاوید کا افسانہ ''استاذ'' اس شمارے کا بہترین افسانہ ہے۔ انھوں نے ہنرمندی سے ناگفتنی کو علامتوں میں لپیٹ کر بیان کر کے افسانہ نگاری پر اپنی گرفت ثابت کی ہے۔ ایسے افسانے یادگار ہوتے ہیں۔ رؤف خیر کا مضمون ''خدا بھول گئے'' میں دل دکھانے والے حقائق ہیں۔ رؤف صاحب نے صرف اولاد کا ذکر کیا؛ پطرس بخاری کی وفات پر جب نیویارک سے ان کے اہلِ خانہ کو فون کیا گیا تو انھوں نے میت وصول کرنے سے انکار کر دیا لیکن اسی شمارے میں وجاہت علی عباسی نے اپنے والد کو جس طرح یاد کیا اور خراجِ تحسین پیش کیا، وہ لائقِ تحسین ہے۔ میں قمر علی عباسی کے احترام میں سرنگوں کھڑا ہوں۔ ''ایک صدی کا قصہ'' کے مضمون نگار دیپک کنول مضمون نگاری کے فن سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ غالب عرفان، سلیم ناز، پروفیسر حسن عسکری، مہندر پرتاب چاند، پرواز انبالوی اور جواز جعفری کی غزلیات میں اچھے اشعار نظر آئے؛ حالانکہ یہ جنس نایاب ہوتی جا رہی ہے۔

سید نصرت بخاری (اٹک)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ شکریہ! یہ شمارہ ڈاکٹر رینو بہل کے نام اور کام سے آراستہ تھا جسے پڑھ کر مسرت ہوئی۔ ماشاءاللہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اُن کی کتابیں بھی انعام یافتہ ہیں پھر ان کے افسانے تو اکثر ''چہارسو'' کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ پینتالیس صفحات پر محیط اُن کی مختلف تصنیفات اور مکالمہ بھی دلچسپ لگا۔ گلزار جاوید کی کہانی (افسانہ) ''استاذ'' ایک استادوں کے استاد کی کہانی ہے جس میں آپ نے ایک ماحول کی ایسی عکاسی کی ہے کہ استادوں کی زبان سامنے آ گئی۔ اختتام بالکل مناسب لگا: ''کتا۔۔۔ کتا آدمی۔۔۔ کتا!!'' کیا بات ہے۔ قمر علی عباسی مرحوم کے بارے میں ایک بیٹے کا خراج مختصر لیکن دلچسپ اور بھرپور ہے۔ دیپک کنول نے نوشاد علی پر جو کچھ لکھا اُس سے اُن کی پوری اور معرکہ آراء شخصیت اچھی طرح ابھر نہ سکی! انجم جاوید کی کہانی میں ''چہار درویش'' تجسس کے ساتھ روانی بھی ہے لیکن نہ جانے کیوں وہ پہلی عبارت کے بعد اپنا خوبصورت اسلوب برقرار نہ رکھ سکے۔

غالب عرفان (کراچی)

پیارے گلزار بھائی! سلام خلوص اور دعائے خیر۔

تازہ شمارہ بابت ستمبر۔ اکتوبر ۲۰۱۴ء دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ صوبہ جات پنجاب اور ہریانہ کی نہایت ذہین اور واحد خاتون افسانہ نگار ڈاکٹر رینو بہل کو قرطاس اعزاز سے سرفراز کر کے آپ نے جو کارِ نیک انجام دیا ہے وہ لائق صد تحسین و آفرین ہے۔ ''براہِ راست'' اور اُن پر لکھے گئے مضامین میں ڈاکٹر رینو بہل کی شخصیت اور ادبی صلاحیتوں اور حصول یابیوں کا بخوبی جائزہ لیا گیا ہے۔ عزیزہ رینو بہل ایک مدت سے کہانیاں لکھ رہی ہیں اور خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہیں۔ وہ اعلیٰ مقام یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نیک نفس اور نہایت شائستہ خاتون ہیں اور صدق دلی، سچی لگن اور محنت شاقہ پر مکمل یقین رکھتی ہیں۔ عورت کی نفسیات اور صدیوں سے اس پر ڈھائے جا رہے مظالم کی بھرپور نقاب کشائی کرنے کے علاوہ انہوں نے اپنی بیشتر کہانیوں میں ہمارے معاشرے اور عصری حسیات سے جڑے متعدد موضوعات سے متعلق نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے قلم کا استعمال کیا ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور خاص طور پر کچھ لطیف اور نازک موضوعات پر اُن کا بیانیہ نہایت بے باک اور دلیرانہ ہوتے ہوئے بھی بے حد محتاط اور سلجھا ہوا ہے۔ اسی شمارے میں شامل ان کی ایک کہانی اس کی بہترین مثال ہے۔ اسی شمارے سے یہ بھی انکشاف ہوا کہ وہ کہانیوں کے علاوہ ڈرامہ بھی لکھتی ہیں۔ خدا اُن کے قلم کو اور تقویت دے اور وہ اسی طرح اپنے قارئین کو مستقبل میں بھی اور خوبصورت اور صاف ستھری کہانیاں دے سکیں۔ آمین۔

حضرات اطہر نفیسؔ، نسیم سحرؔ، ماہر اجمیریؔ، سیّد مشکور حسین یادؔ، خیال آفاقیؔ، پروازؔ انبالوی، حسنؔ عسکری کاظمی، عرشؔ صہبائی، وشال کھلرؔ، نوید سروش، مالک سنگھ وفاؔ، کرشن گوتمؔ، سبھاش گپتا شفیقؔ، محمود الحسنؔ، یوگیندر بہل تشنہؔ اور امرناتھ دھیجہ کے کلام کے علاوہ محترمہ منیرہ احمد شمیم اور انجم جاوید صاحب کی کہانیاں اور ایک مدت کے بعد آپ کی تحریر ''اُستاذ'' کے خوبصورت ''کیری کچر'' کے رُوپ میں یقیناً قابل توجہ ہیں۔

پروفیسر خالد اشرفؔ اور ڈاکٹر عفّت ذکیہ کے معلوماتی مضامین کے علاوہ حضرات رؤف خیر، وجاہت علی عباسی اور ایس ایم معین قریشی کی پُر لطیف اور دل چسپ تحریریں قابلِ ستائش ہیں۔ ڈاکٹر فیروزؔ عالم اور دیپک کنول صاحب کے کالم ہمیشہ کی طرح دل پسند ہیں۔ دیپک کنول صاحب نے بہت اچھا کیا جو اب کی بار ایک عظیم موسیقار سے متعارف کرایا۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

مکرمی گلزار صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' رینو بہل نمبر بہت دلچسپ اور قابل قدر ہے۔ آپ نے ڈاکٹر رینو بہل کے کام کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا۔ بہت اچھے مضامین ہیں۔ ویسے بھی آپ کا رسالہ مضامین نثر و نظم دونوں کے اعتبار سے دلکش بھی ہوتا ہے۔ یہ آپ کی عنایت ہے کہ آپ مجھے یاد رکھتے ہیں اور رسالہ پڑھنے کا موقع دیتے ہیں۔ میں نے اپنی تازہ کتاب ''منظوم تاریخ پاک و ہند'' حماسہ ناشر کتاب کے ذریعے بھجوادی وہ دہلی سے آپ کو بھجوادینگے۔ ملنے پر رسید سے مطلع کیجیے گا۔ جلد چہارم کی اشاعت کے بعد یہ دنیا کی طویل ترین نظم ہوگئی ہے ابھی پانچویں اور چھٹی جلدیں بھی آنا ہیں۔ انشاءاللہ۔

نقشبند قمر بخاری (امریکہ)

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کے نئے شمارہ کے لیے مشکور ہوں۔ ہاتھوں میں پکڑ کر پڑھنے کا مزہ کچھ اور ہی محسوس ہوتا ہے اور فیملی کے دیگر افراد بھی آسانی سے اوراق الٹ پلٹ کر پڑھ لیتے ہیں۔

آپ کا افسانہ ''استاذ'' بہت خوبصورت کاوش ہے اور عوامی زبان کا استعمال بھی کیا خوب ہے۔ دوسری بار پڑھنے سے اُس کی گہرائی اور اُستاد جسے پہلوان کا تقابلی انداز عمر کے آخری حصے کی کیا سبق آموز تصویر نظروں کے سامنے اُبھر آتی ہے۔ مقامِ عبرت۔ سوچتا ہوں آپ ڈاکٹر رینو بہل جیسی ہستیوں اور اُن کے سالوں پر محیط ادبی کاموں کو کیسے ڈھونڈ نکالتے ہیں اس کے لیے آپ کی نظرِ انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ''خوشیوں کا جال'' پڑھتے ہوئے سارے مناظر سچ مچ آنکھوں کے سامنے نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ ''قصہ چہار درویش'' انجم جاوید صاحب نے بہت دلچسپ پیرائے میں لکھا ہے۔ اسی طرح ''آنگن میں کالی دھوپ'' منیرہ احمد شمیم اور شاہد جمیل صاحب کی ''بستی'' معاشرت کی عکاس کہانیاں ہیں جو جذبات میں ہلچل پیدا کردیتی ہیں۔

نسیم سحر اور ماہر اجمیری کی نعتیں، مہندر پرتاپ چاند، شفیق گپتا اور پروفیسر حسن عسکری کاظمی کی غزلیں بھی خوب ہیں۔ دیگر افسانے اور نظمیں بھی خوب ہیں۔ ایسا شاندار شمارہ نکالنے پر میری اور میری فیملی کی طرف سے آپ دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

برادرم گلزار جاوید صاحب، مزاج گرامی۔

''چہارسو'' نظر نواز ہوا۔ حسب روایت قرطاس اعزاز بہت پسند آیا۔ ڈاکٹر صاحبہ کے نام اور کام سے آگاہی ہوئی۔ جب تک ایسے لکھنے والے موجود ہیں ہندوستان میں اردو کو تقویت حاصل رہے گی۔ شباب للت کی رحلت سے غمزدہ ہوں۔ ابھی ابھی کراچی سے سرشار صدیقی کے جانے کی خبر آئی ہے ''جو بادہ کش تھے پُرانے وہ اُٹھتے جارہے ہیں'' ڈاکٹر رینو بہل کے نام خطوط سے ادبی تاریخ کھوجنے میں مدد ملتی ہے۔ ہمارے دوست اقبال سحر انبالوی رشحات والے کا خط بھی ہے، اللہ مغفرت کرے۔ جوگندر پال صاحب کا یہ جملہ بہت اچھا ہے جو انہوں نے اساتذہ کے حوالے سے رقم کیا کہ کہانی اپنے فنی معراج پر خود آپ ہی اپنے آپ کو لکھنے لگتی ہے''۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات غزل، نظم اور شاعری پر صادق آتی ہے بلکہ ہر تخلیق پر۔ افسانوں میں گلزار جاوید، شاہد جمیل، ''کوئے قاتل میں'' مشکور صاحب، منظر ایوبی، حسن عسکری کاظمی، جواز جعفری کی تخلیقات پسند آئیں۔ سلمیٰ اعوان صاحبہ کا میں ہمیشہ سے مداح رہا ہوں۔ اسی طرح ''چشمِ ناحق'' میں سعید نقوی، نوید سروش اور ''آئینہ فن'' میں عفت ذکیہ کا ''افسانوں میں کربلا''، اسلم جمشید پوری کی ''پانی اور پیاس'' کے حوالے سے ایک سچی جذبوں سے بھرپور اور تاریخ کا نچوڑ تخلیق ہے۔ سچ صدیوں تک بلکہ ابد تک سچ رہے گا۔ بساطِ بشاشت میں ایس ایم معین قریشی صاحب جلوہ گر ہیں۔ میں ان کی تحریروں کا قائل بلکہ گھائل ہوں۔

کرامت بخاری (لاہور)

محترم گلزار جاوید، مزاج گرامی!

ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۴ء کا چہارسو ملا۔ ''مائل بہ کرم'' کے عنوان سے نسیم سحر کی لکھی ہوئی نعت نے ایمان تازہ کردیا۔ دوسری نعت ماہر اجمیری نے لکھی اور کمال کی لکھی، نعت کہنے کے لیے براہِ راست طیبہ سے توفیق ملتی ہے۔ چہارسو میں نعتیہ کلام کو اپنے مقام پر ہونا چاہیے۔

قرطاس اعزاز اس بار ڈاکٹر رینو بہل کے نام کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحبہ کے نام سے شناسائی تو چہارسو کی وساطت سے ہوچکی تھی، کام کی جانکاری محمد انعام الحق نے تفصیل سے کرادی۔ ڈاکٹر رینو بہل کی ادبی خدمات کو نہ سراہنا انتہائی کم ظرفی ہوگی۔ اس شمارے میں چار افسانے شامل ہیں۔ ''آنگن میں کالی دھوپ'' محبت کے موضوع پر انتہائی مبتدی سطح کا افسانہ ہے جو کوئی تاثر قائم نہ کرسکا۔ ''چہار درویش'' مفروضات پر اُستوار کہانی ہے البتہ انجام ایک سوال پھر بھی چھوڑ جاتا ہے۔ ''بستی'' نیک و بد، ظالم و مظلوم لوگوں کی رویوں کی داستان ہے اور قابلِ مطالعہ ہے۔ ''استاذ'' یہ ایسا لفظ ہے جس کے ادا ہوتے ہی نظریں احترام و تعظیم کے باعث جھک جاتی ہیں۔ ایک ایسے استاد کی کتھا جو جانے کب سے گلزار جاوید کے شعور و لاشعور کی دیواروں سے ٹیک لگائے اپنی باری کا منتظر تھا۔ دورانِ مطالعہ مجھے کئی بار احساس ہوا جیسے میں پیچھے اور کہانی بہت آگے نکل گئی ہو، اختتامیہ جملہ پڑھتے ہوئے میں افسانے کی کئی اقسام سے گزرا۔

خطوط میں ایک تاثر یہ ملتا ہے کہ میڈیا ادب کا منصف ہے قاری نہیں جو کہ کسی طرح درست نہیں، فی الحقیقت کچھ تخلیق کار قاری کے منصب سے خائف ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب تخلیق مشتہر ہوجاتی ہے تو وہ ہمہ نوع قارئین کے زیرِ نظر جاتی ہے اور اس پر اظہار خیال یا گفتگو پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہوتی، باذوق قاری یہ حق محفوظ رکھتا ہے کہ وہ کسی فن پارے کو مکمل یا جزوی طور پر پسند یا ناپسند کرے، میڈیا خود لکھاری کا محتاج ہے اور اس کا پہلا قاری بھی کسی کو دانشور اور مقبول

لکھاری ثابت کرنے کے لیے قاری سے بڑا کوئی منصف نہیں، نقاد بھی نہیں۔۔۔

احسان بن مجید (اٹک)

مکرمی گلزار جاوید، آداب وتسلیمات۔

میں ادب کے قاری کی حیثیت سے ڈاکٹر رینو بہل کا قدرداں رہا ہوں۔انہیں اپنی مٹی کی خوشبو سے آراستہ افسانہ نگار جانتا تھا۔لیکن قرطاس اعزاز نے ان کا مفصل تعارف کرایا کہ میری طرح اور بھی لوگ غالباً ان کے اس اختصاص سے واقف نہ ہوں کہ وہ بھارت کے دوصوبوں ہریانہ اور پنجاب کی اکلوتی خاتون افسانہ نگار ہیں (اردو کی)۔ڈاکٹر رینو بہل کی تحریر میں مٹی کی جس خوشبو کا حوالہ اکثر دیا جاتا ہے ''دروپدی جاگ اٹھی'' میں پوری طرح سے محسوس ہوتا ہے کہ عورت قربانی کا دوسرا نام اور گھر کو مزید تقسیم سے بچانے کے لیے کس حد تک جاسکتی ہے۔افسانے کے اختتام پر عنوان قاری کے ذہن میں مہابھارت کا کردار ''دروپدی'' پوری طرح جاگ اٹھتی ہے۔

اس مرتبہ افسانوں کی تعداد صرف چار یعنی نصف۔منیرہ احمد شمیم کا ''آنگن میں کالی دھوپ'' محبت کے درد میں ڈوبا ایک پُر اثر افسانہ لیکن اختتام کی سادگی قدرے کھلتی ہے اگر اسے افسانوی موڑ دیا جاتا تو افسانہ دل کو جکڑ لیتا۔ انجم جاوید نے دو درویش سے چار بنا دیے تو پولیس کو باقی دو کا کیوں کر معلوم ہوتا لیکن اختتام پوری کہانی کو اپنی گرفت میں لیے قاری کی حیرت کا وافر سامان کر رہا ہوتا ہے۔شاہد جمیل نے بتایا کہ بستی کیسے بستی ہے اور پھر کیسے اجڑتی ہے۔جب خلوص محبت اور یگانگت مٹنے لگے اور اس کی جگہ مصلحت، منافرت اور تقسیم کا عمل شروع ہو جائے تو بستی کو اجاڑنے کے لیے کسی بیرونی عوامل کی ضرورت نہیں رہتی۔دیپک کنول نے نوشاد علی کا ذکر چھیڑ کر موسیقی کے ایک ایسے تار کو ہلایا کہ یادوں کی دنیا میں چہار سو سُر بکھیرنے لگے۔برصغیر کی فضائیں کبھی نوشاد کے مدھر سنگیت سے آزاد نہیں ہوسکتیں۔

نجیب عمر (کراچی)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔حسبِ عادت سب سے پہلے خطوط پڑھے۔موجودہ شمارے کے چند خطوط اہم ہیں جس میں پرچے کی نگارشات کو تنقیدی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ایک عام آدمی کی داستان حیات ''ہوا کے دوش پر'' کی قسط نمبر ۲۵ میں ڈاکٹر فیروز عالم صاحب نے اپنی یادوں سے چند قابلِ ذکر مریض، ایک روسی مریض، سینوتھ ڈے کا اسٹاف اور ماحول، رشید غوری کی آمد اور انگریز ڈاکٹروں کے مثبت رویوں اور سکھانے والی عادتوں کو منتخب کر کے نذرِ قرطاس کیا ہے۔بہت خوب۔

''قرطاس اعزاز'' منفرد افسانہ نگار اور محقق ڈاکٹر رینو بہل کی نذر کیا ہے۔رینو بہل کی تحریریں ''چہارسو'' کے صفحات پر ایک عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ اُن کے بارے میں تفصیل سے جان کر خوشی ہوئی محترمہ کی اردو زبان سے محبت اور لگاؤ متاثر کرتا ہے انہوں نے اردو زبان کے مستقبل کے حوالے سے مصطفیٰ زیدی کے شعر کا بالکل درست حوالہ دیا ہے۔گلزار بھائی! آپ کے ''براہِ راست'' میں سوالات اور رینو بہل کے جوابات پسند اس لیے آئے کہ ان میں سادگی اور سچائی محسوس ہوئی اور جو سوال کیا گیا اُس دائرے میں جواب دیا گیا۔

عطیہ سکندر علی ''ابرِ گوہربار'' میں بڑے سلیقے سے اہلِ علم وفن کے ایسے خطوط کو ترتیب دیا ہے جس میں رینو بہل کے فن کو سراہا گیا ہے۔ڈاکٹر رینو بہل کا اپنی والدہ کا تحریر کردہ خاکہ ''خوشیوں کا جال'' میں حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ محبت اور عقیدت کی مہک بسی ہوئی ہے۔ڈرامہ ''قبضہ'' تکنیکی اعتبار سے مضبوط تحریر ہے۔دیپک بدکی، اقبال انصاری اور انور ایوبی گنگوہی نے محترمہ کے فکر وفن کا تجزیہ غیر جانب داری اور سلیقے سے کیا ہے۔اتنا بھرپور گوشہ مرتب کرنے پر گلزار جاوید صاحب کو سلام پیش کرتا ہوں اور رینو بہل کو پاکستانی محبتوں کا تحفہ۔

منیرہ احمد شمیم کا افسانہ ''آنگن میں کالی دھوپ'' کی پیشکش لاجواب ہے۔انجم جاوید کی کہانی ''چہار درویش'' بنت کے اعتبار سے خوب ہے۔تجسس قاری کو شروع سے آخر تک اپنی گرفت میں لیے رکھتا ہے درحقیقت یہ دو کرداروں کا اعتراف ہے اور یہ اعتراف انہیں کہاں لے جاتا ہے۔قاسم اور طارق کے کردار داستانی فضا میں لے جاتے ہیں۔گلزار جاوید نے ''استاذ'' میں تکنیک، اسلوب اور زبان ہر اعتبار سے کمال کیا ہے۔کتوں کے ضمنی ذکر سے کس مہارت سے سب کچھ سمجھا دیا۔یہی فن ہے ''وقت'' بڑا ظالم اور تلخ حقیقت ہے۔

منظر ایوبی، نقشبند قمر نقوی، آصف ثاقب، ڈاکٹر جواز جعفری، سید سعید نقوی، زہیر کنجاہی، سلیم ناز اور مالک سنگھ وفا کی غزلوں میں روایت کی چاشنی کا ذائقہ نئے انداز سے ہے۔مشکور صاحب کی غزل کی انفرادیت نے ہمیشہ کی طرح متاثر کیا۔زہیر کنجاہی کا ایک شعر دیکھئے اور سوچئے:

مرے گھر میں کبھی تو ہوگا چین آرام زہیر
سرسٹھ سال گزارے میں نے جس کو بنانے میں

''عراق جل رہا ہے'' سفرنامے کی تیسری قسط نے بہت متاثر کیا۔ محترمہ سلمیٰ اعوان نے پُر اعتماد اور کھلے انداز میں چند سطور میں ایسے مناظر دکھائے ہیں جو تفصیل کے متقاضی تھے۔ڈیلی کریم اور جوزمین کی گفتگو میں ''بغداذ'' کے روشن اور اچھے دنوں کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔''ایک صدی کا قصہ'' میں دیپک کنول صاحب نے عظیم موسیقار نوشاد علی کے حالات اور کامیابیوں کو افسانوی انداز میں تحریر کیا کیا ہے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

نوید سروش (میرپور خاص)

پیارے گلزار، سلامتی کی دعائیں۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ (گوشہ ڈاکٹر رینو بہل) کی شکل میں دستیاب ہوا۔اس خوبصورت تحفے کے لیے بہت بہت شکریہ۔جناب محمد انعام الحق نے رینو بہل کے سوانح کو ائف کو ''دوا ہو جانا'' سے موسوم کیا ہے جو بہت ہی بامعنی اور پُر

اثر ہے۔انہوں نے مزید کئی باتوں کا انکشاف بھی کیا ہے مثلاً اُن کی کہانیاں ایم 92 پر بھی نشر ہوتی ہیں۔اُن کی افسانہ نگاری پر جموں یونیورسٹی کی ایک طالبہ نے ایم۔فل کا تحقیقاتی مقالہ بھی تحریر کیا ہے۔اُن کے افسانوں میں مجھے ہمیشہ ہی کچھ نیا سیکھنے کو ملتا ہے۔جب میں نے عطیہ سکندر علی کا ''ابرِ گوہر بار'' پڑھا تو کئی باتیں سامنے آئیں جیسے برصغیر کے اساتذہ رینو بہل کے بارے میں کتنی اونچی سوچ رکھتے ہیں۔کوئی رینو جی کی وسیع النظری کے نہاں خانوں میں نئے نئے موضوعات کے بے شمار خزانے دیکھتے ہیں۔کوئی اُن کے اظہار کرنے کے سوتے خشک نہیں ہیں کی گواہی دیتے ہیں کوئی اُن کے افسانوں کو کل کل بہتے ہوئے جھرنوں سے مشابہت کرتے ہیں۔۔۔اور کوئی تو تحریر کو سادہ اور سلیس کا سرٹیفکیٹ دینے کے ساتھ ساتھ افسانوں کو ''غیر فطری'' اختتام کا جرم بھی عائد کرنے میں گریز نہیں کرتے۔یہ تو سب کا بڑکپن ہے پیار ہے اور اپنا اپنا انداز ہے۔

ڈاکٹر رینو بہل نے آپ سے بات چیت کے دوران یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ ابتدائی دنوں میں وہ شاعری کا بھی شوق رکھتی تھیں لیکن جب جناب شباب للت مرحوم کی ہدایت پر ان کو شاعری کی بجائے نثر پر توجہ دینی چاہیے تو اس طرح شاعری پر بریک لگ گئی ورنہ آج ہم لوگ جتنا اُن کے افسانے پڑھنے میں ڈوب جاتے ہیں اُتنا ہی ان کی شاعری پر بھی محظوظ ہو رہے ہوتے۔لیکن ایک بات ضرور ہے اُن کے خون میں شاعری کے ذرّات آج بھی موجود ہیں شاید اسی لیے وہ ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہیں کہیں اپنا پسندیدہ شعر بھی داغ دیتی ہیں جو ان کے جذبات اور ذہانت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

آپ کا لکھا ہوا ''استاذ'' آپ کے استادانہ کمال کا نمونہ ہے میں اس کہانی میں الجھتے ہوئے سِروں کو تلاش کرتا رہا لیکن کامیابی نہ ملی۔۔۔آخرکار وہ گم شدہ سِرے مجھے مل ہی گئے جب آپ نے انسان اور جانوروں کی خصلت کی مشابہت کرتے ہوئے آدمی۔۔۔کُتّا۔۔۔آدمی۔۔۔کُتّا کے ساتھ اس افسانے کو اختتام تک پہنچایا اور یہی تو آپ کا منفرد اسلوب ہے۔

کرشن نندہ (چندی گڑھ، بھارت)

- بقیہ -

گرداب

میں نے اسے کپڑوں سے بے نیاز کرنا چاہا۔وہ مزاحمت کرنے لگی۔

''نہیں....پلیز نہیں....!''

لیکن میں بہ ضد تھا.

''پلیز نہیں...میں کولڈ ہو جاتی ہوں.''

''ضد مت کرو.'' مجھے غصّہ آ گیا.میں نے ایک جھٹکے میں اس کی ساڑھی الگ کی.پھر بلاؤز.....

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور میرا ہاتھ پکڑ لیا؛

''پلیز۔۔۔مجھے اور عریاں مت کرو.میں پوری طرح برہنہ نہیں ہو سکتی۔'' وہ روہانسی ہو گئی.

'بے کار کی ضد مت کرو.'' میں نے چاہا اسے سایہ سے بھی بے نیاز کر دوں.وہ گھگھیانے لگی.

''ایسا مت کرو.

''کیوں؟''

''میں کولڈ ہو جاتی ہوں۔''

''کیوں کولڈ ہو جاتی ہو....؟ کیا پاگل پن ہے۔؟'' میرا لہجہ سخت ہو گیا۔

'پلیز...نہیں...پلیز...!'' اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

لیکن مجھ پر جنون سوار تھا۔

تم نہیں مانو گی تو میں چلا جاؤں گا۔'' بے حد ترش لہجے میں میں نے دھمکی دی۔

وہ سسک سسک کر رونے لگی۔میں نے اسے سایے سے بھی بے نیاز کر دیا۔

وہ چار وخانے چت لیٹی تھی۔بھری چاندنی میں برہنہ....زنجیروں سے آراستہ.....میں نے محسوس کیا کہ وہ آہستہ آہستہ کانپ رہی ہے ....اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں سے اس طرح چھپا لیا تھا کہ دونوں چھاتیاں کہنی سے ڈھک گئی تھیں۔پیٹ پر ناف کے قریب زچگی کے نشانات بہت واضح تھے۔میرے جی میں آیا انہیں چھو کر دیکھوں....میں نے وہاں پر ہاتھ رکھا.....وہ لرز اٹھی.....انگلیوں کے پوروں پر مجھے نمی کا احساس ہوا۔ اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔میں نے اسے غور سے دیکھا۔سارے بدن پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں تھیں۔وہ مستقل کانپ رہی تھی ۔اچانک اس کی آواز کہیں دور سے آتی سنائی دی۔

''کمار....کمار.....مجھے ننگا مت کرو....پلیز....!''

اور چاندنی دھندلا گئی۔صحن میں روئے زمین کا سب سے کریہہ منظر چھا گیا۔خوف سے کانپتا ہوا ایک عورت کا برہنہ جسم۔۔۔!

میں نے اس کے کپڑے سمیٹے اور اسے گود میں اٹھا کر کمرے میں لایا اور بستر پر لٹا دیا۔وہ اب بھی کانپ رہی تھی۔میں نے سر سے پاؤں تک اسے چادر سے ڈھک دیا اور سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گیا۔

...... ہم عصر اُردو افسانہ ......

(عصرِ حاضر کے پچاس نمائندہ اردو افسانے)

"ہم عصر اُردو افسانہ" ایک ایسا انتخابِ افسانہ ہے جس میں عالمی سطح پر لکھے جانے والے پچاس بہترین اُردو افسانوں کو منتخب کیا گیا ہے۔ تخلیق سے خالق کی پہچان ہوتی ہے، اس انتخاب سے ہمارے سامنے اُن پچاس افسانہ نگاروں کے نام بھی آتے ہیں جو یک سوئی، دل جمعی اور سنجیدگی سے نہ صرف اُردو افسانہ لکھ رہے ہیں بلکہ اردو افسانے کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اِن افسانوں اور افسانہ نگاروں کو یک جا کرنے میں معروف افسانہ نگار اے خیام اور زاہد رشید صاحبان کی شبانہ روز محنتِ شاقہ، عرق ریزی، ذہنی مشقت اور وسیع مطالعہ کا دخل ہے۔ ادارہ ان صاحبان کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے ایک ایسا افسانوی انتخاب ترتیب دیا ہے جو دنیائے اُردو ادب میں مدتوں یاد رکھا جائے گا۔

......شاعر علی شاعرؔ

اشاعت: ۲۰۱۴ء، قیمت: ۶۰۰ روپے، دستیابی: ظفر اکیڈمی، 5۔ کتاب مارکیٹ، اردو بازار، کراچی۔

...... نمِ جاں ......

اکیسویں صدی کے اس دوسرے دہے میں ٹکسالی انداز، کلاسیکی رچاؤ اور سوزِ محبت سے بھرپور شاعری کے مجموعہ "نمِ جاں" کی نمود کامِ جاں کے لیے لطفِ خیال کے ساغر سے کم نہیں۔ اگرچہ تقریباً پچیس سال قبل زیباؔ ردولوی کے مناقب و مراثی کا مجموعہ گلہائے زیبا، چمنستانِ شعر و ادب میں اپنی خوشبو بکھیر چکا ہے اور اب ان کی نظموں اور غزلوں کے مجموعہ کی گیرائی اور گہرائی میں پیوستہ دل کی گداختگی، غمِ حیات کی شائستگی، زبان و بیان کی شگفتگی اور خوش اسلوبی زیباؔ ردولوی کی زیبا شاعری کا سکہ منوا کر رہے گی۔ بقول کسی:

میں اپنے فن کی بلندی سے کام لے لوں گا　　مجھے مقام نہ دو میں مقام لے لوں گا

اس مجموعہ کی سترہ سے زیادہ نظموں اور سو کے قریب غزلوں میں ندرتِ خیال کی آئینہ بندی، ضبط و وقار کی گل کاری کیوں نہ ہو جب کہ اس فنکار کا سب سے پہلا کہا ہوا شعر اس کے گلشنی لہجہ کا نقیب ہے:

چپ ہو گئے تو بن گئے تصویرِ فصلِ گل　　بولے اگر تو پھول کھلے لالہ زار میں

یہاں اشعار باطن کی گہرائیوں میں اتر کر خیال کو سنوارنے سے وجود میں آتے ہیں:

میری قسمت ہے یہ کونین بنایا جس نے　　میرا ٹوٹا ہوا دل اس سے بناتے نہ بنا

کیا زندگی کی پیاس ہے اللہ کی پناہ　　دریا میں تھا حباب مگر تشنہ لب رہا

...... ڈاکٹر سید تقی عابدی

اشاعت: ۲۰۱۴ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: المقیط پریس، کراچی۔

...... سیپ (سہ ماہی) ......

دنیائے ادب میں لاتعداد ادبی رسالے منظرِ عام پر آئے اور زیادہ دیر جاری نہ رہ سکے "سیپ" ایسا ادبی سلسلہ ہے جو ایک دو، دس بیس نہیں پچاس سالوں پر محیط ہے۔ "سیپ" کے مدیر جناب نسیم درّانی ہر طرح کے حالات سے نبرد آزما ہوئے مگر "سیپ" کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری و ساری تھا، ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ "سیپ" کی زیرِ نظر اشاعت اکیاونویں سال میں داخل ہو چکی ہے مگر مواد، معیار اور پیشکش میں آپ کو کہیں تھکاوٹ یا سمجھوتہ نظر نہیں آئے گا۔ چار سو صفحات سے اوپر زیرِ نظر اشاعت میں ہر طرح کے ذوق اور مزاج کے قاری کے لیے ادب کی تمام اصناف پر مشتمل وہ تمام مواد موجود و دستیاب ہے جو ادب کا بالغ نظر قاری ایک باوقار جریدے سے توقع رکھتا ہے۔ ادب کی اس نادر و نایاب دستاویز کی قیمت نہایت کم یعنی صرف دو سو روپے مقرر کی گئی ہے اور دستیابی: سیپ پبلی کیشنز، ۱۸/۴۱۸، فیڈرل بی ایریا، کراچی ہے۔

...... فاری شا

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
تقریب پذیرائی شعری مجموعہ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم